بکوئے یار

بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

بہ کوئے یار

بہ انداز محرمانہ گزر

سائیں! میں ڈھاڈا گنہگار ہاں	ایک سو پینسٹھ
ایک آنہ	ایک سو اکہتر
بے برگ و شجر راہ گزر	ایک سو ستتر
بھوک کے عاشق	ایک سو تراسی
شاہ صاحب	ایک سو نواسی
کیسی کیسی ہستیاں	ایک سو چرانوے
ایں گناہیست کہ	دو سو ایک
یاد کسی کی	دو سو پانچ
مشتری ہشیار باش	دو سو نو
برتھا ماسٹر	دو سو تیرہ
چہ دلاور است دزدے	دو سو انیس
ٹوٹی ہوئی سیٹی	دو سو پچیس
طلاق! طلاق! طلاق!	دو سو اکتیس
کاتک کی کتیا	دو سو سینتیس
بوتل میں جن	دو سو تینتالیس
اللہ میاں کے دو دعدے	دو سو اکسٹھ
یا اللہ خیر	دو سو سرسٹھ

سنائیں گے، ممکنات میں سے نہ تھا۔ اور پھر میں یہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ حکیم صاحب سے اس کتاب میں درج آسنوں یا طریقوں کی وضاحت چاہوں۔ کیوں کہ حکیم صاحب کا احترام اور ہم دونوں کی عمروں میں طویل فاصلہ اس بے تکلفی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ——— اسی اُدھیڑبن میں دوسرے دن دو بجے ہی حکیم صاحب کے ہاں حاضر ہوا تو مسکرا کر کہنے لگے . . . میں جانتا تھا کہ آج تم بہت جلد آجاؤ گے۔ میں نے بھی بے ساختہ کہہ دیا . . . حضور واقعی رات بھر نیند نہیں آئی کہ کب دوسرا دن ہو اور کتاب دیکھوں۔

حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے الماری کھولی اور ضخیم کتاب نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ ———

——— میں نے اسے رات کو ہی نکال کر رکھ لیا تھا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے کتاب اُن کے ہاتھوں سے لے کر ورق گردانی شروع کر دی مگر سنسکرت سے قطعاً نابلد ہونے کے باعث خاموش رہا . . .

حکیم صاحب فرمانے لگے . . . میں جانتا ہوں کہ تمھیں سنسکرت نہیں آتی۔ لہٰذا میں نے ایک پنڈت سے کہہ دیا ہے وہ تمھیں یہ پڑھ کر سنا دیا کرے گا۔ دوسرے دن سے پنڈت جی آنے شروع ہوئے۔ پتہ چلا کہ یہ پنڈت جی ایک مدت سے حکیم صاحب سے تقاضا کر رہے تھے کہ انھیں یہ کتاب پڑھنے کو دی جائے تو حکیم صاحب نے پنڈت جی کو بھی خوش کر دیا اور میرے لیے بھی آسانی پیدا کر دی۔

پنڈت جی پڑھتے جاتے اور مطلب ہندوستانی میں سمجھاتے جاتے۔ کئی الفاظ ایسے بھی تھے کہ پنڈت جی کو اُن کے معنی نہیں آتے تھے مگر میں نفسِ مضمون کے مطابق ان الفاظ کا مطلب خود ہی نکال لیتا تھا اور اردو میں پنڈت جی کے ترجمہ کے مطابق روزانہ لکھتا رہا ——— ۲۷ دنوں میں میں نے اس کتاب کا رس اُردو میں نچوڑ لیا تھا اور میں نے دفعات کر کے اس کتاب کو اُردو میں تیار کر لیا۔ اور چاہتا تھا کہ اسے بہترین انداز میں شائع کروں گا۔

ایک دن باتوں باتوں میں جناب غلام رسول خاں شوق ڈائریکٹر تعلیمات کے ہاں اس کتاب کا ذکر آیا۔ جناب غلام رسول شوق، جناب ڈاکٹر ہیرالال صاحب چوپڑہ ایم، اے، ڈی لٹ کے پڑوس میں ہی ملتان ڈسٹرکٹ کورٹس کے قریب رہائش رکھتے تھے۔ جناب ڈاکٹر ہیرالال صاحب چوپڑہ کے ہاں کبھی جانا ہوتا تو جناب شوق کے ہاں بھی حاضری ہو جاتی۔ غلام رسول خاں صاحب شوق بڑے علم دوست اور اس وقت کے ایک مشہور افسر تھے، شوق صاحب نے اشتیاق ظاہر فرمایا کہ جو ترجمہ میں نے اُردو میں لکھا ہے اسے وہ بھی پڑھنا چاہتے ہیں اور میں نے اُن کے حکم کی تعمیل میں یہ ترجمہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔

چند ہی دنوں بعد ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے۔ جناب ہیرالال چوپڑہ تو غالباً کسی پہاڑی مقام پر گئے ہوئے تھے اور انھیں وہیں سے سیدھا دہلی آنا پڑا اور وہ ملتان واپس ہی نہ جا سکے اور کتابوں کا ایک ایسا قیمتی ذخیرہ وہاں گھر کے جملہ سامان کے ساتھ چھوڑ آئے کہ شاید ایسا علمی ذخیرہ اب بہت کم دیکھنے میں آسکے۔ اور میرا یہ مسودہ جناب غلام رسول خاں شوق کے ہاں ہی رہ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے متعدد خطوط شوق صاحب کو لکھے مگر وہ غالباً سرکاری افسر کی حیثیت میں کسی ہندوستانی سے خط و کتابت کرنا اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ شوق صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس مسودہ کی واپسی کا معاملہ بھی ختم ہو گیا ——— تاہم جو کچھ مجھے یاد ہے وہ کسی الگ مضمون میں لکھوں گا۔

تھرڈ ڈگری

سول ہسپتال جالندھر شہر کے سامنے ڈسٹرکٹ بورڈ کا گیسٹ ہاؤس نمبر ۲ ہے جس کی نچلی منزل میں پانچ اور پہلی منزل میں بھی پانچ کمرے ہیں۔ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم اٹیچیڈ ہے۔ کمرے اتنے بڑے کہ عام ہوٹلوں میں ایک صد روپیہ یومیہ پر بھی نہ مل سکیں۔ مگر یہاں سردیوں میں چار روپیہ اور گرمیوں میں پانچ روپیہ یومیہ کرایہ لیا جاتا ہے۔ (اب یہ گیسٹ ہاؤس بند کر دیا گیا ہے)

ایک بار مَیں ڈپٹی کمشنر جالندھر سے اجازت حاصل کر کے اس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تو یہ گیسٹ ہاؤس ہر لحاظ سے خصوصاً کم کرایہ کے باعث بہت پسند آیا۔ گراؤنڈ فلور کے کمرہ نمبر ۵ میں میرا قیام تھا۔ رات کو سو کر صبح جب باہر آیا تو کمرہ نمبر ۴ کے سامنے ایک کار کھڑی تھی جس پر PUNJAB MATA پنجاب ماتا کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مَیں نے چوکیدار سے پوچھا کہ کیا سردار بھگت سنگھ شہید اعظم کی والدہ محترمہ اس کمرہ میں تشریف فرما ہیں تو اس نے بتایا کہ پنجاب کے چیف منسٹر گیانی ذیل سنگھ کے حکم سے کمرہ نمبر ۴ مستقل طور پر پنجاب ماتا کو دیا گیا ہے اور وہ یہیں قیام فرماتی ہیں۔ ان کی بیٹی بھی یعنی سردار بھگت سنگھ مرحوم کی بہن بی بی امر کور بھی اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہیں —— اخبارات میں یہ خبر میری نظر سے پہلے گزر ہی چکی تھی کہ گیانی ذیل سنگھ (موجودہ وزیر داخلہ حکومتِ ہند) نے پنجاب ماتا کی خدمت میں ایمبیسڈر کار پیش کی ہے۔ اور دیگر ذرائع سے بھی ان کی عزت افزائی کی ہے۔ پنجاب ماتا کی ایک خادمہ باہر کھڑی تھی اس سے دریافت کیا کہ پنجاب ماتا جی سے ملاقات کب ہو سکتی ہے؟ —— اُس نے بتایا کہ وہ یہاں سارا دن برآمدے میں بیٹھتی ہیں، اور ہر کوئی ان سے بغیر وقت مقرر کیے مل سکتا ہے۔ گھنٹہ بھر میں وہ ضروریات سے فارغ ہو کر باہر تشریف لے آئیں گی۔ مَیں تیار ہو کر اپنے کام پر چلا گیا۔ دوپہر کو جب گیسٹ ہاؤس واپس آیا تو پنجاب ماتا جی برآمدے میں ایک چارپائی پر تشریف فرما تھیں۔ بی بی امر کور بھی ایک کرسی پر تشریف فرما تھیں جالندھر کے ایک اخبار نویس جو اپنا اکثر وقت پنجاب ماتا کی خدمت میں ہی صرف کرتے تھے، پاس ہی ایک اسٹول پر بیٹھے تھے۔ خادمہ چائے کی پیالی لائی اور پنجاب ماتا جی کو دیتے ہوئے کہنے لگی . . . ماتا جی نال والے کمرے وچ اک بھائی دلّی توں آیا ہویا اے اوہ تہانوں ملنا چاہندا اے (ماتا جی ساتھ والے کمرہ میں ایک بھائی دلّی سے آیا ہوا ہے وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے) . . . ماتا جی نے بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا . . . نے انھوں سدلیا (اُسے بُلالا) خادمہ نے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا . . . بھرا جی ماتا جی تہانوں بُلا رہی اے (بھائی جی ماتا جی آپ کو بلا رہی ہیں) دو کر لمحہ

میں ماتا جی کی قدم بوسی کر رہا تھا۔ اور ماتا جی نے اپنی سگی ماں کی طرح دعائیں دیتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ بی بی امر کور جی نے خادمہ سے چائے لانے کو کہا، اور ماتا جی نے میرا نام، پیشہ، جالندھر آنے کا مقصد وغیرہ سب کچھ دریافت کیا اور دو گھنٹہ تک باتیں کرتی رہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بھلا ہو گیانی جی (گیانی ذیل سنگھ) کا کہ جنھوں نے مجھے اس بڑھاپے میں یہ عزت دی ہے وگرنہ اب تک تو میں گاؤں میں ہی کس مپرسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اور وہ قومی حکومت جس نے بھگت سنگھ ایسے شہیدوں کے صدقے میں حکومت کی کرسیاں حاصل کیں اُس نے مجھے پوچھا تک نہ تھا۔ گیانی جی کے حسنِ سلوک سے پنجاب ماتا بہت زیادہ خوش تھیں اور ہزاروں دعائیں انھوں نے گیانی جی کو دیں ——— میرا خیال ہے کہ یہ پنجاب ماتا کی دعاؤں کا اثر ہے کہ گیانی جی اپنا اقتدار کھونے کے بعد پھر سے صاحبِ اقتدار ہوئے ہیں۔ اور میرا یقین ہے کہ پنجاب ماتا کی دعاؤں کے باعث گیانی جی ہمیشہ باعافیت رہیں گے ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ گیانی جی نے جو بھی ماتا جی کی خدمت کی وہ سب کچھ قوم کی طرف سے ہی تھی مگر اس کا خیال تو گیانی جی کو ہی آیا۔ اور انھوں نے ماتا جی کی شایانِ شان عزت اور خدمت کی۔ جس سے شہیدِ اعظم سردار بھگت سنگھ کی روح بھی خوش ہوئی ہوگی۔ ایک تو پنجاب ماتا شہیدِ اعظم کی ماں، دوسرا ان کے ایک مشفق مہربان ماں کی طرح مخلصانہ سلوک نے مجھے ایسا گرویدہ بنایا کہ رات کے دس گیارہ بجے تک ان سے باتیں کرتے وقت گزر جاتا۔ میں نے امرتسر، کپورتھلہ، ہوشیار پور، لدھیانہ وغیرہ جانا ہوتا تو صبح کو جا کر ——— شام کو واپس جالندھر آ جاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ پنجاب ماتا کے قدموں میں وقت گزارا جائے۔

اس گیسٹ ہاؤس کے عین پیچھے تھانہ نمبر ۴ ہے۔ اور یہ تھانہ شہر بھر کے تھانوں میں لائے گئے مشتبہ ملزمان سے جرائم کا اقبال کرانے کے لیے ڈرل جتھے کی آماجگاہ ہے۔ پنجاب میں ڈرل جتھا پولس کے ایک ایسے دستے کو کہا جاتا ہے جو مشتبہ ملزمان سے جرائم کا اقبال کرانے کے لیے شدد کے ایسے ہولناک طریقے استعمال کرتا ہے کہ کسی مشتبہ نے جرم نہ بھی کیا ہو تو وہ بھی ڈر کے مارے اقبالِ جرم کر لے۔

چنانچہ ہر رات کو اس تھانے سے مشتبہ ملزمان کے رونے، چیخنے اور چلانے کی دل دہلا دینے والی آوازیں سنائی دیتی تھیں ——— ایک رات پنجاب ماتا یہ دلدوز چیخیں سن کر اٹھ بیٹھیں اور مجھے آواز دی کہ آؤ میرے ساتھ اوپر چلو تاکہ تمھیں دکھاؤں کہ پولیس والے کس طرح سے ملزموں سے اقبالِ جرم کراتے ہیں۔ اوپر کے کمروں کی کھڑکیوں سے تھانہ نمبر ۴ کا سارا صحن اور کمرے بخوبی نظر آتے تھے۔ ایک نوجوان پر پولیس کے کارندے اپنے ہتھکنڈے آزما رہے تھے اور نوجوان آہ و زاری سے بار بار کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں قطعاً کچھ پتہ نہیں ہے۔ آپ غلط تفتیش کر رہے ہیں۔ مگر یہاں کوئی سننے والا نہ تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں یہ نوجوان بے ہوش ہو گیا تو پنجاب ماتا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور وہ خالص پنجابی زبان میں کہہ رہی تھیں کہ یہ تو اپنی سرکار کی پولیس ہے، نہ معلوم میرے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ انگریز کی پولیس نے کیا کیا مظالم توڑے ہوں گے۔

میں ماتا جی کو سہارا دے کر نیچے لے آیا۔ رات کے دو بجے تک ہم پولیس والوں کی اس سفاکی پر بیادلہ خیال کرتے رہے۔ ماتا جی فرمانے لگیں کہ . . . مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے مگر جب رات کو تھانے سے ملزموں کے رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں تو میں سو نہیں سکتی اور میری آنکھوں کے سامنے انگریز

کی پولیس کے وہ مظالم آنے لگتے ہیں جو بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں پر ڈھائے گئے۔ ماتاجی کے ہاں دن بھر فریادیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کی بات بڑے دھیان اور دلاسے سے سنتی تھیں اور کبھی کبھی ایسا مذاق بھی کرتی تھیں کہ آنسو بہاتے ہوئے فریادی بھی ہنس پڑتے تھے۔

اُن دنوں مَیں شراب پیتا تھا —— سرِ شام ہی دو چار صحافی احباب پینے پلانے کے سلسلے میں جمع ہو جاتے تھے۔ ماتاجی جب تک کھانے وغیرہ میں مصروف رہتیں ہم لوگ اپنا شغل کر لیتے۔ مَیں شراب کے بعد امرود کھاتا، چھوٹی الائچی کھاتا تاکہ ماتاجی کو شراب کی بُو نہ آ جائے۔ مگر میری ہزار کوششوں اور پیش بندیوں کے باوجود ماتاجی کو شک ہو گیا تھا۔ ایک دن فرمانے لگیں . . . پُت (بیٹا) کسی کے کہنے سے اور سمجھانے سے شراب کوئی نہیں چھوڑتا تم خود ہی اس کے بارے میں سوچنا اور کوشش کرنا کہ یہ چھوٹ جائے تو اچھا ہے۔ اس کے بعد مَیں نے یہ احتیاط کی کہ جتنے دن جالندھر میں رہا یا جب بھی جالندھر کے اس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تو شراب نہیں پی۔

ماتاجی سردار بھگت سنگھ کے بارے میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کا دل بھر آتا تھا مگر جب بھگت سنگھ کے بارے میں بولتی تھیں تو ایسی ایسی باتیں بتاتی تھیں کہ جس سے حب الوطنی کا اصل مطلب سمجھ میں آتا۔ اور آزادی کیا ہے اور غلامی کتنی بڑی لعنت ہے اس کا بھی پتہ چلتا تھا۔ غیر کی غلامی کیا ہے اور اپنی حکومت کیا ہے۔ اس کا موازنہ وہ بڑے اچھے انداز میں کرتی تھیں۔

ماتاجی فرماتی تھیں کہ جو قوم اپنے شہیدانِ آزادی کو بھول جاتی ہے، آزادی انھیں بھولنے میں دیر نہیں لگاتی۔

اُن کا یہ ایمان تھا کہ جب کسی ماں کا بیٹا آزادی کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے تو مُلک کا ہر نوجوان اس کو اپنا ہی بیٹا نظر آتا ہے اور اُسے قدرتی طور پر یہ حوصلہ ودیعت ہوتا ہے کہ ایک بیٹا مُلک پر قربان ہوا تو کیا ہوا مُلک کے کروڑوں نوجوان اس کے ہی بیٹے ہیں۔

ان کو یہ بھی یقین تھا کہ جب تک کوئی شخص سچائی، ایمانداری، خلوصِ دلی اور حُب الوطنی کے اوصاف نہ رکھتا ہو، وطن پر قربان نہیں ہو سکتا۔ اور وہ یہ بھی فرماتی تھیں کہ روپیہ سے محبت کرنے والا وطن کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ماتاجی کا کہنا تھا کہ جب سے دُنیا کا وجود ظہور میں آیا ہے تب سے تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ظالم کا حشر بُرا ہی ہوا ہے۔ اگر ہماری قومی حکومت بھی ظلم کرے گی تو یہ بھی اس اصول سے بچ نہ سکے گی۔

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ جب سردار بھگت سنگھ کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو ان کے دل پر بھی وہی اثر ہوا جو ایک ماں کے دِل پر ہوتا ہے۔ مگر بہت جلد انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ بھگت سنگھ مرا نہیں امر ہو گیا ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ وہ مُلک کے ہر نوجوان میں بھگت سنگھ کا پرتو دیکھتی ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں فرمانے لگیں . . . کہ بھگت سنگھ نے سرفروشی کا سبق کسی سے سیکھا نہیں بلکہ یہ تو خدا جس پر مہربان ہو اُسے ہی شہادت کا درجہ دلاتا ہے۔ لہٰذا جس ماں کے بیٹے پر واہگورو جی مہربان ہو جائیں اس کے دھن بھاگ —— مَیں نے ماتاجی سے دریافت کیا کہ جب بھگت سنگھ جیل میں تھے یا انھیں پھانسی دی گئی تو ان کے سر پر کیس نہیں تھے اور اخبارات میں ان کی جو بھی تصاویر شائع ہوتی رہیں وہ سر پر ہیٹ پہنے ہوئے ہوتے تھے —— مگر اب خصوصاً سکھ حضرات ان کی تصاویر شائع کرتے

وقت یہ خیال ضرور رکھتے ہیں کہ شہید بھگت سنگھ کی وہی تصویر شائع کی جائے جس وہ میں وہ کیس دھاری سکھ معلوم ہوں۔ آپ تو بھگت سنگھ کی ماں ہیں لہٰذا آپ سے بہتر کون بتا سکتا ہے کہ شہید بھگت سنگھ نے کیس کٹوا دیے تھے یا نہیں؟ ——— ماتا جی مسکرائیں اور فرمایا کہ کیس ہونے یا نہ ہونے سے اس کی شہادت میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم بالکل صحیح ہے کہ بھگت سنگھ نے روپوشی کے دوران کیس کٹوا دیے تھے۔ اور جب اسے پھانسی ہوئی تب بھی وہ کیس دھاری نہیں تھا۔

پنجاب ماتا اب نہیں رہی ہیں مگر جب تک تاریخ میں ہندوستان اور اس کی آزادی کا تذکرہ رہے گا شہیدِ اعظم بھگت سنگھ کا نام بھی زندہ رہے گا۔ اور وہ کون ہے جو بھگت سنگھ ایسے شہیدِ اعظم کو جنم دینے والی محترم ماں کا احترام نہ کرے گا ——— رہے نام اللہ کا۔

"کسی واقعے کی اہمیت اِس بات سے متعین کی
جا سکتی ہے کہ اِس سے کسی فرد کی زندگی میں کتنا
بڑا انقلاب آیا۔ دِلچسپ اور جاذبِ نظر واقعات
کے یہ پہلو اپنی جگہ پر اہم ہیں لیکن ایک سوانح
نِگار کے لیے وہی واقعہ اہم ہے جس سے کردار
پر روشنی پڑتی ہو خواہ وہ واقعہ غیر اہم کیوں نہ ہو۔"

——— ڈاکٹر عبدالقیوم

'سوانح نگاری کیا ہے' مقالہ مطبوعہ
نگار، پاکستان، سالنامہ ۱۹۶۶ء

ما در چه خیالیم

و فلک در چه خیال

قریباً نوے سال کا عرصہ ہوا کہ ریاست پٹیالہ کے ایک قریبی گاؤں کا آہلووالیہ نوجوان مہاراجہ پٹیالہ کی فوج میں ملازم تھا۔ یہ شادی شدہ نوجوان اپنی نئی نئی بیاہی دلہن سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مگر اُس زمانے میں کسی بیٹے کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اپنے ماں باپ کی موجودگی میں اپنی بیوی سے بات بھی کرے اور نہ ہی کوئی بہو ایسی جسارت کر سکتی تھی کہ وہ سسر یا جیٹھ کے سامنے اپنے شوہر سے بات کر سکے۔

فوجی ملازموں کو ایک خاص مدت کے بعد ہی گھر جانے کی چھٹی ملتی تھی اور یہ بھی ناممکنات میں ہے کہ وہ ہر اتوار کو اپنے گھر جا سکے خواہ اُس کا گھر اس کی جائے ملازمت سے دس بارہ میل کی مسافت پر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی یہ نوجوان اپنے افسران کی منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طرح مہینہ میں ایک دو بار گھر آتا اور اپنی دلہن کو دیکھ جاتا۔

شادی کے تین چار ماہ بعد اس فوجی کی بیوی حاملہ ہو گئی اور آنے والے بچے کے لیے ساس واہگورو سے پرارتھنا کرتی تھی کہ پلوٹھی کا بچہ لڑکا دینا، لڑکی نہ دینا۔ فوجی بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ کچھ ہی ماہ بعد باپ بن جائے گا۔

وقتِ مقررہ پر فوجی کی بیوی نے بچہ جنا تو وہ لڑکی تھی۔ زچہ کی ساس نے دایہ سے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ اگر لڑکی ہوئی تو اسے فوراً ہی باہر لے آنا اور اگر لڑکا ہوا تو وہیں رکھنا۔ دایہ نے جونہی لڑکی کی نال کاٹی تو وہ روئی اور وہ بچی کو اٹھا کر لے گئی۔ زچہ کی ساس اور دایہ نے پہلے ہی کمہار کے ہاں سے بڑی سی ہانڈی منگا رکھی تھی، اس ہانڈی میں روئی بچھا کر نومولودہ بچی کو اس میں لٹا کر اور بچی کے انگوٹھے پر گڑ لپیٹ کر انگوٹھا بچی کے منہ میں دے دیا اور یہ کہتے ہوئے گڑ کھائیں پونی کتیں، آپ نہ آویں ویرنوں گھلیں (گڑ کھانا اور کپاس کاتنا۔ آپ نہ آنا بلکہ اپنے بھائی کو بھیجنا) ہانڈی حویلی کے ایک کونہ میں گڑھا کھود کر دبا دی۔ زچہ کے جب ہوش و حواس درست ہوئے تو اُس نے ساس سے اور دایہ سے بچے کے بارے میں دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ زچہ دل ہی دل میں رو دھو کر چپ رہی۔

فوجی چھٹی پر گھر آیا تو آتے ہی سب سے پہلے اپنے بچے کی تلاش میں اِدھر اُدھر آنکھیں گھمائیں، مگر کوئی نوزائیدہ بچہ نظر نہ آیا، تو وہ اب کس سے پوچھے کہ بچہ کہاں ہے۔ ماں سے وہ شرم کے باعث پوچھ نہیں سکتا۔ خاوند اور بیوی ماں کی موجودگی میں بات تک نہیں کر سکتے ——— رات کو جب میاں بیوی کو تخلیہ میں بات چیت کا موقع ملا تو خاوند نے بے صبری سے بیوی سے پوچھا کہ بچہ کہاں ہے۔ بیوی

رو دی اور روتے ہوئے کہا کہ ماں جی کہتی ہیں کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے تو بیہوشی میں اسے دیکھا بھی نہیں۔ مگر بیہوشی کے عالم میں بھی میں نے بچی کے رونے کی آواز سُنی تھی۔ فوجی شش و پنج میں پڑ گیا کہ اگر بچی مُردہ پیدا ہوئی تھی تو روئی کیسے؟ ——— فوجی نے بار بار اپنی بیوی سے اس کی تصدیق کی کہ اس نے بچی کے رونے کی آواز سُنی تھی۔ فوجی نے رات تو آنکھوں میں کاٹی اور صُبح ہوتے ہی اس نے تمام حجابات کو دُور کرتے ہوئے براہِ راست اپنی ماں سے سوال کیا کہ ماں بچہ کہاں گیا۔ تو ماں نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ فوجی نے کہا ماں اُسے کہاں دبایا ہے تاکہ میں اپنی بچی کو مُردہ شکل میں ہی دیکھ سکوں۔ ابھی کون سے زیادہ دن ہوئے ہیں۔ پندرہ ہی دن تو ہوئے ہیں۔ جب فوجی کے انتہائی اصرار پر بھی ماں کچھ نہ بولی تو فوجی کمرے میں گیا اور بندوق اُٹھا کر لے آیا اور ماں سے کہنے لگا کہ اگر تم نے سچ سچ بات نہ بتائی تو میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ ماں نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور اس خیال سے کہا کہ اب تک وہ لڑکی مر مرا گئی ہوگی، جا اس کونے میں گڑھا کھود لے اور دیکھ لے اپنی لڑکی کو ——— ۔ بڑا آیا لڑکی والا۔ ایک مُردہ بچی کے لیے اپنے آپ کو بندوق مارنے چلا ہے۔ شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں کرتے۔

فوجی نے آناً فاناً نشان شُدہ جگہ کو کھودا تو تھوڑی ہی گہرائی پر اُسے ہانڈی ملی اور جونہی اُس نے ہانڈی کا ڈھکن اُٹھایا تو ہانڈی کے اندر رُوئی پر بچی پڑی انگوٹھا چوس رہی تھی۔ فوجی نے بچی کو ہانڈی سے نکال کر سینے سے لگایا اور اپنی بیوی کی گود میں دے دیا ——— فوجی کی بیوی کی خوشی کا اندازہ کوئی ماں ہی لگا سکتی ہے۔ فوجی نے اپنی ماں کی طرف خون آلودہ نظروں سے دیکھا تو وہ ڈر کے مارے گھر سے باہر چلی گئی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد آکر کہنے لگی، جس کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی ——— اس ہانڈی والی بچی نے تقریباً اسّی سال عمر پائی۔ اور تقریباً دس سال ہوئے کہ اس کا انتقال ہوا۔ اور یہ بچی بعد میں میری بیوی کی نانی کی پھوپھی بنی۔ یہ سچا واقعہ میری بیوی کو اس کی نانی نے سُنایا۔ جس کی تصدیق بعد میں اس خاتون نے خود فرمائی۔

بٹھنڈا (پنجاب) میں ڈسٹرکٹ ریلیف فنڈ کی فراہمی کے لیے ایک مشاعرہ کرایا گیا۔ ڈپٹی کمشنر بٹھنڈہ کی ہدایات کے مطابق شری جیون لال شرما ایڈوکیٹ بٹھنڈہ نے مجھے لکھا کہ مشاعرہ کے لیے شعراء کو مدعو کرا دیجیے۔ اور اناؤنسمنٹ کے لیے مِس شمیم حیدری بمبئی کو بُک کرا دیں کیونکہ ان کی بہترین اناؤنسمنٹ کی تعریف شانِ ہند میں پڑھی ہے ——— میں نے یہ سب انتظام کر دیا اور تاریخ مقررہ پر مِس شمیم حیدری اور ان کے منگیتر میرے ساتھ بٹھنڈہ پہنچ گئے۔ ہمیں گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ مشاعرہ بہت اچھا ہوا۔ اور ڈسٹرکٹ ناظر نے تمام شعراء کو معاوضے ادا کر دیے۔ شعراء واپسی کے لیے دوسرے دن صُبح تیاری کر رہے تھے کہ شرما جی آئے ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں سے ساڑھے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک کاٹن مِل ہے، یہ صاحب مِل کے منیجر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ رات کو انھیں اور ان کے مالک کو مشاعرہ بہت پسند آیا۔ لہٰذا یہ چاہتے ہیں کہ مِل میں آج رات کو نشست رکھ لی جائے۔ فلاں فلاں شعراء کو آپ روک لیجیے اور شمیم صاحبہ کو بھی روک لیجیے تاکہ یہ اناؤنسمنٹ کر دیں گی۔ مالکانِ مِل کی طرف سے ہر شاعر کو ایک ایک صد روپیہ پیش کیا جائے گا۔ دِل لکھنوی، نظرِ

دِیباچہ

نہ کوئے یار نہ اندازِ محرمانہ گزر کے مسودے کو میں نے غور سے پڑھا، اور اس نتیجے پر پہنچا

کہ ——

سرور تونسوی کے قلم میں بڑی جان ہے۔

اگرچہ یہ سب واقعات اور بیانات سوانحی ہیں اور ——

ذات کے حوالے سے ہیں،

لیکن انھوں نے کہیں خود کو نمایاں کرنے یا اپنے آپ کو مثالی کردار کے طور پر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس نگار خانے میں —— زندگی کا حسن اور کشش بھی ہے اور ——

اس کی بوالعجبیاں اور تضادات بھی، اور ان کو ایسی بے لوثی سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے۔

ان واقعات میں کوئی سوانحی یا تاریخی ترتیب نہیں ہے۔

لگتا ہے —— جیسے جیسے کوئی چیز یاد آتی گئی ہے سرور تونسوی اسے لکھتے گئے ہیں۔

ان میں بچپن کے واقعات بھی ہیں۔

ملتان کی صحافت کے مناظر بھی ہیں۔

بارہ بنکوی، جمیل انعامی اور اسی قسم کے مترنم شعراء حضرات کو روک لیا گیا۔ بل کی بس آئی اور تمام شعراء کو لے گئی بھنڈہ میں میرے ایک دوست ہیں گپتا صاحب، انھوں نے کہا کہ سرور صاحب آپ اور شمیم میرے ساتھ کار میں چلنا۔ ہم شام کو چلیں گے ——— لہٰذا شام کے ساڑھے سات بجے گپتا صاحب کے ہمراہ میں اور شمیم اور اس کے منگیتر بل کے ایریا میں داخل ہوئے تو شعراء شراب نوشی میں مست تھے۔

اُن دنوں میں بھی پیتا تھا۔ مجھے اور گپتا صاحب کو بھی اس محفل ناؤنوش میں شریک کر لیا گیا شمیم اور ان کے منگیتر کو میں نے کہا کہ آپ لوگ موٹر میں گھوم آؤ اور نو بجے تک آجانا۔ ساڑھے نو بجے کھانا لگے گا اور پورے دس بجے شعری نشست شروع ہو جائے گی ——— جب شمیم اور اس کا منگیتر نو بجے کے قریب واپس آئے تو اُس وقت ہم لوگوں کے معدے میں شراب کی تہہ جم چکی تھی۔ جب ہمیں کھانے کے لیے بل ایریا میں ہی ایک حویلی نما مکان میں لے جایا گیا تو وہاں بھنڈہ ایسے خطرناک علاقہ کے کئی سکھ نوجوان شراب کے نشے میں مست عجیب و غریب ہیئت بنائے کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے شمیم اور اس کے منگیتر سے کہا کہ گوشت نہ کھانا کیونکہ یہ حلال نہیں ہے بلکہ جھٹکہ ہے۔ میں نے شمیم اور اس کے منگیتر کے ساتھ کھانا چاہا تو ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ اندر سہمی لگی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ معاملہ مشکوک نظر آیا اور میرے دماغ نے فوراً میری رہنمائی کی کہ یہ سب کھیل شمیم ایسی خوبصورت اور ماڈرن لڑکی کی عصمت لوٹنے کے لیے رچایا گیا ہے۔ میں کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل کر برآمدہ میں گیا تو وہاں روئی کی بڑی بڑی گانٹھیں رکھی تھیں جس پر چڑھ کر دیوار پھاندی جا سکتی تھی۔ میں نے حلق میں انگلی مار کر الٹی کی اور معدے میں جس قدر شراب تھی وہ نکل گئی۔ اب میرے ہوش و حواس درست ہونے لگے تو میں نے شمیم اور اس کے منگیتر سے کہا کہ ہوشیار رہنا، معاملہ خطرناک نظر آتا ہے۔ اور انھیں برآمدے میں روئی کی گانٹھیں دکھا دیں کہ یہاں سے باہر کود نا ہے اور دوسرے کمرے میں جہاں سب لوگ کھانا کھا رہے تھے گپتا جی کے کان میں سب معاملہ کہہ دیا اور تاکید کر دی کہ آپ موٹر میں بیٹھو، شمیم اور اس کے منگیتر دیوار پھاند کر آرہے ہیں۔ گپتا جی بھی میری بات کو سمجھ چکے تھے اور باہر کمپاؤنڈ میں جا کر کار کو اسٹارٹ کر کے اس دیوار کے پاس لے آئے جہاں سے شمیم اور اس کے منگیتر نے کودنا تھا۔

اب میں کمرے میں جانے لگا تو میرے سامنے دروازے کی دہلیز میں ایک صاحب راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے انھیں ٹوکا کہ آپ راستہ روکے کیوں کھڑے ہیں تو وہ قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے نہایت بدمستی میں کہنے لگے . . . کیا تیری بہن لگتی ہے . . . اس کے باوجود کہ میں اس عمر میں بھی چاہتا تو ان لالچی کے ایک ہی گھونسے سے کئی دانت باہر نکال دیتا مگر میں نزاکت حال کے پیش نظر دیدہ و دانستہ تو تو میں میں کرتا رہا تاکہ شمیم اور اس کا منگیتر میری ہدایت کے مطابق دیوار پھاند جائیں۔ جب مجھے اس شخص سے اُلجھتے ہوئے جیون لال شرما ایڈوکیٹ نے دیکھا تو وہ بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے . . . سرور صاحب آپ نہیں جانتے یہ اس بل کے مالک ہیں ——— یہ چاہتے ہیں کہ ذرا شمیم صاحبہ سے تعارف ہو جائے۔

میں نے کہا کہ شمیم تو باتھ روم میں ہے۔ ابھی آئے گی۔ سیٹھ صاحب آپ اندر تشریف رکھیے۔ اور خود فوراً باہر آگیا۔ گپتا جی نے کار اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ شمیم اور اس کا منگیتر روئی کی گانٹھوں پر چڑھ کر دیوار پر آگئے اور دوسری طرف کھڑی کار کی چھت پر اُتر کر نیچے آکر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ میں

انتہائی تیزی سے دوڑ کر گپتا جی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ بل کا صدر دروازہ بند تھا۔ گپتا جی نے ہارن دیا، واچ مین نے دروازہ کھول دیا، اور ہم تیزی سے کار کو بل ایریا سے باہر لا کر بھٹنڈہ کی سڑک پر پوری رفتار سے جا رہے تھے ——— رات کے گیارہ بجے ہوں گے کہ ہم گپتا جی کے گھر پہنچے۔ کھانا کسے یاد رہتا۔ گپتا جی کی ماں نے ہمیں دودھ کا ایک ایک گلاس دیا اور ہم سب پی کر سو گئے۔ دوسرے دن گپتا جی ہمیں گاڑی پر سوار کرا گئے۔ اس دن کے بعد سے جیون لال شرما ایڈووکیٹ پر بھی اعتماد نہیں کیا۔

گپتا جی کا وہ خط اب بھی میرے پاس موجود ہے جو بعد میں انھوں نے بھٹنڈہ سے لکھا کہ سرور صاحب آپ کی سوجھ بوجھ کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس رات آپ نے ہمیں عزت بچائی ——— اب معلوم ہوا کہ وہاں یہ نشست رکھی ہی اسی لیے گئی تھی۔ تمام شاعر تو نشے میں بے ہوش تھے۔ اور اس سازش میں آپ کے دوست جیون لال شرما ایڈووکیٹ بھی شریک تھے۔

"بعض اوقات یادوں کے سرمائے بالواسطہ طور پر ملتے ہیں۔ ہمارے آباواجداد ہمارے بچپن کی کہانیاں کہتے ہیں ہماری یادیں دراصل ان کی کہی ہوئی کہانیوں کی یادیں ہیں۔"

—— اندرے موروئے

بحوالہ فنِ سوانح نگاری

مصنف ڈاکٹر عبدالواسع

خواجۂ غریب نوازؒ

غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے آستانے پر پہلی بار حاضری دی ——— تو روضۂ مبارک کی جالیوں کے باہر جہاں خواتین کھڑی اپنی عقیدت کا اظہار نہایت خضوع و خشوع سے کر رہی تھیں۔ سیاہ برقعے سے دو ہاتھ دُعا مانگتے ہوئے نظر آئے ——— ہاتھ کیا تھے جیسے صانع قدرت نے اپنی تمام کاریگری ختم کر کے رکھ دی ہو۔ میں نے اپنی عمر میں کسی عورت کے ایسے خوبصورت ہاتھ اور مخروطی انگلیاں نہیں دیکھی تھیں۔ قتیل شفائی نے اپنے ایک شعر میں محبوبہ کے جسم کو سونے کا جسم لکھا ہے۔ خدا جانے قتیل شفائی کی محبوبہ یا مصروفہ کا جسم سونے کا تھا یا نہیں، مگر دُعا کے لیے اُٹھے ہوئے ہاتھ سونے کو بھی شرما رہے تھے۔

اس وقت میری عُمر ۳۵ سال کی تھی ——— آج کل تو اس عمر تک پہنچتے پہنچتے لوگ اپنی جوانی کا نوحہ پڑھتے نظر آتے ہیں مگر ہمارے دَور کے لوگوں میں . . . اس عُمر میں جوانی کو اصل جوانی مانا جاتا تھا۔ لہٰذا عمر کا تقاضا نیز فطری طور پر حُسن پرست تو تھے ہی چنانچہ دِل ہی دِل میں سوچا کہ جس کے ہاتھ ایسے جان لیوا ہیں اُس کا رُخِ روشن کیسا ہوگا ——— ؟ چنانچہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ لگایا کہ اگر فلاں جگہ جا کر کھڑے ہو جائیں تو وہاں سے اس شعلۂ جوالا کا رُخِ انور صاف نظر آنے لگے گا۔ چنانچہ اپنے خفیہ پلان کے تحت بیوی سے کہا آیئے اُدھر کھڑے ہوتے ہیں۔

چنانچہ شوقِ نظارہ میں دِلی بے تابی کو چھپائے جونہی کشاں کشاں اس مینارۂ نُور کو دیکھنے کے لیے قدم اُٹھایا تو مور پنکھ کی تیلیوں سے بنے ہوئے جھاڑو سے صحن کو صاف کرتے ہوئے جارُوب کش کی بے خیالی سے جھاڑو کی ایک تیلی باہیں آنکھ میں ایسی لگی جیسے آنکھ کا ڈیلا ابھی باہر نکل آئے گا۔ اور میں دونوں ہاتھوں سے آنکھ کو دباتے ہوئے دَرد سے بے حال وہیں بیٹھ گیا ——— بیوی نے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا کیا ہُوا . . . ؟

ع
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

جب آدھ پون گھنٹے میں ہوش سنبھلے اور آنکھ کے دَرد میں کچھ کمی ہوئی تو آنکھ کو جھپک کر اندازہ لگایا کہ بینائی باقی ہے یا نہیں ؟ ——— آنکھ سے پانی بہہ رہا تھا، مگر نظر آ رہا تھا۔ بیوی تھامتے ہوئے جب قیام گاہ پر لے گئی تو قبلہ صولت صاحب فرمانے لگے . . . یا اللہ خیر! کیا بات ہے بیٹی سَرور نے آنکھ پر رومال کیوں رکھا ہُوا ہے، اور اس کے ہوش کیوں گم ہیں . . . ؟ بیوی نے جو

ایک سو پندرہ

ظاہری معاملہ اُسے معلوم ہُوا تھا کہ سُنایا ——— مگر رات کو جب حالت کافی سُدھر چکی تھی تو مَیں نے بیوی کی موجودگی میں قبلہ صولت صاحب سے سارا واقعہ مِن و عَن کہہ سُنایا تو صولت صاحب قہقہے پر قہقہے لگانے لگے۔ اور بیوی کہنے لگی . . . اچھا تو اصل بات یہ تھی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا وہیں بیٹھے رہنے دیتی۔ (آنکھیں بند) چھ ماہ تک درد کی کسک رہی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ مینارۂ نور دِل و دماغ سے ایسا محو ہوا کہ پھر کبھی اس کا خیال تک نہیں آیا۔

اس واقعہ کو قریباً تیس سال ہو گئے ——— اجمیر شریف کئی بار حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ہر بار میرا سر ندامت سے جھک جھک گیا۔ اور مَیں نے ہر بار غریب نواز سے دست بستہ معافی چاہی ہے۔ اور کھُلے بندوں یہ اعتراف بھی اسی لیے ہے کہ خُدا اور حضرت غریب نوازؒ میرے اس قصور کو معاف کر دیں۔

میرے کرم فرما اور حبیب لبیب اندرناتھ ملہوترہ (مرحوم) اسٹرابورڈ ملز رتلام کے جنرل منیجر تھے، ان کی چھوٹی صاحبزادی شیل کو شادی کے دس سال بعد بھی کوئی اولاد نہ ہوئی تو لڑکی کے سُسرال کی بے چینی بیٹی کے والدین کے لیے سوہانِ رُوح بن گئی ——— لڑکی کے سُسرال والوں نے طبّی طور پر لڑکی کے بارے میں ہر مُمکن تحقیق اور تشخیص کرائی جو سو فی صد لڑکی کے حق میں تھی اور ہر طبّی رپورٹ اس کی مظہر تھی کہ لڑکی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ملہوترہ صاحب نے اپنے داماد کو (جو کہ دہلی میں محکمہ بجلی میں اچھے عہدہ پر تھے اور آج کل ہندوستان سے باہر ہیں) کو ترغیب دی کہ وہ کچھ روز چھٹی لے کر رتلام میں رہیں اور شبِ مالوہ کا لُطف اُٹھائیں۔ چنانچہ سُسر کے اصرار پر داماد نے ایک ماہ کی رخصت لی اور اپنی بیوی کے ساتھ رتلام میں سُسرال کی مہمانی میں خوب لُطف اُٹھایا۔

دراصل ملہوترہ صاحب کا دَرپردہ داماد کو رتلام میں کچھ دنوں مہمان رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے دوست سِول سرجن رتلام سے داماد کا معائنہ کرا سکیں کہ آیا ان میں کچھ نقص تو نہیں ہے کیونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لڑکے والے لڑکی میں ہی کیڑے نکالتے رہتے ہیں ——— حالانکہ ان کا لختِ جگر ہی اصل قصور وار ہوتا ہے۔

ملہوترہ صاحب نے رتلام کے سِول سرجن کو سکھا رکھا تھا کہ وہ از خود ایسا انتظام کریں کہ اُن کا داماد جملہ تحقیق و تشخیص کے مراحل سے خوشی خوشی اس طرح گزر جائے کہ اس کی دانست میں جیسے ملہوترہ صاحب کو کچھ علم ہی نہیں ——— اور ہُوا بھی ایسا کہ کلب میں دو چار دنوں میں ہی سِول سرجن صاحب نے گلاسوں کی کھنک میں ملہوترہ صاحب کے داماد سے اچھے خاصے دوستانہ تعلقات بنا لیے۔

سِول سرجن نے ملہوترہ صاحب کی فیملی کو کھانے پر گھر بُلایا تو دوسرے دن ملہوترہ صاحب نے سِول سرجن کی فیملی کو گھر پر کھانے پر بُلایا۔ اور باتوں باتوں میں سِول سرجن نے مہمان سے براہِ راست یہ سوال کر دیا کہ فیملی پلاننگ ایک آدھ بچّے کی پیدائش کے بعد کی ہوتی، مگر آپ نے تو شروع میں اس پر عمل پیرا ہو کر کمال کر دیا۔

اور دس سال تک بچہ نہ ہونے دیا۔

ملہوترہ صاحب کی بیوی نے لقمہ دیا کہ ڈاکٹر صاحب ہم تو ہم ہماری تو سمبندھن اور سمبندھی بھی ترس رہے ہیں کہ شیل کی گود ہری ہو . . . ڈاکٹر صاحب نے حیرانی سے پوچھا تو پھر اڑچن کیا ہے . . . ؟ اس کے جواب میں ملہوترہ صاحب کی بیوی نے اپنی لڑکی کی تشخیص کے بارے میں تفصیلی رُوداد سُنائی جس پر ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے . . . یہ معمولی بات ہے، بچہ ہو سکتا ہے۔

شراب میں لاکھ عیب سہی، مگر پینے والوں میں دوستی اور راز داری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے چار پانچ دنوں کے بعد ہی ملہوترہ صاحب سے کہا کہ آپ کا داماد بالکل ٹھیک ہے میں نے ہر طرح سے اس کا معائنہ کر لیا ہے۔

ملہوترہ صاحب کی بیٹی اور داماد کے اعزاز میں جناب اکبر علی (رئیس و ممبر میونسپل کمیٹی رتلام) نے اپنے گھر پر دعوت دی اور باتوں باتوں میں انھوں نے فرمایا . . . کہ ملہوترہ صاحب آپ شیل اور اس کے شوہر کو اجمیر شریف غریب نوازؒ کی درگاہ پر لے جائیے اور وہاں ان کے با اولاد ہونے کی منت مانگیے، دیکھیے خدا کیا دکھاتا ہے۔

ملہوترہ صاحب بڑے ہی فعال اور دُھن کے پکّے تھے۔ کہنے لگے . . . اکبر علی صاحب صبح ہی اجمیر شریف چلنا ہے اور بذریعہ کار چلنا ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ چنانچہ اکبر علی صاحب کی قیادت میں یہ قافلہ اجمیر پہنچا اور اکبر علی صاحب نے حضرت غریب نوازؒ کے مزارِ مبارک پر اُن سے منّت منوائی۔

کرنا خدا کا دس ماہ بعد ہی شیل کو چاند سی بیٹی پیدا ہوئی اور دو سال بعد پھر اُس نے ایک بیٹی کو جنم دیا —— اب تو ملہوترہ صاحب کا اعتقاد ایسا جما کہ کسی نہ کسی بہانے اجمیر شریف جانے کا پروگرام بنا ہی لیتے تھے۔ اور وہ اپنی نواسیوں کو باہوں میں لیتے ہوئے فخریہ کہتے تھے :

کہ یہ خواجہ غریب نوازؒ کی دی ہوئی ہیں۔

■■

یادش بخیر

پچھلے دنوں فیروزآباد (یوپی) میں قومی یک جہتی کی تقریب میں ایک کُل ہند مشاعرہ ہُوا جس میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو بھی مدعو کیا گیا۔

کنور صاحب کسی بھی بیرونی مشاعرے میں تشریف لے جاتے ہیں تو وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ہاں آمدو رفت کے اخراجات کی ادائیگی کا وہ ضرور مُطالبہ کرتے ہیں ——— منتظم مشاعرہ کسی ایم، پی کا قریبی رشتہ دار تھا، اُس نے یہ شرط بخوشی قبول فرمائی اور یہ طے پایا کہ کنور صاحب بذریعہ کار دہلی سے فیروزآباد تشریف لائیں اور جو مزید شعراء دہلی سے مدعو کیے گئے تھے انھیں بھی اس کار میں لیتے آئیں اور مشاعرہ ختم ہونے پر اسی کار میں دہلی واپس چلے آئیں۔

مشاعرہ بخیر وخوبی ختم ہُوا تو منتظم صاحب رُوپوش ہوگئے ——— عام طور پر مشاعروں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور اکثر شعرائے کرام اُدھار لے کر واپسی کا انتظام کرتے ہیں۔ مگر اب کی بار معاملہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے آپڑا تھا۔ چنانچہ کنور صاحب نے فیروزآباد کے پولیس اسٹیشن کا رُخ کیا اور رات کے دو بجے پولیس اسٹیشن کے انچارج نے فوری طور پر پولیس کے ملازمین کو دوڑایا کہ جہاں سے بھی منتظم مشاعرہ مل سکیں تلاش کر کے تھانے پر لے آئیں ——— اُدھر منتظم مشاعرہ کو یہ زعم کہ وہ ممبر پارلیمنٹ کا قریبی عزیز ہے اور قومی یک جہتی کا مشاعرہ کانگریس آئی کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی غرض سے کرایا گیا تھا۔ اس لیئے منتظم صاحب اپنے آپ کو ایک کانگریسی (آئی) ممبر پارلیمنٹ کے قلعہ میں محفوظ سمجھ رہا تھا۔ مگر پولیس کسی نہ کسی طرح سے منتظم مشاعرہ کو تھانے پر لے آئی۔ ویسے بھی آج کل یو، پی کی پولیس ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے چاق و چوبند ہے۔ لہٰذا یہ منتظم مشاعرہ کو جو کہ قومی یکجہتی کی آڑ اور ایم، پی صاحب کے نام پر شریف ڈاکہ زنی کا مُرتکب تھا، جب پولیس افسر کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے کہا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایسی معزز اور نامور ہستی کے بیان پر ہی تمھیں حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔ اس شریف ڈاکو نے آٹھ سو روپیہ کار کا آمدورفت کا کرایہ ادا کر دیا۔

یادش بخیر ——— جناب مہابردت صاحب ایڈیٹر فن و شخصیت کے قتیل شفائی نمبر کی مدد کے لیے ایک انڈو پاک مشاعرہ اندور میں منعقد ہوا۔ مشہور فلمی ہستی جناب سنیل دت صاحب شریف بمبئی کو مہمانِ

خصوصی بننے پر تیار کر لیا گیا۔ چونکہ قتیل شفائی صاحب خود بمبئی میں موجود تھے، اور وہ اس مشاعرہ میں مدعو تھے۔ لہٰذا قتیل صاحب کی وجہ سے دت صاحب اس مشاعرہ میں مہمانِ خصوصی بننے پر رضامند ہو گئے۔ ورنہ صابر دت صاحب کی صفاتِ دیرانہ سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

جب اندور میں یہ پبلسٹی کی گئی کہ مشاعرہ میں سنیل دت صاحب اس مشاعرہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آرہے ہیں تو اندور کے ایک ٹرانسپورٹر (جو غالباً سردار جی ہیں) نے بمبئی جا کر سنیل دت صاحب سے گزارش کی کہ آپ جس دن اندور تشریف لائیں تو کچھ وقت نکال کر میری ایک نئی بس جو ایک نئے روٹ پر چلائی جائے گی اس کی اس روٹ پر پہلی روانگی کی تقریب کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے فرما دیجیے ——— سنیل دت صاحب نے کچھ فلمی قسم کا نیم دلانہ اقرار کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آپ فن و شخصیت کے قتیل نمبر کے لیے آٹھ ہزار روپیہ کے اشتہار فراہم کر دیں تو میں آپ کی نئی بس کا افتتاح کر دوں گا۔ ۔ ۔ یہ ٹرانسپورٹر بمبئی کی فلمی ہستیوں سے کچھ زیادہ ہی سوجھ بوجھ کا مالک تھا، اس نے جھٹ دو ہزار روپیہ کے نوٹ نکالے اور سنیل دت صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ ۔ ۔ ۔ دت جی ایہہ لو نی تے کرو، باقی جدوں تسیں اندور آؤ گے تے بس دا اُدگھاٹن کر دو گے نہ تے او تھے شہر دے سارے وڈے وڈے آدمی ہوں گے تے میں اُوسے ویلے باقی اشتہارات لے دیاں گا۔ ۔ ۔

ٹرانسپورٹر کی بات میں وزن تھا، لہٰذا دت صاحب نے دو ہزار روپے کے نوٹ اُٹھانے کے لیے صابر دت کو اشارہ کیا اور بات پکی ہو گئی ——— تاریخ مقررہ پر دت صاحب نے اس نئی بس کا اُدگھاٹن بھی کر دیا۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ ٹرانسپورٹر صاحب نے دت صاحب اور صابر دت صاحب کی موجودگی میں کچھ حضرات سے اشتہار کی بات بھی کی اور یقین دلایا کہ ایک دو دن میں اشتہارات مل جائیں گے۔ مگر ٹرانسپورٹر کا دت صاحب کے ساتھ یہ وعدہ فلمی وعدہ ہی رہا اور دو ہزار روپے کے بعد ایک پیسہ بھی صابر دت کو وصول نہ ہوا۔

اندور کے اس مشاعرہ کے بارے میں یہ طے ہوا تھا کہ اخراجات نکال کر جو کچھ بچے گا وہ فن و شخصیت کے قتیل شفائی نمبر کی مدد کے لیے صابر دت صاحب کو دے دیا جائے گا ——— اس مشاعرہ کے سلسلے میں بتیس ہزار روپیہ فراہم ہوا۔ اگر صابر دت صاحب چاہتے اور ہوش مندی سے کام لیتے تو کم و بیش نصف روپیہ انھیں مل سکتا تھا مگر وہ اپنے ساتھ بمبئی کے ایسے شعراء کا طائفہ لے گئے جو پانی کی جگہ شراب پیتا تھا اور پھر منتظمینِ مشاعرہ نے شعرائے کرام کے قیام کے لیے جو بہترین انتظام کر رکھا تھا اسے بھی صابر دت نے شراب کے نشہ میں درہم برہم کر کے شعرا کو ایک ایسے تھری اسٹار ہوٹل میں لے گئے جہاں ایک کمرے کا کرایہ پونے چار صد روپیہ تھا، صابر دت کے اللوں تللوں کے باعث صرف تین ہزار روپیہ باقی بچا تو انھیں فن و شخصیت کے قتیل شفائی نمبر کے لیے دے دیا گیا۔

مشاعرہ اس قدر سپاٹ گیا کہ اندور کی تاریخ میں ایسا خراب مشاعرہ آج تک نہیں ہوا۔ بمبئی کے ایک شاعر جنھیں بلٹز کے ادارے کا رکن ہونے کا غرور ہے، مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے سامعین کو گالیاں دینے لگے۔ وہ تو خیر ہوئی عزیز اندوری صاحب اور دوسرے مقامی حضرات نے سامعین کو قابو میں رکھا ورنہ کچھ سامعین تو اس شاعر کی پتلون اُتار کر انھیں بلٹز کے اوراق میں لپیٹنے کو تیار تھے۔ اور تو اور قتیل صاحب بھی ناکام

اور ——— دہلی کی وہ آپ بیتی بھی ہے جو اب جگ بیتی کا حصہ بن گئی ہے۔
بُنیادی طور پر ہر حصہ میں کسی نہ کسی کردار کو لیا گیا ہے اور اس کے اچھے یا بُرے پہلوؤں کو ایک ایک کرکے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے اور ——— سیرت کا نقشہ بھی آنکھوں کے آگے کھنچ جاتا ہے۔
زندگی میں طرح طرح کے تجربات سے سب کو سابقہ رہتا ہے ——— لیکن ———
مَیں نے بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنھیں اتنے دلچسپ اور گوناگوں کرداروں سے واسطہ پڑا ہو۔
سَرور تونسوی کا تجربہ نہایت وسیع ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ زندگی کو انھوں نے کتنی سطحوں پر برتا، دیکھا اور چکھا ہے۔
اِن کرداروں میں ———
صاحبِ ثروت، جہاں دیدہ لوگ بھی ہیں۔
بڑے بڑے شعراء، ادباء، عُلما اور نامور ہستیاں بھی،
اور ——— چور، اُچکّے، بدمعاش، ڈاکو، طوائفیں، دلّال اور بھڑوے بھی۔
اَور بعض اَوقات تو ——— گرے پڑے معمولی لوگوں میں انھوں نے ایثار و قربانی اور سچّائی اور خدمت کے ایسے مناظر دکھائے ہیں جو ——— صرف وہی شخص

رہے اور مشاعرہ ہزار فی صدی فیل رہا۔

'شمع' کے مدیر جناب الیاس دہلوی کے ہاں اشفاق صاحب (محترمہ واجدہ تبسم کے شوہر نامدار) اور دو اصحاب اور تشریف فرما تھے۔ جن میں ایک صاحب خاصی عمر کے تھے۔ ملازم چائے لایا تو یہ صاحب فرمانے لگے... چائے پر ایک بات یاد آگئی ہے، آپ حضرات بھی سنیں گے تو داد دیں گے... الیاس صاحب تو اپنے کام میں محو رہے۔ اشفاق صاحب اور میں ان صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمانے لگے... کہیں رشتہ طے ہونے کی بات چیت ہو رہی تھی، لڑکی اور لڑکا بھی موجود تھے۔ چائے کی پیالی میں شکر ہلاتے وقت لڑکا بار بار چمچہ کو پیالی سے ٹکرا رہا تھا، جس پر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ میں اس لڑکے سے شادی نہیں کروں گی کیونکہ اسے اتنی عقل بھی نہیں کہ پیالی میں شکر کس طرح ہلائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ سوسائٹی میں میرے ساتھ نہ چل سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت آپ سب کی طرح میں نے بھی اور اشفاق صاحب نے بھی سن رکھی تھی، لہٰذا ہم دونوں نے ان صاحب کے اس پھسپھسے انکشاف پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہ کیا اور یہ صاحب کھسیانے ہو کر اپنی چائے کی پیالی میں چمچہ سے شکر ہلانے لگے تو چمچے کے بار بار پیالی سے ٹکرانے کی آواز سارے کیبن میں سنائی دے رہی تھی۔ کیبن سے جب باہر آئے تو اشفاق صاحب فرمانے لگے... سَر در صاحب، غالباً یہی صاحب وہ روایتی لڑکے رہے ہوں گے جن سے اس لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

رہے نام اللہ کا

حاجی بخش الٰہی سگریٹ والے

دلّی کی ایک ایسی سرکردہ ہستی تھی کہ ملک بھر میں اُن کی سخاوت کا ڈنکا بجتا تھا۔ سینکڑوں اسکولوں اور کالجوں کو وہ مالی مدد دیتے تھے۔ دلّی کے علاوہ کلکتہ میں بھی اُن کی بہت زیادہ جائداد تھی۔ غرضکہ کروڑوں میں کھیلتے تھے۔

ایک دفعہ اُنھوں نے وائسرائے کو اپنے ہاں چائے کی دعوت پر بلایا تو وائسرائے کے لیے جو چائے کی پیالی بنائی گئی اُس کے لیے اُنھوں نے اسّی ہزار روپے کے کرنسی نوٹ جلا کر چائے بنوائی اور وہ اِس حماقت کو اپنی دولتمندی اور فارغ البالی کا ایک ادنیٰ سا کارنامہ قرار دیتے تھے۔

حاجی صاحب ہر سال زکوٰۃ بھی شرعی احکام کے مطابق نکالتے تھے۔ حاجی صاحب کی بیگم صاحبہ جو اماں جی کہلاتی تھیں، بڑی کرّوفر والی خاتون تھیں۔

ایک غریب اور مفلوک الحال مسلمان عورت پھٹے پُرانے برقعے میں ان اماں جی کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سوال کیا کہ انھیں بھی زکوٰۃ میں سے کچھ دیا جائے جس پر اماں جی نے فرعونی لہجے میں کہا کہ اب تو زکوٰۃ بٹ چکی اگلے سال آنا۔ عورت نے پھر منت سماجت کے ساتھ گزارش کی کہ اُسے سخت ضرورت ہے کسی نہ کسی طرح اس کی مدد کی جائے۔ جس پر اماں جی فرمانے لگیں کہ خاموشی سے چلی جاؤ ورنہ چٹیا پکڑ کر نکلوا دُوں گی۔۔۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ سوالی عورت نے اپنی ضرورت اور اپنی مفلوک الحالی کا بیان اور شدّت سے کیا اور پھر مطالبہ کیا کہ جیسے بھی ہو اُسے دروازے سے خالی نہ بھجوایا جائے جس پر اماں جی کو غصّہ آگیا اور انھوں نے اپنی ملازماؤں کو حکم دیا کہ اس کی چٹیا پکڑ کر دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ اماں جی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور اس مفلوک الحال عورت نے جاتے جاتے روتے ہوئے کہا کہ انشاء اللہ آئندہ سال زکوٰۃ بانٹنے کے لیے اللہ میاں تمھیں اس کا اہل ہی نہیں رکھیں گے۔

چند ہی دنوں بعد گھر لوٹھیگڑوں نے وہ تباہی مچائی کہ واقعی اماں جی کو کھانے تک کے لالے پڑ گئے اور واقعی اللہ نے انھیں اِس قابل نہ رکھا کہ اگلے سال وہ زکوٰۃ بانٹنے کی سعادت حاصل کر سکیں۔

گلی قاسم جان

دلّی میں ایک صاحب فیروز نامی تھے۔ دُوکان تو اُن کی بیڑی کی معمولی سی تھی مگر کپڑے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

وہ ہر وقت سفید بُراق پہنتے تھے۔ شاید ہی کسی نے فیروز کو کبھی میلے یا رنگ دار کپڑے پہنے دیکھا ہو۔ گلی محلے والوں نے فیروز کا عرفی نام "لانڈری دُھلا" رکھ دیا اور وہ اس نام سے محلے اور بازار میں مشہور تھے۔

شامتِ اعمال کہ راہ چلتے ہوئے ایک ضعیف شخص اُن سے ٹکرا گیا ——— بُڈھے کے کپڑے انتہائی میلے کچیلے تھے، لہٰذا لانڈری دُھلا صاحب سے رہا نہ گیا اور اُس بُڈھے کو گدی سے پکڑ کر لکریں دیں اور خوب مارا کہ تُو نے میرے کپڑے خراب کر دیے ——— محلے کے ایک شریف شخص نے لانڈری دُھلے کو ٹوکا کہ تم نے یہ بہت بُرا کیا ہے۔ اس پر لانڈری دُھلا اُس شریف شخص سے بھی تُو تُو مَیں مَیں پر اُتر آیا۔ بہرکیف بات آئی گئی ہو گئی۔

مگر تین روز بعد ہی پولیس نے لانڈری دُھلے کے ہاں چھاپہ مارا تو بھید کھُلا کہ چرس اور افیون کا دھندہ بیڑی کے پتوں کی آڑ میں کر رہے تھے۔ پولیس ڈنڈے مارتی ہوئی لانڈری دُھلے کو تھانے لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس نے دو دن بعد عدالت میں پیش کر کے مزید تحقیقات کے لیے لانڈری دُھلے کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ اور دو دن بعد جب پولیس تفتیش کے لیے لانڈری دُھلے کو اُس کے مکان پر لائی تو حضرت ایک میلے کچیلے بنیان اور انتہائی گندے جانگیے میں ملبوس تھے۔

محلے اور گلی بازار کے لوگ ایک دوسرے کو آوازیں لگا لگا کر کہہ رہے تھے کہ لانڈری دُھلے کی اصلیت دیکھ لو۔ جس شریف شخص نے لانڈری دُھلے سے کہا تھا کہ تم نے غریب بُوڑھے کو مار کر اچھا نہیں کیا، وہی مہاشب تشریف لائے اور لانڈری دُھلے سے کہنے لگے . . . دیکھا اُس غریب کی آہ کا نتیجہ ——— لانڈری دُھلا ندامت سے آنکھیں نیچے کیے کھڑا رہا۔

گلی قاسم جان

میں احمد نام کا ایک بدمعاش تھا جس کا قد سوا چھ فٹ تھا۔ اُس نے بسکٹ اور بچوں کی مٹھائیوں کی دوکان بنا رکھی تھی۔ اُس کی عادت تھی کہ دُوکان کے دروازے کا ایک پٹ ہمیشہ بند رکھتا اور اس کی اوٹ میں بیٹھا رہتا۔ جونہی کوئی بچہ دوکان سے گزرتا ——— تو اُسے بڑے پیار سے بُلاتا اور بغیر کچھ لیے دیے بسکٹ یا ٹافی وغیرہ دے دیتا۔ بچہ خوشی خوشی مُفت کا بسکٹ یا ٹافی کھاتے ہوئے اپنے گھر چلا جاتا۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ انھیں کوئی پیار سے بلائے اور کھانے کے لیے مٹھائی وغیرہ دیتا رہے تو وہ اُس سے مانوس ہو جاتے ہیں ——— چنانچہ یہ بدمعاش گلی محلے کے بچوں کو بسکٹ اور ٹافی کھلاتا رہتا اور جونہی سات آٹھ دن گزرتے تو بچوں کے والدین کو جب دُوکان کے آگے سے نکلتا دیکھتا تو بڑی رُعب دار آواز میں مُفت کھانے والے کسی بھی بچے کے باپ کو بُلا لیتا اور کہتا کہ تمھارا بچہ ہر روز بسکٹ اور ٹافی لے جاتا ہے، سات روپے کا بل ہو گیا ہے فوراً ادا کرو ——— بدمعاش کے رُعب سے ڈرتے ہوئے ہر باپ اپنے بچوں کے اس غیبی بلوں کی ادائیگی کرنے میں ہی اپنی خیریت سمجھتا۔ احمد بدمعاش کے اس رویے سے گلی محلے سے سب لوگ نالاں تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

ایک دن کسی راہ چلتے نے احمد بدمعاش کو بتایا کہ تمھارا بھائی ہمدرد دواخانہ کے سامنے پٹ رہا ہے۔ احمد بدمعاش کھانا کھا رہا تھا۔ لہٰذا وہ کھانے کو ویسے ہی چھوڑ کر ہمدرد دواخانہ کی طرف دوڑا اور جاتے ہی

اُس شخص کے سر پر زور سے مُکّا مارا جو احمد بدمعاش کے بھائی کو پیٹ رہا تھا، جس سے وہ شخص بُری طرح سے ایک طرف گر پڑا اور احمد بدمعاش اُس پر پل پڑا۔ احمد بدمعاش کے ہاتھوں پٹ رہے شخص کا چھوٹا بھائی جس کی عمر مُشکل سے دس بارہ سال کی تھی، بڑی تیزی سے بھاگا اور ہمدرد دواخانہ کے سامنے والی گلی کی نکڑ پر درزی کی اُوپچی دوکان سے قینچی اُٹھا لایا اور اس زور سے احمد بدمعاش کے پیٹ میں گھونپی کہ دائیں طرف سے پیٹ میں قینچی گھس کر بائیں طرف جا نکلی ——— احمد بدمعاش کے پیٹ سے لہو کے فوّارے چھوٹ رہے تھے محلے اور بازار کے سب لوگ احمد بدمعاش سے نالاں تھے، کسی نے بھی اُسے اُٹھایا تک نہیں۔ آخر کار احمد بدمعاش کے پٹے ہوئے بھائی نے ہی کسی طرح اُسے ٹانگے پر لادا اور اندرونِ ہسپتال کی راہ لی مگر ٹانگہ ابھی حوضِ قاضی بھی نہ پہنچا تھا کہ احمد بدمعاش کی موت ہو گئی۔

جانسٹھ کے ایک سرکردہ زمین دار (جن کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا) گھوڑے پر سوار جا رہے تھے، ایک گھوسی سر پر سوکھی گھاس کا اُونچا سا گٹھا اُٹھائے آ رہا تھا۔ نہ معلوم کس طرح گھاس کے اس گٹھے کی پھیلی ہوئی سوکھی گھاس کے دو تین تنکے زمین دار صاحب کی ناک سے چھو گئے۔ جس پر زمیندار صاحب نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے چابک سے گھوسی کو اتنا پیٹا کہ دیکھنے والوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور گھوسی پٹتا رہا اور آسمان کی طرف نظریں جمائے رہا ——— گھوسی نہ تو چیخا اور نہ ہی اُس نے کوئی احتجاج کیا۔ بس خاموش رہا اور آسمان کی طرف نظریں جمائے رہا۔ قریب کے کھیت سے ایک صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور گھوسی سے کہنے لگے کہ تو زمیندار کو کچھ کہہ دے یا خوب گالیاں دے۔ مگر گھوسی خاموش رہا۔

دوسرے ہی دن زمین دار صاحب صبح میں گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلے۔ ابھی گاؤں سے تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ چھوٹے سے گڑھے میں گھوڑے کا پاؤں اس انداز سے پڑا کہ گھوڑا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا، اور گر گیا۔ گھوڑے کے گرتے ہی زمیندار صاحب بھی گھوڑے کی اگلی طرف گر پڑے اور اُن کا سر ایک بڑے سے پتھر پر اس زور سے لگا کہ زمیندار صاحب کلمۂ شہادت بھی نہ پڑھ سکے اور اُن کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

گاؤں والوں نے اُس شخص سے پوچھا کہ آپ نے اُس وقت گھوسی سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ زمیندار کو کچھ کہہ دے خواہ گالیاں ہی دے دے۔ تو اُس شخص نے فرمایا کہ میں نے بڑوں سے سُنا ہے کہ اگر ظلم کرنے والے کو مظلوم کچھ بد دُعا یا گالی وغیرہ دے دے تو معاملہ عوض معاوضہ گلہ ندارد کے طور پر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر مظلوم قطعاً خاموش رہے تو پھر معاملہ خُدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور خُدا کا فیصلہ تو بالکل سو لہ آنے صحیح ہوتا ہے ——— رہے نام اللہ کا!

بگ بیگر

قریباً تیس سال پہلے ایک دن دفترِ شانِ ہند، میں ایک صاحب تشریف لائے۔ بال بکھرے ہوئے، چہرے پر مُردنی، آنکھیں سُرخ جن سے وحشت ایسے ٹپک رہی تھی کہ یا تو ابھی کسی کو قتل کر کے آئے ہیں یا کسی کی خیر نہیں۔ پاؤں میں معمولی قسم کی چپل جس کی مرمّت کئی بار ہو چکی تھی۔ پتلون میلی اور قمیض میلی تو تھی ہی اس کے بٹن بھی داغِ مفارقت دے چکے تھے۔

دروازے میں قدم رکھتے ہی میرا نام لیتے ہوئے رواں دواں انگریزی میں فرمانے لگے مجھے ڈاکٹر شراف آئی اسپیشلسٹ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مَیں نے متحیّر انداز میں عرض کیا۔ . . فرمایئے کیا حکم ہے . . . ؟ انھوں نے پھر فصیح و بلیغ انگریزی میں جواب دیا کہ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مَیں کچھ بیان کروں مَیں نے صرف یہی کہا تشریف رکھیے۔ انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہی انگریزی میں کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ مَیں نے معافی چاہتے ہوئے گزارش کی اگر آپ اُردو میں بولیں تو میرے لیے آسانی ہوگی کیونکہ مَیں انگریزی میں ایسی دسترس نہیں رکھتا کہ آپ کی فصیح و بلیغ انگریزی مَیں پوری طرح سمجھ سکوں اور اسی انداز میں جواب دے سکوں۔ انھوں نے قدرے ندامت کے انداز میں سوری SORRY کہہ کر ایسی زبان میں بات کرنی شروع کی جس میں اُردو بچاری پھر بھی گھاٹے میں تھی کیونکہ وہ ہر دو ایک فقرہ کے بعد انگریزی میں ہی بولنا شروع کر دیتے تھے اور بار بار سوری بھی کہتے جا رہے تھے۔

فرمانے لگے میرا نام ڈاکٹر بدان ہے۔ مَیں نے ڈی لٹ لنڈن سے کیا اور کراچی میں سندھ آبزرور SINDH OBSERVER کا ایڈیٹر تھا۔ اب رفیوجی کی حیثیت سے دہلی کنگز وے کیمپ میں مقیم ہوں۔ میری بیوی ہے اور دو لڑکیاں ہیں جن میں ایک ایم۔ اے ہے اور دوسری بی۔ اے ——— کیمپ میں کچھ دنوں تک امریکی گیہوں وغیرہ فوری مدد کے طور پر ملتا رہا، اب وہ بھی بند ہو چکا ہے۔ کئی کئی وقت فاقے گزر جاتے ہیں۔ مَیں تو خیر کچھ درختوں کے پتّے نمک سے کھا کر پانی پی لیتا ہوں مگر میری بیٹیاں جب بھوک سے بے حال ہوتی ہیں تو دیکھا نہیں جاتا۔ مَیں نے ہر ممکن طور پر کوشش کر لی ہے کہیں بھی ملازمت نہیں ملتی۔ آج ڈاکٹر شراف کے یہاں گیا تھا کہ وہ اپنے ہسپتال میں کوئی کام دے دیں، تو انھوں نے آپ کا نام اور پتہ لکھ دیا کہ مَیں آپ سے ملوں آپ ضرور کہیں نہ کہیں کام دلوا دیں گے۔ ڈاکٹر بدان سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے یکایک کانپنے لگے اور انتہائی غصّے کی حالت میں انگریزی میں کہنے لگے . . . یہ مہاتما گاندھی کی چیلی جو آپ کی دلّی کی ہیلتھ منسٹر ہے ڈاکٹر سوشیلا نائر، کل کیمپ میں کپڑے بانٹنے آئی تھی۔ ہمیں بھی

ایک سوستائیس

ایک کمبل اس نے دیا تو میری بڑی لڑکی نے اسے پھٹکارتے ہوئے کہا کہ . . . آپ ہیلتھ منسٹر ہیں کیا یہ کمبل کو اوڑھنے والا صحت مند سے صحت مند آدمی بھی کبھی بیماریوں کے جرمز GERMS میں اپنے آپ کو گھرا ہوا نہیں پائے گا . . . " تو اس پر ڈاکٹر سوشیلا نائر نے بڑی بے رُخی اور توہین آمیز کلمات میں کہا کہ . . . اتنے نواب تھے تو سیسل ہوٹل میں ٹھہر جانا تھا (اُن دنوں سیسل ہوٹل دِلی کا ایک قابلِ ذکر ہوٹل تھا) یا پاکستان میں ہی مسلمان ہو جانا تھا —— اس کے بعد نہ جانے غصّے میں ڈاکٹر مدان بچاری "گاندھی کی چیلی" کو کیا کیا کہتے رہے۔

ابھی ان کا غصّہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا کہ میری بیوی کھانا لے کر آگئیں۔ اُن دنوں میری رہائش محلہ سُوئیوالان چاندنی محل میں تھی اور دوپہر کا کھانا بیوی دفتر میں ہی لے آتی تھیں۔ میں نے بیوی سے کہا کہ وہ کھانا برآمدے میں میز پر لگا دے۔ دو چار منٹ بعد میں نے ڈاکٹر مدان سے التجا کی کہ آپ کھانا کھا لیجیے۔ وہ میرے ساتھ برآمدے میں آئے تو کہنے لگے . . . کھانا تو آپ کے لیے آیا ہے، میں بن بلائے مہمان کیسے کھا لوں۔ میں نے انتہائی عاجزی سے پھر گزارش کی کہ آپ کھانا شروع کیجیے، میری طبیعت خراب ہے۔ اگر آپ تشریف نہ بھی لاتے تو بھی میں کھانا نہیں کھاتا —— کافی پس و پیش کے بعد انھوں نے کھانا شروع کیا۔ اور آپ یقین مانیے کہ ہم دونوں میاں بیوی کا کھانا وہ چٹکی بجانے میں ختم کر چکے تھے۔

اُن دنوں آس پاس سوائے موتی محل کے کوئی دوسرا ہوٹل یا ڈھابہ بھی نہ تھا کہ فوری طور پر میں کھانا لے آتا۔ اور اُن دنوں میرے ہاں کوئی چپراسی یا کلرک بھی نہ تھا کہ اُسے بھیج کر موتی محل سے کھانا منگوا لیا جاتا —— ہم میاں بیوی نے محسوس کیا کہ کھانا ڈاکٹر مدان کے لیے بہت ہی کم رہا ہے۔ مگر یہ ضرور تھا کہ ڈاکٹر مدان کے پیٹ میں کھانا جانے سے اُن کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی اور ان کے بولنے کے انداز میں کسی حد تک شگفتگی بھی جھلکنے لگی تھی۔

دفتر شانِ ہند کے نیچے چائے کی دوکان تھی (جو اَب کھانے کا ڈھابہ بن چکا ہے) میں نے بیوی سے اشارتاً کہا کہ وہ نیچے جائے اور چائے والے کو کہہ آئے کہ تین چائے اور کم از کم دس بارہ ٹوسٹ مکھن لگا کر بھجوا دے۔ بیس منٹ کے بعد چائے والے کا ملازم چائے اور ٹوسٹ لے کر آیا۔ میں نے اور میری بیوی نے دو دو ٹوسٹ کھائے اور باقی ہم نے اصرار کر کے ڈاکٹر صاحب کو ہی کھلائے۔ ایک چائے کے ساتھ آٹھ ٹوسٹ کھانا مشکل تھا، لہٰذا ایک چائے اور منگائی گئی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے پھر انگریزی میں کہا کہ اگر ہم محسوس نہ کریں تو وہ کچھ دیر سونا چاہیں گے —— میں خود کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو ایک گھنٹہ سونے کا عادی ہوں۔ چنانچہ میں نے دفتر میں ہی ایک چٹائی اور تکیہ رکھ چھوڑا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے چٹائی برآمدے میں بچھا دی اور ڈاکٹر صاحب پانچ دس منٹ بعد گہری نیند سو رہے تھے۔ بیوی سے میں نے کہا کہ وہ گھر جائے اور چار بجے تھرمس میں چائے بھر کر لے آئے۔ اور پھاٹک مُفتی والان سے مونگ کی دال والے سموسے اور کچھ بسکٹ وغیرہ لیتی آئے۔

ڈاکٹر صاحب سوا چار بجے سو کر اُٹھے تو ان کے چہرے پر زندگی کے آثار اُبھر آئے تھے۔ پھر انگریزی کے بڑے خوشنما الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھے۔ بیوی نے میری میز پر ہی چائے اور کھانے کی کچھ چیزیں رکھ دیں۔ اور ہم نے باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب کو چائے کم پلائی اور کھلایا زیادہ۔

پانچ بجے دفتر بند کرتے ہوئے مَیں نے ڈاکٹر مدان کے ہاتھ میں ایک لفافہ جس میں معمولی رقم تھی، تھماتے ہوئے مؤدبانہ گزارش کی کہ آپ کل صبح دس بجے ہی تشریف لے آئیے گا، آپ کا سب انتظام کر دیا جائے گا ——— انھوں نے لفافہ لینے سے انکار کیا تو مَیں نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ آنے جانے کے لیے اخراجات ہیں، چھوٹے بھائی کی طرف سے قبول فرمالیجیے ——— ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت انگریزی میں شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی راہ لی۔ اور ہم دونوں میاں بیوی چاندنی محل آ گئے۔

اگلے روز حسبِ وعدہ وقتِ مقررہ پر ڈاکٹر مدان تشریف لائے۔ اُن دنوں بیسویں صدی کا دفتر ترکمان گیٹ کے باہر تھا۔ اور خوشتر گرامی کے خلاف سردار دیوان سنگھ مفتون نے بیسویں صدی معمّوں کی مبنیہ بددیانتی کے خلاف جہاد شروع کر رکھا تھا، چونکہ مَیں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کا ادنےٰ خادم تھا۔ اس لیے میری تمام تر خدمات سردار صاحب کے لیے وقف تھیں، چنانچہ خوشتر گرامی صاحب مجھے بھی اپنے مخالفوں میں ہی سمجھتے تھے ——— مگر مَیں ڈاکٹر مدان کو لے کر بلا جھجک ان کے دفتر میں گیا اور خوشتر گرامی صاحب سے ڈاکٹر مدان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کے گھر کے لیے راشن وغیرہ کا انتظام ابھی کرائیے۔

بیسویں صدی کے دفتر کا تمام اسٹاف کنکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کر رہا تھا کہ سرور یہاں کیسے . . . خوشتر صاحب نے فوراً اپنے کیشیر کو بلایا اور حکم دیا کہ سرور صاحب کے ساتھ جائیے اور جو کچھ یہ کہیں خرید کر دیجیے۔ اور ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی لے جاؤ اور جہاں سرور صاحب کچھ سامان پہنچانے کو کہیں پہنچا دو اور انھیں واپسی پر گھر چھوڑ دینا . . . چنانچہ آٹے کی بوری، ڈالڈے کا چار کلو کا ٹین، چینی، دالیں، اور دوسری راشن کی ضروری چیزیں خرید کر موٹر پر ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ بھجوا دیں۔ اور ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ کل تشریف لائیے گا۔

ڈرائیور نے آکر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیٹیوں کے کپڑے اس قدر پھٹے ہوئے تھے کہ لڑکی کی ران نظر آ رہی تھی۔ اور مَیں نے از خود دس روپیہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ خوشتر صاحب نے سبزی خریدنے کے لیے دیے تھے۔

دوسرے دن ڈاکٹر مدان آئے تو مَیں نے اُن کے آنے سے پیشتر ہی سردار رہاں سنگھ ایڈیٹر امرجیوتی (ہندی) سے اجازت لے رکھی تھی۔ چار لحاف، چار تکیے، چار گدّے . . . اور چار چادریں اُن کی طرف سے خرید کر ڈاکٹر صاحب کو پیش کیے گئے اور میرے پڑوس میں تحریک کا دفتر ہے، چنانچہ تحریک کے ایڈیٹر جناب گوپال متّل سے مَیں نے گزارش کی کہ آپ ڈاکٹر مدان کے لیے کسی اخباری دفتر میں ملازمت کا انتظام کرائیے۔ چنانچہ تین دن کے اندر اندر متّل صاحب نے جناب رام سنگھ کے انگریزی اخبار میں ڈاکٹر مدان کی ملازمت کا بندوبست کر دیا۔ جب چار دنوں کے بعد ڈاکٹر مدان ملازمت پر جانے کے لیے آئے تو ان کے کپڑے اور جوتے اس قابل نہ تھے کہ وہ کسی دفتر میں جاتے ——— لہٰذا متّل صاحب نے فوراً باٹا کمپنی سے بہترین جوتا خرید کر پیش کیا۔ اور میری عرضداشت پر میرے ایک کرم فرما نے (جن کا نام شائع کرنے کی اجازت نہیں) ڈاکٹر صاحب کے لیے چار پتلون اور چار شرٹ خرید دیں۔ اور ان کی بچیوں کے لیے بھی دو جوڑے اور چپل خرید دیے۔ جب ڈاکٹر مدان کام پر جانے کے لیے تشریف لائے تو واقعی سندھ آبزرور

بتا سکتا ہے جس کا زندگی کا تجربہ انتہائی پہلو دار اور بوقلمونی ہو
اِن تحریروں میں خاکہ نگاری اور واقعہ نویسی دونوں کا لطف
ہے ——

مقصد، اخلاص، محبت، بے لوثی، خدمتِ خلق، فیاضی، مذہبی رواداری دوست داری اور دردمندی کی اقدار کو اُجاگر کرنا ہے اور —— ریاکاری اور ملمع بازوں کی کھال کھینچا ہے

سرور تونسوی کو خود شاید یہ احساس نہیں کہ —— اس قلمی سفر میں وہ زندگی کے کچے سونے جیسے حسن، کھُردرے پن اور بے ریائی کو کس بے ساختگی اور روانی سے بے نقاب کرتے چلے گئے ہیں۔

متعدد واقعات —— سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کے گرد گھومتے ہیں جو صحافت میں سرور تونسوی کا آئیڈیل بن گئے تھے۔ جہاں ان کی بے باکی، بے خوفی، حق گوئی اور فیاضی کی داد دی ہے، ان کی بلیک میلنگ کی بھیانک کمزوری کا بھی ذکر کیا ہے جو ساری صحافیانہ خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے اور پورے کردار کو داغ دار بنا دیتی ہے۔

کے ایڈیٹر نظر آرہے تھے ——— مگر دفتر والوں نے دوسرے ہی دن شکایت کی کہ ان کی نظر اتنی کمزور ہے کہ یہ کام نہیں کر سکتے . . . دوسرے ہی دن نظر کا چشمہ لگوا دیا گیا۔

اب ڈاکٹر صاحب اپنے قدموں پر کسی حد تک کھڑے ہو چکے تھے۔ دو چار ماہ تک تو وہ کبھی کبھار تشریف لے آتے تھے۔ مگر اُس کے بعد ایسے گم ہوئے کہ کئی ماہ تک اُن کی خبر نہ مل سکی۔ کنگز وے کیمپ سے دریافت کرایا تو پتہ چلا کہ انھیں کہیں سرکاری مکان الاٹ ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

قریباً دو سال بعد سنٹرل سکریٹریٹ سے واپسی پر بس میں ڈاکٹر صاحب سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے خود ہی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا: سَرور صاحب، نمشکار!

بہترین لباس میں ملبوس، سر پر فیلٹ کیپ، مُنہ میں سگار پھر رواں دواں انگریزی میں کہنے لگے شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ عرض کیا . . . شاید نہیں پہچانا ——— مسکراتے ہوئے کہنے لگے . . . میں ہوں سندھ ابزرور والا ڈاکٹر مدان ——— میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات سے ہاتھ ملایا اور شکایتی لہجے میں کہا کہ . . . اتنے دنوں آپ کہاں رہے، مُلاقات تک نہ کی نہ یہ بتایا کہ مکان کہاں لے لیا ہے ——— کہنے لگے . . . چاندنی چوک تک جانا ہے تم بھی میرے ساتھ چلو، کسی ریستوران میں بیٹھیں گے اور بات چیت کریں گے۔

میرا ٹکٹ دریا گنج تک کا تھا اور اُن کا لال قلعہ کا۔ دریا گنج آیا تو ایک آنے کا ٹکٹ اور لے کر ڈاکٹر مدان کے ساتھ لال قلعہ پر اُترا اور چاندنی چوک میں لکشمی ریسٹورنٹ (اُن دنوں یہ ریسٹورنٹ چاندنی چوک کی شان تھا) میں آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے چائے اور پکوڑوں کا آرڈر دیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فرمانے لگے کہ . . . میں نے لندن کے ایک روزنامے کے ایڈیٹر کو اپنی بدحالی کی داستان لکھی تھی کہ ہمارے مُلک میں صحافی کی یہ قدر ہے جب کہ دوسرے ممالک میں صحافیوں کی عزت و توقیر کا ایک خاص مقام ہے۔ لندن کے یہ صحافی ایک عرصہ سے سندھ ابزرور کے ایڈیٹر ڈاکٹر مدان سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر مدان کا اصل خط ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں بھجوا دیا اور لکھا کہ آپ ایسے وزیر اعظم جو دُنیا میں ایک نرالی وزیر اعظم ہیں، کے مُلک میں ڈاکٹر مدان ایسے صحافی کی یہ گت بن رہی ہے۔ چنانچہ جب یہ خط پنڈت جی کے پاس پہنچا تو انھوں نے فوراً اپنے سیکریٹری کو حکم دیا کہ ابھی ڈاکٹر مدان کو بُلوائیے۔ چنانچہ پرائم منسٹرز سکریٹریٹ کی ایک لمبی کار پر ایک افسر ڈاکٹر مدان کو ڈھونڈتے کنگز وے کیمپ پہنچا اور انھیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ پنڈت جی کی کوٹھی پر لے جایا گیا۔

ڈاکٹر مدان نے کسی قدر فخریہ لہجہ میں کہا کہ . . . جب پرائم منسٹر کی بھجوائی ہوئی کار اُنھیں لینے آئی تو میں تمام کیمپ میں رہنے والے رفیوجیوں میں ایک مخصوص انسان نظر آ رہا تھا۔

ڈاکٹر مدان سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے . . . سَرور صاحب جب میں پنڈت جی کے سکریٹری کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے کہا کہ تمھارے لیے بہت بڑی سفارش آئی ہے۔ پرائم منسٹر کی ہدایت پر آپ کو بُلایا گیا ہے ——— دو منٹ کے بعد سیکرٹری نے فون سے پنڈت جی سے کہا کہ ڈاکٹر مدان آگئے ہیں اور اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر پنڈت جی کے کمرے میں گئے۔ پنڈت جی نے اپنے سیکریٹری سے کہا کہ ایک ہزار روپیہ کا چیک ان کے نام بنا کر لاؤ ——— ڈاکٹر مدان کہنے لگے، یہ سُنتے

ہی مَیں نے عرض کیا کہ . . . پنڈت جی آپ نے مجھے BIG BEGGER سمجھا ہے، مجھے خیرات کی ضرورت نہیں ہے - اگر آپ نے مہربانی کرنی ہے تو کوئی کام دلوائیے . . . اس کے بعد پنڈت جی نے پہلے غصّہ سے پھر مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ انھیں مناسب جگہ پر ملازمت دی جائے اور دوسرے ہی دن مجھے معقول ملازمت مل گئی اور رہائش کے لیے سرکاری طور پر مکان بھی الاٹ ہوگیا - لہٰذا اَب میں مزے میں ہوں ——— مگر بُرے وقت میں سَردار آپ نے جو میرے ساتھ سلوک کیا مَیں اُسے وزیراعظم کی مہربانی سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں -

ڈاکٹر مَدان اب اس دُنیا میں نہیں ہیں ——— مگر ان کی بیٹیاں بڑی اچھی جگہ پر ملازم ہیں اور دونوں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں -

جَے مَاتَا دِی

تلک نگر دہلی کا ایک ڈاکو لدھا رام اپنی ناپسندیدہ حرکات کے باعث اپنی نوجوان لڑکی کا رشتہ تلاش کرنے میں جب ہر طرح سے ناکامیاب ہو کر مایوس ہو گیا تو میرے ایک واقف کار کی معرفت میرے پاس آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا . . . میری بیٹی کا رشتہ کہیں کرا دیجیے کیونکہ میں ایک چور اور ڈاکو ہوں اس لیے میری لڑکی سے شادی کرنے کو کوئی بھی لڑکا تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں جہیز بھی کافی حد تک قیمتی دینے کو تیار ہوں مگر کوئی بھی جہیز وغیرہ کے لالچ میں نہیں آتا۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ میں جہیز میں چوری کا لوٹا ہوا مال ہی دوں گا۔ جسے گھر میں رکھنا خطرے کو دعوت دینا ہو گا۔

لدھا رام کی گڑگڑاہٹ اور میرے واقف کار کی سفارش پر میں نے بہت جلد وعدہ کر لیا کہ رشتہ کرا دیا جائے گا —— چنانچہ چند ہی دنوں میں ہندوستان ٹائمز پریس میں کام کرنے والے ایک نوجوان سے لدھا رام کی لڑکی کا رشتہ کرا دیا گیا۔ یہ رشتہ کئی خطرناک موڑ سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ اب لدھا رام کی لڑکی داماد والی ہو گئی ہے —— مگر لدھا رام نے اپنے داماد کو بھی نہ بخشا اور اسے بھی بدنامی کی گہری کھائی میں گرا دیا۔

رشتہ کے بعد لدھا رام کا میرے ہاں آنا جانا رہا —— اور ایک دن اس نے درخواست کی کہ اس کا ایک عزیز گوڑ گاؤں کی جیل میں زیرِ سماعت قیدی ہے، اگر میں اُس کی ضمانت دے دوں تو وہ جیل سے باہر آ کر اپنے مقدمہ کی پیروی کر سکے گا۔

میں ٹالتا رہا، مگر لدھا رام کبھی اس مُلزم کی بوڑھی ماں کو میرے پاس لا کر اور کبھی کسی معزز کو لا کر مجھ پر دباؤ ڈالتا رہا کہ میں ضمانت دے دوں . . . آخر کار جب لدھا رام نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں گوڑ گاؤں اس کے ساتھ گیا۔ متعلقہ عدالت میں ضمانت کی درخواست دی گئی۔ مجسٹریٹ نے میرا بیان حلفی پڑھا اور ضمانت منظور فرماتے ہوئے پانچ ہزار کی ضمانت کا آرڈر دے دیا۔ اور مُلزم اسی شام جیل سے باہر آ گیا جو دو کر دن لدھا رام کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرنے میرے مکان پر آیا۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے کہ ایک دن ریواڑی سے ریلوے پولیس کا ایک سب انسپکٹر آیا اور مجھ سے ایک نوٹس پر تعمیل کرا کے لے گیا کہ فلاں تاریخ کو مُلزم کو سیشن جج گوڑ گاؤں کی عدالت میں پیش کیا جائے میں مُلزم کے گھر گیا تو وہ اپنی ماں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا اور اس کی بیوی کھانا پکا رہی تھی۔ مُلزم اور اس کی ماں نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور وعدہ کیا کہ مُلزم مذکور کل وقتِ مقررہ پر گوڑ گانوں پہنچ جائے گا میں

احتیاطاً خود بھی گوڑگاؤں سیشن جج صاحب کی کورٹ میں چلا گیا تو وہاں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ ہندوستان کے قریباً ہر حصہ سے گواہان آئے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ جس ملزم کی مَیں نے ضمانت دی ہے اس نے چلتی گاڑی میں ڈاکہ ڈالا تھا اور ایک پولیس آفیسر کو لوٹا مگر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تو اس کے پاؤں پر ایسی چوٹ لگی کہ وہ بھاگنے میں ناکام رہا اور پکڑا گیا۔

عدالت کے چپڑاسی نے آواز لگائی تو ملزم مذکور غیر حاضر تھا مگر مَیں عدالت کے رُوبرو پیش ہوگیا۔ سردار فوجا سنگھ گل ایڈیشنل سیشن جج فرمانے لگے . . . آپ جانتے ہیں ملزم کے حاضر نہ ہونے کے باعث سرکار کو ان تمام گواہان کے اخراجات ادا کرنے میں ہزار ہا روپیہ دینا ہوگا . . . میری خاموشی پر عدالت نے اسی وقت ملزم کو مفرور قرار دے کر مجھ سے اس نوٹس کی تعمیل کرائی گئی کہ وجہ بیان کی جائے، کیوں نہ زرِ ضمانت آپ سے وصول کیا جائے . . . ؟

مَیں نے ملزم کو پیش کرنے کی اجازت چاہی اور تاریخ مل گئی۔ مگر ملزم نے اب کہاں ملنا تھا، اور مَیں اپنے وکیل مسٹر سوہن سنگھ کی معرفت تاریخ پر تاریخ لیتا رہا —— یہ وکیل صاحب میرے ساتھ دہلی سے گوڑگاؤں ہر پیشی پر جاتے اور آمد و رفت کے ٹیکسی اخراجات کے علاوہ معقول فیس بھی لیتے تھے، اور لدھا رام سے ملاقات ہوتی تو وہ محض زبانی ہمدردی کر کے چُپ ہو جاتا، اور مَیں نے سمجھ لیا کہ اب یہ ضمانت کی رقم ادا کرنی ہی ہوگی۔

اچانک لدھا رام ایک دن آیا اور کہنے لگا کہ . . . وہ اپنے ہاں شیراں والی ماتا رانی کا رت جگا کر رہا ہے، آپ بھی معہ اہل و عیال شرکت کیجیے . . . اُن دنوں میری والدہ صاحبہ بھی ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ رات کو مَیں اور میری بیوی دونوں لدھا رام کے گھر، جو اُن دنوں جھلمل کالونی میں تھا، پہنچے تو دیکھا لدھا رام کا ہر واقف کار اور دوست احباب معہ اہل و عیال وہاں موجود تھے۔ اور دلوی کا رت جگا اس شان سے ہونے لگا کہ جیسے ساکشات دیوی پرگٹ ہو گئی ہوں —— رات کے ایک بجے کے قریب جب اِنٹرول ہُوا اور جملہ حاضرین کو چائے وغیرہ پلائی جا رہی تھی۔

چونکہ مَیں زیادہ رات گئے تک جاگنے کا عادی نہیں ہوں، لہٰذا مَیں نے لدھا رام سے کہا کہ میرے لیٹنے کا انتظام ہو جائے تو جب تک انٹرول ہے مَیں ذرا کمر سیدھی کرلوں۔ وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گیا اور ایک پلنگ پر لٹا دیا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ انٹرول کے بعد ماتا کا گُن گان شروع ہو چکا تھا۔ میری آنکھ کھُلی تو مَیں مکان کے پچھواڑے پیشاب کرنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لدھا رام ہاتھ میں ڈنڈا لیے دس بارہ لڑکوں کو پیٹ رہا ہے۔ مَیں یہ سین دیکھ کر دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ لدھا رام ان لڑکوں کو پیٹتے ہوئے کہہ رہا تھا: حرام زادو! میرے ایک ہزار روپے کھُل گئے ہیں رت جگے پر —— اور تم ایک پیسہ بھی کما کے نہیں لائے ہو . . . لڑکے مار کھاتے ہوئے کہہ رہے تھے . . . اُستاد ہم کیا کریں، بائیس گھروں میں ہم گئے مگر ہر جگہ کوئی نہ کوئی جاگ رہا تھا۔ فلاں گھر میں لڑکی پڑھ رہی تھی۔ سرور صاحب کے گھر ان کی ماں نے گالیاں دیں کہ آدھی رات کو تم کون ہو جو دیواریں پھاند رہے ہو۔ پریم نرس کے گھر گئے تو وہاں پڑوسی جاگ پڑے یہ سب کچھ سُن کر میرا سانس اُوپر کا اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا —— اور مَیں بغیر پیشاب کیے ہی واپس آگیا اور بیوی کو اشارے سے بُلا کر سب ماجرا سُنایا کہ اس رت جگے میں بُلائے گئے سب حضرات کے گھروں

میں چوری کرنا مطلوب تھا ——— میری بیوی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مگر وہ کہنے لگیں کہ ۔ ۔ ۔ ارداس ہونے تک تو اب رہنا ہی ہوگا۔ ماتا رانی خود ہمارے گھروں کی حفاظت کریں گی۔

تڑکے جب ارداس ہونے لگی تو حاضرین اپنی توفیق کے مطابق نذرانہ پیش کرتے ہوئے ماتا رانی کے حضور میں سر جھکائے اور منتیں ماننے لگے کہ میں نے بھی سوا روپے کی حقیر رقم ماتا کے چرنوں میں رکھتے ہوئے دل ہی دل میں یہ منت مانگی کہ اگر ملزم مذکورہ پکڑا جائے تو میں بھی ماتا کا رت جگا کراؤں گا۔

صبح پانچ بجے پرشاد لے کر ہم اپنے گھر آگئے اور لحاف اوڑھ کر سو گئے ——— ساڑھے آٹھ بجے فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی تو بے دلی سے بستر سے اٹھ کر ریسیور اٹھایا تو وکیل صاحب کی آواز سنائی دی، فرما رہے تھے ۔ ۔ ۔ سرور صاحب مبارک ہو! آپ کا ملزم پکڑا گیا ہے اور اس وقت سرائے روح اللہ تھانے میں بند ہے ——— سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیر اعلیٰ پنجاب کے قتل کے سلسلے میں پولیس مختلف جگہوں پر بدمعاش لوگوں کو تلاش کر رہی تھی۔ محلہ پرتاپ باغ کے باہر ایک باغ میں یہ ملزم پکڑا گیا اور اس نے پولیس پر گولی بھی چلائی ۔ ۔ ۔ میں یہ خبر سنتے ہی سکوٹر لے کر سرائے روح اللہ تھانے پر گیا تو ملزم مذکور کو حوالات میں دیکھا اور پچھلے پاؤں آ کر کشمیری گیٹ جنرل پوسٹ آفس سے ریواڑی ریلوے پولیس کو ارجنٹ ٹیلی گرام کیا۔ اور پورے دس بجے عدالت میں حاضر ہو کر درخواست گزاری کی کہ ملزم مذکورہ سیشن جج گوڑگاؤں کی عدالت میں مطلوب ہے۔ یہ مفرور تھا اور میں اس کا ضمانتی ہوں، لہٰذا اسے ضمانت پر رہا نہ کیا جائے ۔ ۔ ۔ تب تک ریواڑی پولیس وغیرہ آ چکی تھی۔ اور ملزم جیل بھجوا دیا گیا۔

سردار فوجا سنگھ گل ایڈیشنل سیشن جج گوڑگاؤں نے بعد میں مجھے ایک سو روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔ اور ضمانت کا یہ قضیہ ختم ہوا۔

میں نے منت کے مطابق ماتا کا رت جگا کرایا۔ اور اب بھی جب کہیں ماتا کا رت جگا ہو رہا ہوتا ہے تو مجھے لدھارام کے یہاں کے رت جگے کی یاد آجاتی ہے اور میرا سر عزت و احترام کے ساتھ ماتا کے قدموں میں جھک جاتا ہے۔

دین پناہؒ

ضلع مظفر گڈھ (پاکستان) میں ایک قصبہ دائرہ دین پناہ ہے۔ جہاں حضرت "دین پناہؒ" کا مزار شریف ہے۔ ۱۹۴۷ء تک تونسہ شریف جانے کے لیے دو راستے تھے، ایک راستہ غازی گھاٹ دریائے سندھ کشتیوں کے پُل یا اسٹیمر سے عبور کر کے بذریعہ موٹر لاری ڈیرہ غازی خاں ہو کر اور دوسرا بذریعہ ریل کوٹ سلطان دائرہ دین پناہ کسی ایک ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر پیدل یا اُونٹ کی سواری سے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پہنچ کر بذریعہ کشتی دوسرے کنارے جا کر پھر پیدل یا اونٹ کی سواری سے تونسہ شریف پہنچتا۔

میرے والد صاحب ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں اسکول ماسٹر تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں یا کسی شادی غمی کے موقع پر ہمیں تونسہ شریف (ہمارا آبائی گاؤں ہیرو غربی تونسہ شریف سے تین میل کے فاصلہ پر تھا) جانا ہوتا تو عام طور پر کوٹ سلطان یا دائرہ دین پناہ ریلوے اسٹیشن پر جانا ہوتا ——— دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر بھی ایک قصبہ دائرہ دین پناہ آباد تھا اور اس قصبہ میں بھی حضرت دین پناہؒ صاحب کا مزار تھا۔ مشرقی کنارے سے کشتی میں بیٹھ کر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر پتن (کشتیوں کی رَوانگی اور آمد کی مقررہ جگہ) یہی قصبہ دائرہ دین پناہؒ تھا۔

دریائے سندھ کا مغربی کنارہ ضلع ڈیرہ غازی خان میں ہے۔ دو اضلاع میں ایک ہی نام کے دو قصبات اور دونوں جگہ ایک ہی بزرگ کا مزار اور دونوں مقامات پر ان مزارات پر جو بھی منّت مانی جائے وہی پوری ہو۔ پہنچنے میں یہ بات سمجھ میں آنا واقعی مشکل تھا کہ دو مقامات پر ایک ہی بزرگ کا مزار ——— ؟ اور لطف کی بات یہ کہ ہر مذہب و ملّت کے عوام ان مزارات پر حاضری دیتے اور منّتیں مانتے تھے۔ دونوں مقامات پر درگاہیں، فنِ تعمیر اور نقاشی کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ میرے والدین اور دوسرے رشتہ دار بھی مغربی کنارے والی درگاہ پر جاتے تھے اور ہر سال عُرس میں حصّہ لیتے ——— اور اپنی توفیق کے مطابق خدمت کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت دین پناہؒ کا انتقال ضلع مظفر گڑھ والے قصبہ دائرہ دین پناہ میں ہُوا تو مشرقی اور مغربی کنارے پر مقیم عوام میں جھگڑا ہُوا۔ دونوں فریق حضرت دین پناہ کو اپنے اپنے علاقہ میں دفنانا چاہتے تھے۔ جب کسی طور پر فیصلہ نہ ہُوا تو جھگڑے والوں نے دیکھا کہ حضرت کی میّت (جسدِ خاکی) موجود ہی نہیں۔ ہاں میّت کی جگہ پھولوں کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ لہٰذا دونوں فریقوں نے آنسو بہاتے ہوئے آدھے آدھے پھول بانٹ لیے اور دونوں مقامات پر پھولوں کو دفنا کر مزار تعمیر کر لیے۔ اپنے

والدین کے ساتھ مَیں بھی مغربی کنارے والے درگاہ دین پناہؒ کے مزار پر جاتا۔ اور اپنے دل کی بات درگاہ کے کسی ستون پر لکھ آتا۔ درگاہ کے ستونوں پر ہزارہا اصحاب کی دلی خواہشیں لکھی ہوتی تھیں۔ کچھ لوگ تو اپنا نام اور پتہ بھی لکھ دیتے تھے۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی جو اپنی دلی خواہش لکھنے کے بعد شکستہ خط میں دستخط کر دیتے۔ مگر یہ سو فی صد ٹھیک تھا کہ جو بھی دلی خواہش لکھی جاتی وہ پوری ہو ہی جاتی تھی۔ اس زمانے میں لوگ لاٹری یا معمہ کی رقم پانے یا بینک کو لوٹنے میں کامیابی کی دعائیں نہیں مانگا کرتے تھے، بلکہ روزگار کے حصول، روزگار میں آسودگی، صحت، بارش کے ہونے یا آفاتِ سماوی و بیماری وغیرہ سے چھٹکارا پانے کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ اور خدا کے فضل سے یہ سب دعائیں قبول بھی ہو جاتی تھیں ———

مَیں الجبرا اور جیومیٹری میں ہمیشہ کمزور رہا اور آٹھویں جماعت تک تو کسی نہ کسی طرح رعایتی طور پر ان مضامین میں پاس کر دیا جاتا رہا کیونکہ باقی مضامین میں مَیں اپنی جماعت میں سب سے اوّل رہتا تھا۔ اب آٹھویں جماعت کا امتحان بورڈ کا امتحان تھا جہاں کسی قسم کی سفارش یا رعایت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ورنیکلر فائنل کے امتحان میں ان دونوں مضامین کے پیپر اس قدر میرے کمزور ہوئے تھے کہ مَیں سو فیصد فیل ہوتا مگر مَیں لائل پور سے اپنے وطن گیا اور حضرت دین پناہ کے مزار کے ایک ستون پر لکھا کہ مَیں آٹھویں کے امتحان میں پاس ہو جاؤں۔ مَیں اتنا طویل سفر طے کر کے محض اس غرض سے آپ کے وہاں حاضری دینے آیا ہوں ——— کرنا خدا کا جب نتیجہ آؤٹ ہوا تو مَیں اپنے گھر والوں اپنے استادوں اور خود اپنے کیے ہوئے پیپرز کے خلافِ توقع پاس تھا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ ہر مذہب و ملت کے عوام کا جمگھٹا ان دونوں مزارات پر کیوں لگا رہتا ہے اور عرس کے موقع پر ہندو حضرات بالخصوص مزار پر چڑھاوے کیوں چڑھاتے ہیں۔

امتحان میں پاس ہونے کے باعث میرا اعتقاد اس قدر پختہ ہو گیا کہ مَیں اپنے دل ہی دل میں اس مزارِ شریف کا تصور کرتا رہتا اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ مَیں نے کسی بھی وقت اور کسی بھی مقام پر حضرت دین پناہؒ کی درگاہ کا تصور کیا اور اپنی دلی خواہش کا اظہار بھی دل ہی دل میں کر دیا اور خدا کا کرنا یہ ہوتا کہ مجھے کامیابی ہوتی۔ مگر خدا شاہد ہے کہ مَیں نے کوئی ایسی خواہش کبھی نہیں کی کہ جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرے۔

دریائے سندھ کا مغربی کنارہ ۸۰ ۴۰ فٹ اونچا تھا۔ برسات کے موسم میں جب دریائے سندھ پر طغیانی پر ہوتا تو پانی کی تیز و تند لہروں نے مغربی کنارے کو آہستہ آہستہ گرانا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دس بارہ سال میں دائرۂ دین پناہؒ کا قصبہ دریا بُرد ہو گیا۔ باشندگانِ دہ نے دو ایک فرلانگ کی دُوری پر نیا گاؤں بسا لیا۔ اب حالت یہ تھی کہ مزار شریف کے تین طرف تو دریا تھا، صرف ایک طرف سے اتنا راستہ تھا کہ لوگ مزار پر جا سکیں۔ مَیں بھی اس عجیب و غریب نظارے کو دیکھنے کے لیے لائل پور سے دائرہ دین پناہ آیا۔ دیکھا تو واقعی عجیب و غریب حالت تھی۔ دریائے سندھ کا پانی اب قریب چاروں طرف سے مزار کو گھیرے ہوئے تھا، صرف اتنی سی جگہ رہ گئی تھی کہ جس سے بمشکل ایک آدمی مزار تک جا سکے۔

ایک دن یہ خبر مشہور ہوئی کہ خادمین نے مزار شریف کی لحد سے صندوق نکال لیا ہے اور دائرہ دین پناہؒ کی

نئی بستی میں صندوق کو دفنا دیا گیا ہے۔ مگر اس کا کوئی عینی شاہد نہ تھا۔ صرف خادمینِ مزار کا ہی یہ کہنا تھا کہ رات کی خاموشی میں یہ کام کیا گیا ہے۔

اس کے کچھ دنوں بعد یہ حالت ہوگئی کہ مزار شریف کے اردگرد چاروں طرف دریا کا پانی تھا۔ یہ حالت قریباً تین چار سال تک رہی۔ گرمیوں کے موسم میں دریا کی طغیانی اپنے پورے جلال میں ہوتی اور مزار کی بنیاد سے زور آزمائی کرتی اور سردی کے موسم میں جب دریا کی چوڑائی دو تین فرلانگ رہ جاتی تو بھی پانی تیز رفتاری سے مزار سے ٹکراتا ہوا بہتا۔

درگاہ سے دلی لگاؤ رکھنے والوں کو یقین تھا کہ خادمینِ مزار جھوٹ کہتے ہیں کہ انھوں نے مزار شریف سے صندوق نکال لیا ہے اس لیے مجھ جیسے ہزاروں ہندو مسلمانوں کا یہ طریقہ رہا کہ دریا کے کنارے کھڑے ہوکر مزارِ شریف کو سلام کرلیا اور دور کھڑے کھڑے اپنا مدعائے دل بیان کر دیا۔

میں جب بھی وطن جاتا، ہفتہ عشرہ کے بعد واپس لائل پور آجاتا۔ مگر میرے دل کے تار اس مزار کی طرف رہتے ——— ایک رات کو میں نے دیکھا کہ خواب میں مزار شریف میری آنکھوں دیکھتے دریا برد ہوگیا ہے، میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، مگر واہمہ سمجھ کر پھر سونے کی کوشش کی مگر دل یقیں دلا رہا تھا کہ مزار شریف واقعی دریا برد ہوگیا ہے۔ صبح کو اپنے وطن خط لکھا کہ رات کو خواب میں مزار شریف کے دریا برد ہوجانے کے بارے میں دیکھا ہے ——— پانچ چھ دن کے بعد جواب آیا کہ ہاں جس رات کا تم نے ذکر کیا ہے اسی رات کو مزار شریف دریا برد ہوگیا اور کسی شخص نے بھی مزار کو دریا برد ہوتے نہیں دیکھا۔ صبح کو پتہ چلا کہ مزار دریا برد ہوگیا ہے۔

اس کے بعد کئی بار وطن جانے کا اتفاق ہوا مگر دل نے یہی کہا کہ خادمینِ مزار نے اپنی روزی کے لیے نیا مزار بنا لیا ہے۔ اصل مزار تو اب دریا کے مشرقی کنارے والے دائرہ دین پناہ میں ہی ہے۔ مگر اس وقت تک براستہ ڈیرہ غازی خاں تونسہ شریف پہنچنے کا راستہ کافی آسان ہوگیا تھا اور بذریعہ ریل ضلع مظفر گڑھ والے دائرہ دین پناہؒ میں . . . جانے کا اتفاق نہ ہوسکا۔ پھر ۴۷ء آگیا۔ مزارات تو اپنی جگہ رہے، مگر انسان بٹ گئے ——— اب بھی حضرت دین پناہؒ کے مزار شریف کی شکل و صورت ذہن میں قائم ہے اور وہ ستون جس پر میں نے اپنی دلی خواہش لکھی تھی کہ . . . میں مڈل کے امتحان میں پاس ہوجاؤں اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

بعض خاکے ——— پری چہرہ شاعرات کے بارے میں ہیں جن میں سے ایک دو کی جلوہ سامانیوں کی داستان سرور تونسوی نے مزے لے لے کر بیان کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متشاعر حضرات کی بھی خوب خوب پول کھولی ہے۔

ان خاکوں میں ——— جو سادگی، بے ساختگی اور بے باکی ہے اس نے بیان کو مستحکم کر دیا ہے۔

میری حقیر رائے ہے کہ ——— یہ خاکے سرور تونسوی کی صحافیانہ زندگی کا نچوڑ ہیں۔

کچھ مدت پہلے میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ ان کالموں کو کتابی صورت میں ضرور شائع ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ کتاب شائع ہو گئی تو ———

——— تجربات اور کرداروں کی بوقلمونی اور طرز بیان کی بے ساختگی اور بے خوفی کی وجہ سے سردار دیوان سنگھ مفتون کی ناقابلِ فراموش سے کم دلچسپ ثابت نہ ہو گی۔

——— گوپی چند نارنگ

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند

رامپور (یوپی) میں ایک بزرگ تھے جناب حنا صاحب، حجام اُن کا خط بنا رہا تھا کہ یکایک بے ساختہ جلالی انداز میں فرمانے لگے . . . اِلّا اللہ، اور ایسا کرتے ہوئے اُن کا بایاں ہاتھ برق رفتاری سے یوں آگے بڑھا جیسے کسی کو سہارا دے رہے ہوں۔

چنانچہ ان کے اس طرح ہلنے سے حجام اُسترے کو قابو میں نہ رکھ سکا، اور حنا میاں صاحب کے گال سے خون بہنے لگا۔ حجام کچھ دیر تک دم بخود رہا اور روئی کے پھاہے سے خون بہنے والی جگہ کو دبائے بیٹھا رہا۔ جب خون رُکا تو دست بستہ حنا میاں صاحب سے مخاطب ہوا کہ میاں یہ آپ کو کیا ہوا تھا . . . ؟

حنا میاں صاحب فرمانے لگے . . . وہ لڑکا جو یہاں آیا کرتا تھا نہ، آج کل وہ سفر میں ہے اور جس جہاز میں وہ سوار تھا اسے حادثہ پیش آگیا تھا جس سے وہ لڑکا ڈوب رہا تھا اس کی جان بچانے کے لیے اگر تھوڑا سا میرا خون بہہ گیا تو کیا ہوا . . . ؟

رامپور میں ہی ایک دوسرے بزرگ تھے بُھلّن میاں صاحب، لوگ اُن سے تعویذ لینے آتے اور یہ تعویذ دیتے ہوئے صرف یہی فرماتے کہ اسے اپنے مکان کی چھت میں اُلٹا دینا، اور خدا کا کرم یہ ہوتا کہ ہر تعویذ لینے والے کی مُراد پوری ہو جاتی ——— اکثر بدتمامش لوگ بُری خواہشات کی تکمیل کے لیے ان سے تعویذ لینے جاتے مگر بُھلّن میاں صاحب اس قسم کے حاجت مندوں کو صاف کہہ دیتے کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ کے نام کو بدنام نہ کرو۔ تعویذ لینے والے دِل ہی دِل میں شرمندہ ہو کر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے۔

جموں میں ایک بزرگ تھے جیون شاہ، جن کے بارے میں کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو، ان کا یہ معمول تھا کہ وہ حاجت مندوں سے کچھ نہ کچھ پڑھنے کو بنا دیتے اور خدا کا کرنا یہ ہوتا کہ ان حاجت مندوں کے کام ہو جاتے۔

ایک سو اکتالیس

ایک ہندو لڑکا کسی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ فرمانے لگے . . . بٹیا تو کلمۂ حق لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھا کر تیرا کام ہو جائے گا . . . لڑکے نے پورے یقین کے ساتھ جیون شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور خدا نے اس کی مراد چند دنوں میں ہی پوری کر دی۔

انہی جیون شاہ صاحب نے ایک مسلمان حاجت مند سے کہا . . . تم رام رام جپا کرو، تمہارا کام بہت جلد ہو جائے گا . . . یہ مسلمان حاجت مند جیون شاہ صاحب کے اس کافرانہ فرمان پر ناراض ہو گیا اور ان کے ہاں آنا بند کر دیا۔

کچھ دنوں بعد اس مسلمان کو خواب میں کچھ نظر آیا تو یہ جیون شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور جیون شاہ صاحب کا پھر وہی فرمانا تھا کہ . . . تم رام رام جپو گے تو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا، اس لیے تم پہلے اپنے دل کو صاف کرو۔ اور دل سے یہ خیال نکال دو کہ رام رام کہنا کفر ہے۔ یہ بھی خدا ہی کا دوسرا نام ہے اور اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تو پھر یہاں نہ آنا . . . اب مسلمان حاجت مند سے نہ رہا گیا اور اس نے خفگی کے انداز میں کہا کہ . . . آپ اچھے بزرگ ہیں کہ ایک مسلمان کو کافر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر جیون شاہ صاحب نہایت ملائمت سے کہنے لگے کہ . . . تم جانتے ہو کہ وہ ہندو لڑکا بہ آوازِ بلند کلمہ پڑھتا رہا اور خدا نے اس کی مراد گیارہ دنوں میں ہی پوری کر دی۔ وہ لڑکا حسبِ معمول مندر بھی جاتا رہا، اس کا نام بھی وہی رہا، مگر صرف میرے بتائے ہوئے وقت میں وہ گیارہ بار کلمہ پڑھ لیتا تھا تو کیا وہ ہندو نہیں رہا۔ اگر تم پانچوں وقت کی نماز پڑھتے رہو، روز قرآن خوانی بھی کرو، اللہ اللہ بھی کرو۔ اور اگر میرے بتائے ہوئے وقت میں تم صرف گیارہ مرتبہ رام رام کہہ دو گے تو کیا تم مسلمان نہیں رہو گے۔ یہ تمہیں کس نے بتا دیا اگر مسلمان رام رام کہے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ تم علی الاعلان ایسا کرو، خاموشی سے وقتِ مقررہ پر "[illegible]" (یعنی تم یہ الفاظ اپنے گلے سے نکالو مگر آواز سنائی نہ دے) کر لیا کرو تو بھی تمہارا کام ہو جائے گا، کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ خدا کا نام بہ آوازِ بلند ہی لیا جائے۔ آپ بغیر آواز نکالے بھی خدا کا نام لے سکتے ہیں . . . کچھ دنوں بعد یہ مسلمان جیون شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیدہ پُرنم سے عرض پرداز ہوا . . . بابا، میرا وہ کام ہو گیا ہے اور آپ نے مجھے اس حقیقت سے آشنا کیا کہ خدا کا نام بغیر آواز نکالے بھی لیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اب میں چلتے پھرتے اللہ کے نام کا ورد بغیر آواز نکالے کرتا رہتا ہوں۔ اور خدا قدم قدم پر میرا نگہبان ہے۔

بیگم شاہدہ نکہت پردہ نہیں کرتی ہیں۔ آج سے تیس اکتیس سال پہلے وہ محلہ میاں گنج دہلی میں رہتی تھیں ایک توان کا بوٹا سا قد اس پر بے پناہ حسن، بال کٹے ہوئے جو بڑے خوش نما انداز میں ایک ربن سے بندھے ہونے کے باوجود دیکھنے والوں کے دلوں پر سانپ کی طرح لہراتے تھے ——— اس وقت ان کی جوانی اور شباب کا یہ عالم تھا کہ جب وہ چلتی تھیں تو راہ چلتوں کے دلوں پر ہزاروں بجلیاں گراتی تھیں۔ جب وہ لبِ نازک وا کرتی تھیں تو پھول جھڑتے تھے۔ ان کے ایک اشارے پر محولہ شاہیں سے کھڑا جاتا تھا۔

ایک سو بیالیس

محلہ فیاض گنج خالص مسلمانوں کی آبادی ہے۔ ہر کہہ ومہ بیگم صاحبہ کے حسن وجمال کا والہ وشیدا تھا۔ مگر انگور کھٹے ہونے کے باعث اور تو کچھ نہیں کر سکتے تھے ——— لہٰذا یہ آڑ لی گئی کہ یہ بے پردہ خاتون محلے کی پردہ دار بیبیوں میں بے پردگی کے جراثیم پیدا کر رہی ہیں . . . لہٰذا اہل محلہ ان کے خلاف ہو گئے اور بیگم شاہدہ نکہت صاحبہ اور ان کے مبینہ بہنوئی کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ بنوا دیا گیا ——— الزام یہ رکھا گیا کہ ان دونوں نے اپنی نابالغ گھریلو خادمہ کو اغوا کر لیا ہے۔

پولیس میں کیس رجسٹرڈ ہوا ——— پھر عدالت میں چالان ہوا ——— سردار ڈھلوں ایس، ڈی، ایم کی عدالت میں مقدمہ چلتا رہا۔ جب فیصلے کی تاریخ کو ایک دن رہ گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیگم شاہدہ نکہت باقی صاحبہ سیاہ رنگ کے ہیلمٹ کا برقعہ اوڑھے میرے سوئی والان مکان پر تشریف لائیں۔ انھیں برقعے میں دیکھ کر عرض کیا کہ . . . آج چاند بادلوں کے نرغے میں کیسے آ گیا تو اپنی روایتی مسکراہٹ جس سے کلیوں کی مسکراہٹ بھی شرماتی تھی۔ کہنے لگیں . . . مولانا عبدالقدیر صاحب کے یہاں حاضری دینے آئی ہوں، وہ ابھی مکان پر تشریف نہیں رکھتے، لہٰذا آپ کے ہاں چلی آئی ہوں تاکہ جب تک وہ تشریف لائیں، اس وقت تک آپ کے ساتھ بات چیت کر لوں (مولانا عبدالقدیر صاحب بھی محلہ سوئی والان میں ہی مقیم تھے) میں نے ٹھنڈی لیتے ہوئے کہا کہ . . . حسن کے بادشاہ کو بارگاہِ ایمانی میں حاضر ہونے کی کیا ضرورت در پیش آ گئی۔ کہنے لگیں . . . آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کل مقدمہ کا حکم سنایا جانا ہے، لہٰذا مولانا عبدالقدیر صاحب سے دعا کرانے آئی ہوں کہ اللہ حق وانصاف کا ساتھ دے۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ سلام کیا اور انتہائی عاجزی و انکساری سے اپنا مطلب بیان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ . . . حضور میں پردہ نہیں کرتی، مگر آپ کے ڈر سے برقعہ اوڑھ کر آئی ہوں ——— مولانا بیگم صاحبہ کے سچ بولنے سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں تو اللہ کا ادنیٰ بندہ ہوں مجھ سے کیا ڈرنا، ڈرنا تو اللہ سے چاہیئے ——— مولانا نے دعا فرمائی اور کہا کہ جائیے انشاء اللہ تعالیٰ آپ عزت کے ساتھ بری قرار دی جائیں گی اور دوسرے دن جب کشمیری گیٹ کی کچہری میں سردار ڈھلوں نے اس مشہور مقدمہ کا فیصلہ سوا پانچ بجے سنایا تو واقعی خدا کے حکم سے بیگم صاحبہ باعزت طور پر بری قرار دی گئیں۔

حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی رح جن کا مزار شریف تونسہ ضلع ڈیرہ غازی خاں (پاکستان) میں ہے، کے حالاتِ زندگی میں بیان کیا گیا ہے کہ . . . آنحضرت مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے وضو فرما رہے تھے کہ معاً انھوں نے پانی سے بھرا ہوا لوٹا زور سے ہوا میں دے مارا۔ دوسرے وضو کرنے والے حضرات اور آس پاس کھڑے لوگوں نے خواجہ صاحب کو ایسا کرتے ہوئے تعجب سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش رہے۔

دوسرے دن ایک بڑھیا خواجہ صاحب کے ہاں حاضر ہوئی۔ اور رو رو کر عرض کرنے لگی۔

حضور کل شام کو میں اور میرا جوان بیٹا اپنے گاؤں جا رہے تھے کہ جنگل میں ایک شیر ہم پر جھپٹا اور میرے بیٹے کو لقمۂ اجل بنانے ہی والا تھا کہ آپ کا وضو والا لوٹا جس سے میں روزانہ آپ کو وضو کرتے دیکھتی ہوں، شیر کی آنکھ پر اس زور سے لگا کہ وہ سٹپٹا کر بھاگ گیا اور ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے خیریت سے گھر پہنچے ——— اب میں آپ کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بیٹے کی جان بچائی۔

بڑھیا کی یہ رام کتھا سنتے ہی آس پاس کے حضرات سمجھ گئے کہ کل خواجہ صاحب نے وضو کرتے ہوئے لوٹا کیوں دے مارا تھا۔

"مجھے احساس ہے کہ میں واقعات کی ترتیب میں بہکا ہوں۔ لیکن کہاں تک غلط بہک سکتا ہوں میں نے جہاں اور جس نشیب سے سفر شروع کیا ہے وہ ایسا تھا کہ علم و ادب کے قافلے اس سے بہت آگے جا چکے تھے۔"

—— احسان دانش

جہانِ دانش

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

مندر سے کلیسا تک

۷ جون ۱۹۶۳ء کی صبح کو فتح گڑھ (یوپی) کے مندر کی سیڑھیوں پر ایک نوزائیدہ بچّی اس دُنیا میں اپنی آمد کا اعلان رو رو کر کر رہی تھی۔ اور اُس سربستہ راز کا انکشاف بھی جس کے باعث اس کا وجود اس دُنیا میں ظہور پذیر ہوا ——

مرد، عورتیں، بچے سب اس روتی ہوئی بچّی کو دیکھ رہے تھے اور اس کنواری یا مجبور ماں پر لعنتوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ جس نے اس بچّی کو جنم دے کر مندر کی سیڑھیوں پر ڈال دیا تھا۔ بچّی کے رونے اور دیکھنے والوں کی چہ میگوئیوں سے بظاہر بے نیاز بھگوان جو اس لاوارث یا دوسرے الفاظ میں ناجائز بچّی کے بھی بھگوان تھے اپنے مندر کی سیڑھیوں پر پناہ لینے والی اس بچّی کو ایک روایتی اور قابل لڑکی کے روپ میں اس دُنیا والوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ اُن کے نزدیک اُن کا ہر بندہ خواہ وہ اعلیٰ خاندان کا ہو یا معمولی خاندان کا ہندو ہو یا مسلم اُن کے لیے سب برابر ہیں اور ہر ذی رُوح انسان اپنے اعمال سے ہی پرکھا جائے گا۔ خواہ وہ جائز اولاد ہو یا ناجائز۔

بچّی کو دیکھنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بچّی کی ماں کس مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر مندر کی سیڑھیوں پر بچّی کا پایا جانا کسی حد تک اس بات کی دلیل تھا کہ بچّی کی ماں ہندو ہوگی۔ مگر بھگوان کے ماننے والے ہندوؤں میں کوئی بھی آگے بڑھ کر اس لاوارث بچّی کو اپنانے کو تیار نہ تھا۔

مگر بھگوان جو سب کے مالک ہیں، وہ اس بچّی کے بھی مالک تھے۔ لہٰذا فتح گڑھ میں محکمۂ ریل کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر سی، رائے آگے بڑھے اور بچّی کو اُٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور کچھ دیر بعد عدالت میں جا کر بچّی کو پیش کر کے اسے باقاعدہ گود لے لیا۔

مسٹر سی، رائے حضرت مسیح کے مقلد تھے، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر عیسائی عورت حضرت مسیح کی بھیڑ ہو سارے شہر میں مسٹر سی رائے کے اس نیک اقدام پر واہ واہ ہو رہی تھی —— مگر سی، رائے کا گھر جنگ کا میدان بنا ہوا تھا۔ مسٹر سی، رائے کی بیوی کا کہنا تھا کہ . . . اُسے یہ بچّی ایک آنکھ نہیں بھاتی . . . لہٰذا اسے وہ کسی قیمت پر بھی اپنے گھر میں نہیں رہنے دیں گی —— جب بیوی کا احتجاج مسٹر رائے کے لیے سوہانِ رُوح بن کر رہ گیا تو مسٹر رائے نے چپکے سے اس بچّی کو ریل کے فرسٹ کلاس ڈبہ میں ایک برتھ پر لٹا دیا، اور جو بچّی اپنی ماں کے ہاتھوں مندر کی سیڑھیوں پر بھگوان کی پناہ میں آئی تھی اب ایک انسان کے ہاتھوں ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں پھر بھگوان کے سپرد کر دی گئی۔ جب یہ ریل گاڑی اندور اسٹیشن پر پہنچی تو منسا رام قلی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے فوراً ریلوے پولیس کو اطلاع دی اور ریلوے پولس

کے سب انسپکٹر مسٹر ہنری ولیم ہُما میرٹھی نے بچّی کو اپنی تحویل میں لے لیا ——— بچّی کے گلے میں بندھی ہوئی ایک چٹ پر لکھا تھا۔ ۔ ۔ "الکا مناکشی رائے" ۔ ۔ ۔ ایک عیسائی نے اپنی بیوی کے ڈر سے بچّی کو پھر سے لاوارث بنا دیا تھا، مگر قدرت نے پھر ایک دوسرے عیسائی کے دِل میں رحم کی لہروں کو موجزن کیا - اور یہ عیسائی ہنری ولیم میرٹھی اس بچّی کو اپنے گھر لے گیا، مگر قدرت نے اب کی مرتبہ یہ انتظام کر دیا کہ یہ بچّی پھر سے لاوارث نہ بن جائے۔

ہنری ولیم ہُما میرٹھی کی بیوی اپنی ساس سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ چکی تھی - اور اس کی واپسی کا کوئی امکان بھی نہ تھا - ہنری کی والدہ نے اور خود ہنری ولیم نے بچّی کو خدا کی رحمت سمجھ کر اس کی پرورش شروع کر دی - ابھی الکا میناکشی رائے پانچ چھ سال کی ہوئی تھی کہ اندور ریلوے اسٹیشن کا دہی قلی نسارام جس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ خود تپدق کا مریض تھا، جب نسارام کو یہ نظر آنے لگا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو وہ ایک دن مقامی عدالت میں حاضر ہوا اور درخواست دی کہ میرا آخری وقت قریب ہے اس لیے میں حلفیہ تصدیق کرانا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد میری خورد سال جڑواں بچّیاں مسٹر ہنری ولیم ہُما میرٹھی کی تحویل میں دے دی جائیں ——— کسی ہندو کو یہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا کہ وہ اس بات پر اعتراض کرے کہ ہنری ولیم نے ان جڑواں بچّیوں کو عیسائی بنا لیا ہے۔

یہ حلفیہ بیان تصدیق کرانے کے دو چار دنوں کے بعد نسارام قلی چل بسا اور اس کی دونوں لاوارث جڑواں بچّیاں بھی مسٹر ہنری ولیم کے گھر آ گئیں، جن کی پرورش میں الکا میناکشی رائے بھی ہاتھ بٹانے لگی - مسٹر ہنری ولیم ہُما میرٹھی نے ان تینوں بچّیوں کی پرورش جس طرح کی اس کے پیشِ نظر یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہُما صاحب نے اپنے لیے جنّت میں جگہ ریزرو کروالی ہے ——— کیوں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا ہُما ایسے شخص کے لیے جنّت کے دروازے ہمیشہ کھُلے نہ رکھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دُنیاوی طور پر ولیم ہنری ہُما صاحب پر کئی آفتیں نازل ہوئیں - اور تو اور انھیں ایک فرضی معاملے میں ملازمت سے کئی سال تک معطل رکھا گیا، اور اب بحال ہونے کے باوجود انھیں صرف معطلی کے زمانے والی تنخواہ ہی مِل رہی ہے جو کہ اصل تنخواہ کا کچھ حصّہ ہوتی ہے - مگر وہ خدا کے بھروسے پر دُنیا کا ہر ظلم انتہائی صبر اور خاموشی سے سہہ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ جب خدا کا حکم ہوگا تو اُس کے وہ بندے جو ان کے خلاف ناانصافی کا ارتکاب کیے ہوئے ہیں، از خود نادم ہوں گے ——— اور ہُما کا حق اسے مِلے گا۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے ہوم منسٹر عالی جناب گیانی ذیل سنگھ[1] سے مؤدبانہ التماس ہے کہ وہ ہُما صاحب کے کیس پر دھیان دینے کے لیے مدھیہ پردیش کے آئی جی کو حکم دیں - کیونکہ یہ ناممکنات میں سے نہیں ہے کہ ہُما صاحب کے ساتھ ناانصافی کرنے والے کسی بھی وقت خدا کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھیں ——— جس شخص نے لاوارث بچّیوں کی پرورش، تعلیم اور ان کی زندگی بنانے میں اپنی جوانی، گھر یہاں تک کہ اپنا سب کچھ قربان کر دیا - اس کے ساتھ ناانصافی خدا کے نزدیک ایک

---

[1] موجودہ صدر جمہوریۂ ہند۔

مجھے آپ

اچھی لگتی ہیں

بدترین فعل ہے۔ کیا غضب ہے کہ اس گرانی کے زمانے میں ہُما صاحب کو دو سو روپیہ کے قریب تنخواہ ملتی ہے
نسارام قلی کی دونوں بچیاں جواب DORRY WILLIAMS & MERRY WILLIAMS
کے ناموں سے چودہ سال کی عمر میں رتلام مشن سیکنڈری اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں اور ہوسٹل میں رہتی ہیں۔ یہ دونوں بچیاں اب نانویں کلاس میں پڑھ رہی ہیں۔ دونوں کی عادات ایک سی ہیں۔ دونوں ایک جیسے ہی کپڑے پہنتی ہیں۔ دونوں اکٹھی بیمار ہوتی ہیں۔ اب ان دونوں بچیوں کی تعلیم کے جملہ اخراجات جرمن اسکالرشپ سے پورے کیے جا رہے ہیں۔

مس الکامینا کشی رائے کرسچین کالج اندور میں بی اے فائنل کی طالبہ ہے۔ ۷ر جون ۱۹۸۱ء کو اس نے عمر کے اٹھارہ سال پورے کر لیے ہیں۔

الکامینا کشی رائے راقم الحروف کو اپنا ہمدرد انکل سمجھتی ہے اور جب بھی وہ ہُما صاحب کے ساتھ دلّی آتی ہے تو ایک حقیقی بیٹی کی حیثیت سے غریب خانہ پر آتی ہے۔ اور قیامِ دلّی کے دوران اکثر وقت ہمارے ساتھ ہی گزارتی ہے۔

مسٹر رائے کچھ دنوں پہلے اجمیر کے ریلوے کے بہت بڑے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مسز رائے اندور میں ہی کسی اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہیں اور انھوں نے کبھی الکامینا کشی رائے کو دیکھنے تک کی تکلیف گوارہ نہیں کی۔

الکامینا کشی رائے کو ان سب باتوں کا احساس ہے۔ گو اُسے یہ سب کچھ معلوم ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ مگر اُسے کسی سے بھی شکایت نہیں ہے۔ وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہے کہ اسے ہنری ولیم جیسا مُحسن ملا جو اس کا باپ بھی ہے اور ماں بھی۔

ولیم ہُما کو دیکھتا ہوں تو دل یہ گواہی دیتا ہے کہ جب تک ہنری ولیم ایسے لوگ باقی ہیں اُس وقت تک یہ دُنیا خُدا کی خُدائی کو ماننے پر مجبور رہے گی۔

■■

زمیں کھا گئی...

ساحرلدھیانوی

حصولِ آزادی کی جدّوجہد میں برصغیر کا نوجوان طبقہ برطانوی استعمار کے خلاف برسرِپیکار تھا ملک میں کئی انقلابی اور سیاسی تحریکیں نئے نئے طریقوں سے چل رہی تھیں۔ کانگریس اور کچھ دیگر تنظیمیں آئینی اور قانونی حدود میں رہ کر آزادیِ وطن کے لیے سرگرداں تھیں مسلم لیگ انگریز کی سرپرستی میں کانگریس کی مخالفت اور مذہبی جنون پھیلانے میں اپنا رول نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی۔

مگر نوجوان طبقہ بلاتخصیص مذہب وملّت (عیسائیوں کے علاوہ) 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ ان کی خفیہ تنظیمیں بھی تھیں۔ اور دہشت پسندی کے گروہ بھی تھے۔ کاکوری کا مقدمہ بھی انھیں دنوں میں ہوا۔ جس میں اشفاق اللہ خاں:

سَرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

گاتا ہُوا پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا ——— بھگت سنگھ، راج گرو اور دت کا مقدمہ اور پھانسی کا قصّہ دل دوز بھی انہی ایّام کی یاد گار ہے۔

ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی نئی نئی وجود میں آئی تھی اس کے کارکن بھی زیرِزمین سرگرمیوں میں مصروف تھے، ٹریڈ یونینیں بھی بن رہی تھیں۔ لاہور، امرتسر، دہلی، کلکتہ اور بمبئی ان سرگرمیوں کے مرکز تھے، ساحرلدھیانوی اس پارٹی کے ممبر تھے اور وہ اپنے داخلی حالات کی بنا پر آمادۂ بغاوت رہتے تھے۔ آغا شورش کاشمیری اس دَور کا دوسرا ابوالکلام آزاد اور ساحر رومانی اور انقلابی شاعر دونوں اچھے دوست تھے اور دونوں ہی حصولِ آزادی کی جملہ تحریکوں سے متاثر تھے۔ مگر دونوں کے طریقِ عمل کا راستہ الگ الگ تھا۔

آغا شورش کاشمیری کے چھوٹے بھائی پورش کاشمیری اس گروپ میں شامل تھے اور وہ بھی آزادی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ مَیں اُن دنوں جالندھر میں رسالہ 'ایجوکیشنل گزٹ' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ 'ادبِ لطیف' کے دفتر میں عموماً ساحرلدھیانوی سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری ان دنوں پروان چڑھ رہی تھی۔ اور انھوں نے دُنیائے شاعری میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔

یورش کاشمیری جتنا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس سے بھی زیادہ خوبصورت آزادی کی دیوی اُس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔ چنانچہ لاہور میں حکومت کے خلاف ایک زبردست جلوس نکلا۔ جس میں یورش نے بھی حصہ لیا۔ پولیس نے اس جلوس پر شدید لاٹھی چارج کیا۔ یورش جو جلوس میں سب سے آگے تھا، پولیس کی لاٹھیوں کا شکار ہوگیا اور آزادی کے اس جانباز سپاہی نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

اس وقت پنجاب کے گورنر میکڈانلڈ اور وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات ٹوانہ تھے۔ یورش کی جواں مرگی پر ایک نوحہ لکھا جو آج بھی ساحر کی انقلابی شاعری کا آئینہ دار ہے۔ آیئے آپ بھی اس نوحہ کو اُس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھیے :

اک دیا اور بجھا

اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی
شب کی سنگین سیاہی کو مبارک کہہ دو
جاؤ بجھتی ہوئی آنکھوں کے سسکتے اشکو
جاؤ فرعون کی شاہی کو مبارک کہہ دو
جاؤ جمہور کے روندے ہوئے بے بس جذبو
جاؤ پگھلا ہوا تپتا ہوا لاوا بن جاؤ
جاؤ معصوم جنازے کے فسردہ پھولو
جاؤ قانون کے ایوان پہ شعلے برساؤ
جاؤ اے وقت کے تاریک بھیانک سایو
میکڈ انلڈ سے کہہ دو کوئی زحمت نہ کرے
جاؤ اس قتل کے بالواسطہ مجرم سے کہو
اب کوئی وعدۂ تکلیف مروّت نہ کرے
جاؤ پنجاب کی سرکار سے جا کر کہہ دو
سینکڑوں سینوں میں چنگاریاں رخشندہ ہیں
موت ایوانِ وزارت پہ کھڑی ہنستی ہے
جاؤ اور خضر[1] سے کہدو ابھی ہم زندہ ہیں

یہ نظم اُس وقت پورے برصغیر میں مشہور ہوگئی تھی۔ اور یورش کا یہ مرثیہ نوجوانوں کا ترانہ بن گیا تھا۔ آج بھی ساحر

---

[1] خضر حیات ٹوانہ، وزیر اعلیٰ پنجاب۔

کی یہ نظم اُن کی مشہور نظموں میں سرِ فہرست ہے۔ مگر آج کا نوجوان تو کیا اُدھیڑ عمر کا اُردو داں بھی یہ نہیں جانتا کہ یہ نظم یورش کا شمیری کا مرثیہ ہے۔

آج نہ تو شورش کاشمیری اور نہ ان کا یارِ غار ساحر لدھیانوی اس دُنیا میں ہیں اور نہ مظلوم یورش کاشمیری ——— ظالم میکڈانلڈ بھی اپنے مظالم کا حساب دے چکا ہوگا اور انگریز کا وفادار ملک خضر حیات ٹوانہ بھی حشر کے روز جواب دہ ہوگا۔ مگر ساحر کی یہ نظم اب بھی آزادی پر قربان ہونے والے نوجوان یورش کاشمیری کا سرِ افتخار بلند کیے ہوئے ہے۔ اور ساحر بھی اپنی ایسی نظموں کے باعث امر رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساحر نے اپنے گیتوں سے مظلوم انسانیت کے اس گروہ کی حمایت کی جس پر مغربی طاقتوں کی گرفت تھی، مگر انھوں نے اُن لوگوں کو نظر انداز کر دیا جن پر اشتراکی حکومتوں نے ظلم روا رکھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ساحر اُردو کے وہ باکمال شاعر تھے جنھوں نے اشتراکیت کی تبلیغ کے لیے اُردو زبان کو اپنا وسیلہ بنایا۔

ساحر نے رُومانی اور انقلابی شاعری کی، وہ آزادی کا متوالا تھا اور پرورشِ لوح وقلم کرتا رہا۔ مگر ساحر مارکسزم اور اشتراکیت سے متاثر تھا اور یہی وجہ ہے کہ ساحر اپنی زندگی کے آخری حصہ میں مایوس ہوگئے تھے . . . رہے نام اللہ کا۔

محمد رفیع

محمد رفیع صاحب کے انتقال کے بعد بالتخصیص مذہب وملت جو سوگ منایا گیا ہے وہ عوام کی دِلی عقیدت کا ایک ایسا اظہارِ عقیدت ہے جسے کوئی بھی مذہبی جذبہ زہر آلود نہیں کر سکا۔ ہر زبان کے اخبارات اور رسائل نے جس ڈھنگ سے مسلسل دو دو بلکہ تین تین اشاعتوں میں اس عظیم موسیقار کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ تو شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر بھی پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کیوں کہ نہرو کی نسبت رفیع کی موت نے ان اخبارات ورسائل کے مالکان کی جھولیاں بھر دیں ——— مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کچھ مسلم جرائد ورسائل نے اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کا کمال رفیع صاحب کے انتقال پر اس قدر بے مثال دِلی سوگ منائے جانے کے باوجود دکھانا شروع کر دیا ہے۔ اور بغیر کسی وجہ سے یہ لکھا جا رہا ہے کہ ریڈیو اور دُور درشن نے اس سلسلے میں فراخدلی سے کام نہیں لیا۔ اور کچھ ایسے الزامات بھی لگائے ہیں کہ محمد رفیع کی وطن پرستی پر شک کیا جانے لگا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

جہاں تک ریڈیو اور دُور درشن والوں کا معاملہ ہے اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُن پر یہ بہتان محض کسی ذاتی پرخاش کے باعث ہی لگایا گیا ہے۔ ورنہ ان دونوں اداروں نے اپنی بساط بھر اس سلسلے میں پورا حق ادا کیا ہے، یہ کہنا کہ خصوصی پروگرام میں رفیع کے گائے ہوئے جو گانے پیش کیے گئے اُن سے بہتر گانے اس قدر مخصوص وقت میں پیش کرنا مشکل تھا، بالکل بجا ہے۔

موقر رسالہ 'فلمی ستارے' کا 'رفیع نمبر' ہمارے سامنے ہے۔ معاصر نے دعویٰ فرمایا ہے کہ وہ اس خاص نمبر میں محمد رفیع کے بارے میں صحیح انکشافات کر رہے ہیں۔ مگر معاصر مذکور نے رفیع صاحب کے ساتھ

عقیدت کے طوفان میں یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ رفیع کے بارے میں نہ صرف ایک واقعہ ہی بالکل غلط شائع کر رہے ہیں بلکہ اس واقعہ سے رفیع کی توہین کی گئی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ:

. . . مہاتما گاندھی کا قتل ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہوا ——— "سنو سنو اے دنیا والو باپو کی یہ امر کہانی" کا گانا جناب راجندر کرشن نے ۱۹۴۸ء میں ہی لکھا اور یہ گانا اپنی شہرت کے لحاظ سے آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ ۱۹۴۸ء میں رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ گانا رفیع کی شہرت کو بھی نصف النہار تک لے گیا۔

اب آپ "فلمی ستارے" کے رفیع نمبر کے صفحہ ۴۹ کالم ۲ کی یہ عبارت پڑھیے:

. . . جب دیش آزاد ہوا اور لال قلعہ پر جشن آزادی کا اہتمام ہوا جس میں نہرو بھی موجود تھے۔ اپنی دلی خواہش (نہرو جی کو قریب سے دیکھنے اور ان کے سامنے گانے کی خواہش) کو انجام دینے کی حسرت لیے رفیع چند مشہور گلوکاروں کے ہمراہ اس پروگرام میں پہنچنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن انھیں گانے کا موقع دینے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ ظاہر ہے ایسا اس لیے ہوا کہ اس وقت رفیع کا کوئی خاص نام و مقام نہیں ہوا تھا لیکن رفیع نے ہمت نہیں ہاری اور ایک اعلیٰ افسر سے گزارش کی۔ افسر نے کہا، اچھا گاؤ مگر یاد رکھو تین منٹ سے ایک سیکنڈ بھی زیادہ مت گانا۔

اس تحریر میں رفیع کی سہ گونہ توہین کی گئی ہے۔ پہلی یوں کہ وہ بن بلائے چند مشہور گلوکاروں کے ہمراہ اس پروگرام میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اور دوسری یہ کہ اس وقت رفیع کا نام اور مقام ہی پیدا نہ تھا حالانکہ اس وقت رفیع باپو کی امر کہانی گا کر نہ صرف اپنا نام اور مقام ہی پیدا کر چکا تھا، بلکہ شہرت کی بلندی پر ایک ہی اڑان سے پہنچ چکا تھا۔ اور تیسری یہ کہ انھیں اس محفل میں کوئی گانے کا موقع دینے کو تیار نہ تھا اور انھیں ایک افسر سے گانا سنانے کے لیے التجا کرنی پڑی۔

راقم الحروف پاکستان سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچا اور پھر یہیں بس گیا۔ آپ ملک بھر کے کسی بھی اخبار میں یہ نہیں دکھا سکتے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء یا ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو لال قلعہ میں جشنِ آزادی منایا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اوّلین ری پبلک ڈے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء ہے۔ چنانچہ ۴، ۵ اور ۶ فروری کو لال قلعہ دہلی میں جشنِ جمہوریت منایا گیا۔ ۱۵ اگست کو راشٹرپتی بھون میں راشٹرپتی کی طرف سے جشنِ آزادی کے سلسلے میں ہر سال ایٹ ہوم دیا جاتا ہے۔

اوّلین جشنِ جمہوریت میں مرحوم محمد رفیع اور مکیش دونوں مدعو تھے اور اب اس جشن کی روداد جو راقم الحروف نے لکھی اور اخبار "ریاست" کے شمارہ ۱۳ فروری میں شائع ہوئی کا وہ حصہ ملاحظہ فرمائیے جس میں جناب محمد رفیع کا ذکر ہے۔

. . . اب ہندوستان کے مشہور پلے بیک سنگر "محمد رفیع" جنھوں نے باپو کی امر کہانی گائی ہے، اسٹیج پر تشریف لائے ہیں اور حاضرین ہیں کہ کرسیوں سے اٹھ اٹھ کر اس فلمی موسیقار کو دیکھ رہے ہیں۔ محمد رفیع کو بھی حاضرین کی خواہش پر مکیش کی طرح کرسی پر

بٹھا کر گوایا جا رہا ہے۔

دو برس کی آزادی کا سب تہوار مناؤ
نگر نگر اور ڈگر ڈگر لہراؤ ترنگا پیارا

گیت عجب سماں پیدا کر رہا ہے۔ جس قدر چیئرز اس گانے پر دیے گئے ہیں شاید ہی کسی گانے پر دیے گئے ہیں۔ گیت ختم ہونے پر جب رفیع جانے لگے تو حاضرین نے شور برپا کر دیا کہ ہم رفیع سے ایک گیت اور سنیں گے۔ منتظمین کو حاضرین کی خواہش کے سامنے جھکنا پڑا اور رفیع نے مدھ بھری آواز میں یہ گیت :

آزاد ہوا آج کے دن دیش ہمارا
اس واسطے ہے پندرہ اگست ہم کو پیارا

گا کر خوب داد حاصل کی۔

رفیع نمبر میں اس سلسلے میں اور بھی کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ اس بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ وہ یہی موقع تھا کہ رفیع نے پہلی بار پنڈت نہرو کی موجودگی میں گایا اور اسی موقع پر نہرو نے انھیں گلے لگایا اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب شنکر پرشاد صاحب آئی، سی، ایس جو اس وقت چیف کمشنر تھے۔ اس جشن کے جملہ انتظامات ان دونوں حضرات کے رہین منت تھے۔ ان حضرات سے تصدیق کی جا سکتی ہے کہ رفیع باقاعدہ دعوت سے اس جشن میں شریک ہوئے اور انھوں نے پہلی بار نہرو جی کے سامنے "ترنگا لہراؤ" گایا۔

پہلو میں اُٹھ رہی ہے
رہ رہ کے ہوک سی کیا

مَیں ۱۹۲۵ء میں چک نمبر ۲۶- ہرگوبند پور ضلع لائل پور پاکستان میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُن دنوں ہندو مسلمانوں میں آج کل کی طرح محض دکھاوے کی ہی محبت و خلوص نہ تھا۔ بلکہ دلی خلوص تھا اور ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونا ضروری فرض سمجھا جاتا تھا۔ میرا گاؤں اسکول سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا اس لیے رومال میں دیسی گھی سے پکے پراٹھے اور آلو گوبھی وغیرہ کی سبزی ساتھ لے جانا ہر روز کا معمول تھا۔ اسکول کے برآمدے میں بیرونی طالب علموں نے اپنا اپنا کیل ٹھونک رکھا تھا جس پر کھانے والے رومال کو لٹکا دیا جاتا اور دوپہر کی آدھی چھٹی کے وقت ہر کوئی اپنی اپنی روٹی کا رومال اُتارتا اور اسکول کے احاطے میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ان دنوں اگر کسی مسلمان لڑکے نے ہندو لڑکے کی روٹی کے رُومال کو ہاتھ لگا دیا تو وہ روٹی بھٹ جاتی تھی اور وہ روٹی یا تو ہاتھ لگانے والے مسلمان لڑکے کو ہی دے دی جاتی یا کتّے کو ڈال دی جاتی۔ مگر چھوت چھات کی اس شدّت کے باوجود ہندو مسلمان سگے بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ عزیز احمد، نور محمد اور کئی مسلمان لڑکے بھی میرے ہم جماعت تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ میری روٹی ہر روز ہی تر مال ہوتی ہے۔ اس لیے اگر آج عزیز احمد نے بھولے پن سے میری روٹی کو ہاتھ لگا دیا تو دوسرے دن نور محمد نے اور دو ایک دن چھوڑ کر پھر سراج احمد نے یہی حرکت کر دی جس سے ہفتہ کے چھ دنوں میں عام طور پر تین یا چار دن مجھے دوپہر کا کھانا نصیب نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر میرے گھر والوں تک پہنچی تو میرے والد صاحب نے جو خود چک نمبر ۴۹ میں پرائمری اسکول کے اوّل مُدرّس تھے۔ میرے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میرے والد صاحب کا رقعہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پڑھا تو مجھ سے کہا گیا کہ اپنی روٹی کا رُومال انکی الماری میں رکھ دوں۔ جب آدھی چھٹی کی گھنٹی بجی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ پانچویں جماعت کے سارے لڑکے اُن کے پاس آجائیں اور اپنی اپنی روٹی کا رُومال بھی لیتے آئیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک چبوترے پر دری بچھا کر بیٹھتے تھے۔ اور طالب علم کمرے کے فرش پر بچھے ٹاٹ پر بیٹھتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے حکم دیا کہ ان کی نشست گاہ کے پاس بچھے ہوئے ٹاٹ پر سب بیٹھ جائیں۔ اتنے میں اسکول کا چپراسی ہیڈ ماسٹر صاحب کا کھانا بھی لے آیا۔ مَیں نے بھی اپنا رومال نکالا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا۔ ودّیا پربکاش کھڑے ہو جاؤ۔ مَیں نے سمجھا کہ شاید کھانے کی بجائے رُول ہاتھ کی ہتھیلی پر کھانے پڑیں گے۔ مگر انھوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمانا شروع کیا کہ دیکھو تمہارے بھی دو ہاتھ ہیں۔ اور تمہارے مسلمان ساتھیوں کے بھی دو ہاتھ ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم میں اور مسلمان لڑکوں میں کیا فرق ہے۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اتنے میں اُنھوں نے عزیز احمد سے کہا کہ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کھانے کو چھوئے وہ ڈرتے ہوئے اور پیچھے ہٹنے لگا۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے تلخی سے کہا کہ تھالی کو ہاتھ لگاؤ۔ عزیز احمد نے خوف زدہ حالت میں کانپتے کانپتے تھالی کو

ہاتھ لگایا۔ پھر فرمایا کہ روٹیوں کو بھی ہاتھ لگاؤ۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ تو مجھے کہنے لگے دریا پر کاش کیا تھالی کی رنگت بدل گئی ہے یا روٹی میں زہر کا اثر آگیا ہے میں اب بھی چُپ رہا تو انھوں نے عزیز احمد کا ہاتھ لگی روٹیوں کو کھانا شروع کر دیا۔ عزیز احمد اور دوسرے مسلمان لڑکوں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ تم عزیز احمد اور دوسرے تمام مسلمان ہم جماعت لڑکوں کی روٹیوں کو ہاتھ لگاؤ۔ میں نے ایسا کیا تو فرمانے لگے اب بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ لگانے سے ان مسلمانوں کی روٹیوں کی رنگت بدل گئی ہے یا یہ زیادہ پوتر ہو گئی ہیں۔ میں خاموش تھا حکم ہوا کہ عزیز احمد اور سارے مسلمان ہم جماعت لڑکوں سے کہو کہ وہ تمہاری روٹی سے ایک ایک لقمہ توڑ کر تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلائیں، میں نے کچھ ہچکچاہٹ کی تو انھوں نے مسلمان طلبار سے کہا کہ باری باری اُن کی تھالی میں سے ایک ایک لقمہ اُٹھا کر انھیں کھلائیں۔ مسلمان طلبار کے لیے یہ ایک نئی بلکہ اچنبھے کی بات تھی۔ انھوں نے بھی حکم کی بھی تعمیل کی تو ہیڈ ماسٹر مجھ سے مخاطب ہوئے کہ بتاؤ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اب میں اس قدر نادم ہو چکا تھا کہ چھوت چھات کا بھوت بھی مجھے چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا تھا۔ اور میں نے اپنے مسلمان ہم جماعت طلبار کے ہاتھ لگے لقمے نہایت اطمینان سے کھائے۔ لالہ ڈھالو رام صاحب ہیڈ ماسٹر نے میرے دل میں مسلمانوں سے چھوت چھات نہ کرنے کا پہلا بیج اس طرح بویا کہ جس کا اثر اب تک قائم ہے۔ اور میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کبھی بھی کسی مسلمان سے اس وجہ سے نفرت نہیں ہوئی کہ وہ مسلمان ہے۔ کاش ہمارے معلّم۔ پروفیسر۔ لیکچرار اور ہیڈ ماسٹر نیز پرنسپل صاحبان اگر لالہ ڈھالو رام صاحب ہیڈ ماسٹر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے دلوں میں اس جذبہ کو بھی بٹھانے کی کوشش کریں۔ کہ ہم سب ایک ہی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اور کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ تو کچھ سالوں بعد مذہبی نفرت، چھوت چھات وغیرہ از خود ختم ہو جائے گی۔

میرے آبائی گاؤں ہیرو غربی ضلع ڈیرہ غازی خاں (پاکستان) سے ایک میل کے فاصلہ پر گاؤں ہیرو شرقی میں میری سسرال تھی۔ ہیرو شرقی میں ایک بلوچ غلام رسول خاں بڑے دبدبے اور رکھ رکھاؤ کے زمیندار تھے۔ ایک ہندو لڑکی کنوئیں سے پانی کا مٹکا سر پر رکھے اپنے گھر جا رہی تھی کہ غلام رسول خاں کے جواں سال لڑکے نے شرارتاً غلیل سے ایسا نشانہ لگایا کہ پانی بھرا مٹکا پھوٹ گیا اور لڑکی کے کپڑے بھیگ گئے۔ ان دنوں گاؤں کی لڑکیاں موٹا لباس پہنتی تھیں۔ چنانچہ کپڑے بھیگنے کے باوجود لڑکی کے جسم سے نہیں چپکے اور وہ اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھی غلام رسول خاں کے گھر چلی گئی اور جاتے ہی روتے ہوئے غلام رسول خاں کی بیوی سے فریادی لہجہ میں کہا چاچی محمد خاں نے یہ شرارت کی ہے۔ محمد خاں کی ماں نے لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ چُپ ہو جا۔ اُس کا باپ گھر پر ہے اگر اُس نے سن لیا تو محمد خاں کو جان سے مار دے گا۔ لڑکی تو چُپ ہو گئی۔ مگر غلام رسول خاں نے یہ بات سُن لی تھی وہ کمرے سے باہر آئے اور گرج دار آواز میں کہا بیٹی ٹھیک ٹھیک بات بغیر کسی ڈر کے کہو لڑکی نے تمام واقعہ من وعن سُنایا تو غلام رسول خاں اندر گئے اور ...... بندوق اُٹھا لائے۔ اپنی بیوی کو حکم دیا کہ اس بچی کو اور کپڑے پہناؤ جب اس کے گیلے کپڑے سوکھ جائیں تو اسے نوکرانی کے ساتھ اس کے گھر بھیج دینا اور باندی سے کہو کہ اس لڑکی کے گھر جا کر اس کے ماں باپ سے کہہ آئے کہ ان کی بیٹی ہمارے گھر میں بیٹھی ہے کوئی فکر نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے بندوق لے کر باہر نکل گئے۔ محمد خاں نے اپنے باپ کو آتے ہوئے دُور سے دیکھا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ باپ نے بیٹے پر گولی چلا دی نشانہ خطا گیا۔ اور محمد خاں بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء تک محمد خاں گھر واپس نہیں آیا تھا۔ یہ تھے میرے وطن ڈیرہ غازی خاں کے مسلمان جو ہندو لڑکیوں کو بھی اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔

قریباً ۲۵ سال قبل دہلی میں ایک خوش شکل، خوش عقل، خوش آواز اور آفتِ جاں شاعرہ کا بول بالا تھا۔ اکثر شعراء اس شاعرہ کے درِ دولت پر اس اُمید میں سلام کے لیے حاضری دینے جاتے تھے کہ شاید اسی بہانے اس زُہرہ جمال سراپا غزل کی ایک جھلک نظر آجائے۔ یہ شاعرہ قوم کی پٹھان، بات کی دھنی، دوستوں پر جان دینے والی اور جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی دل کی صاف بھی تھی۔ متلوّن مزاجی حُسن کا خاصہ ہے۔ خودستائی، خودنمائی ہمیشہ حُسن کی کنیزیں رہی ہیں۔ خوشامد اور تعریف حُسن اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ اس شاعرہ کی مقوی حُسن مسکراہٹ پر اکثر شعراء سرِ مشاعرہ کلام سُناتے سُناتے اپنی یادداشت کھو بیٹھتے تھے۔ مرحوم شنکر لال، جناب شنکر پرشاد آئی سی ایس (ریٹائرڈ) سابق چیف کمشنر دہلی، جناب جوش، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مرحوم ڈاکٹر کاٹجو (اُس وقت کے ہوم منسٹر) ساحر ہوشیارپوری، بچا سیٹھ پریم نارائن اور دیگر کئی سخن ور، سخن شناس، اور سرکردہ حضرات اس شاعرہ کی قدر کرتے تھے۔ غرضیکہ یہ صاحبہ اُس وقت دہلی کی ادبی محفلوں کی جان تھیں۔

حکیم خلیل الرحمٰن نار دہلی کانگریس کی ناک تھے، الیکشن میں یہ محترمہ حکیم صاحب کے مقابلہ میں کھڑی ہوگئیں ظاہر تھا کہ کانگریس حکیم صاحب کی شکل میں پٹ جاتی۔ ہر ممکن ترکیبیں کی گئیں کہ کسی طرح اس شاعرہ کو حکیم صاحب کے حق میں بٹھا دیا جائے مگر بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ پولنگ سے صرف ایک روز پہلے دلّی کانگریس کے کارکنان کو ایک ترکیب سوجھی اور وہ رات کے ایک بجے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی کوٹھی پر پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ اگر آپ اس شاعرہ سے کہیں گے تو وہ الیکشن سے کنارہ کش ہوجائیں گی۔ کنور صاحب اس وقت مجسٹریٹ تھے۔ لہٰذا انھوں نے کانگریس کے اس وفد کے زور دینے پر اپنے ڈرائیور کو گاڑی دے کر رات کے دو بجے ان صاحبہ کے ہاں بھجوایا کہ اُن سے کہیئے کہ ایک نہایت ضروری کام ہے اسی وقت تشریف لائیے۔ یہ خدا کی بندی رات کے ہ۲ بجے کنور صاحب کی کوٹھی پر پہنچیں تو ڈرائنگ روم میں دہلی کے سکہ بند کانگریسیوں کو دیکھا اور انھیں میں بیٹھے اپنے الیکشن حریف کو بھی۔ غصہ سے ان کا حُسن اور بھی چمک اٹھا۔ کنور صاحب نے نہایت معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے ان سے کہا کہ یہ میری خواہش ہے کہ آپ الیکشن نہ لڑیں۔ یہ صاحبہ اپنی روایتی مقوی حُسن اور حکیم نار کے لیے مقوی الیکشن مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں۔ کنور صاحب اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں الیکشن پر لعنت بھیجتی ہوں لائیے کاغذ تاکہ لکھ دوں کہ میں مقابلہ سے دست بردار ہوتی ہوں۔ کانگریسی وفد کے سربراہ کے لٹکے ہوئے چہرے کی یکدم کایا کلپ ہوگئی۔ اس وفد کے سربراہ نے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی ان صاحبہ کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے جو اخراجات وغیرہ ہوئے ہیں وہ

ایک سُوا تعاون

ڈیرہ غازی خاں میں اُس وقت ۴ فیصدی آبادی ہندوؤں کی تھی اور ۹۶ فیصدی مُسلمانی آبادی۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں تونسہ شریف کے خواجہ نظام الدین صاحب نے تمام علاقہ میں اطلاعات بھجوائیں کہ تمام ہندو معہ اہل وعیال اور ضروری سامان کے تونسہ شریف کی سرائے، جس میں دو چار ہزار افراد بیک وقت قیام کر سکتے ہیں، میں آجائیں۔ اُن کے جان اور مال کی حفاظت اُن کے ذمّہ ہوگی۔ پولیس اور فوج کی ٹکڑی بھی تونسہ شریف میں ہندوؤں کی حفاظت کے لیے پہنچ چکی تھی۔ ہماری تحصیل سنگھڑ (تونسہ شریف) کے ہندو گھرانے تونسہ شریف میں آگئے۔ جن لوگوں کے رشتہ دار وہاں تھے وہ تو ان کے ہاں قیام پذیر ہوئے اور باقی کے لوگ تونسہ شریف کی سرائے میں مقیم ہوگئے۔ آٹا گھی، نمک، مرچ، چائے کی پتی، دودھ، جلانے کی لکڑی سب خواجہ نظام الدین صاحب کی طرف سے مہیّا کیے جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اور منادی کرائی گئی کہ ہندو عورتیں آزادانہ طور پر جہاں آنا جانا چاہیں آجا سکتی ہیں کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ پولیس اور فوج کے افسران سے خواجہ نظام الدین صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگ واپس چلے جائیں یہ میری رعایا ہے۔ ان کی جان اور مال ومتاع کی حفاظت میرے فرائض میں ہے اور اگر کسی ہندو کی نکسیر بھی پھوٹے گی تو اس کا مَیں ذمہ دار ہوں گا۔ چنانچہ سب ہندوؤں نے از خود پولیس اور فوج سے کہا کہ ہمیں خواجہ صاحب کی سرپرستی درکار ہے۔ آپ کی مدد نہیں چاہیے۔ چنانچہ پولیس اور فوج واپس چلی گئی۔ منگروٹھ شرقی کے سیٹھ ملاوارام ایک رات کو نقد روپیہ اور زیورات وغیرہ اپنی کار میں رکھ چپکے سے تونسہ شریف سے ڈیرہ غازی خاں کی طرف روانہ ہوئے تونسہ سے چند گز کے فاصلے پر ہی نالہ سنگھڑ جو اس وقت ایک میل پاٹ رکھتا تھا کے عین درمیان صبح کے وقت سیٹھ ملاوارام قتل ہوئے پڑے تھے اور روپیہ زیورات لُٹ چکے تھے۔ کار اُن کی بدبختی اور خواجہ صاحب پر اعتماد نہ کرنے کے افسوسناک نتیجہ کی خاموش تصویر بنی ایک طرف ریت میں کھڑی تھی۔ سیٹھ ملاوارام کے تین دیگر ساتھی بھی قتل کر دیے گئے تھے اس واقعہ پر خواجہ نظام الدین کو جو افسوس ہوا وہ کسی طرح بھی سیٹھ ملارام کے رشتہ داروں سے کم نہ تھا۔ کچھ دنوں بعد جب خواجہ صاحب کو یقین ہوگیا کہ ان ہندوؤں کو دوبارہ اپنے گھروں میں آباد نہ کر سکیں گے کیونکہ حالات ہی ایسے ہو چکے تھے تو انھوں نے افسران کو لکھا کہ موٹر لاریوں کا انتظام کیا جائے اور دو چار دنوں کے بعد سرکاری موٹر لاریوں کا قافلہ قریبًا چار ہزار ہندوؤں کو لے کر ڈیرہ غازی خاں روانہ ہوا اور وہاں سے دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد غازی گھاٹ کے اسٹیشن پر پہنچا۔ خواجہ نظام الدین صاحب کی کار اس قافلے کے آگے آگے چل رہی تھی۔ غازی گھاٹ پر اسپیشل گاڑی ان تارکانِ وطن کو لے جانے کے لیے کھڑی تھی۔ اور خواجہ صاحب سے ان کی یہ ہندو رعایا رو رو کر الوداع لے رہی تھی۔ میرے بوڑھے ماں باپ۔ میرا بھائی اور میرے سیکڑوں رشتہ دار اسی قافلہ میں تھے۔ مَیں مُلتان سے دہلی ایک ماہ پہلے آچکا تھا۔ جب کئی ماہ بعد میرے ماں باپ کرنال میں ملے تو وہ خواجہ نظام الدین صاحب کو یاد کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہنے لگے کہ یہ خواجہ نظام الدین کی مہربانی اور خواجہ شاہ سلیمان تونسوی ؒ کا کرم نیز خُدا کا احسان ہے کہ آج تم ہمیں دیکھ رہے ہو۔ کچھ سال بعد خواجہ نظام الدین اجمیر شریف جاتے ہوئے دہلی سے گوڑگاؤں وغیرہ سے گذرے تو تونسہ شریف کے ان تارکانِ وطن نے اپنے محسن خواجہ نظام الدین صاحب کو کندھوں پر اُٹھا کر گوڑگاؤں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جلوس نکالا۔ پھولوں اور نوٹوں کے ہاروں سے خواجہ صاحب سے اپنی دلی عقیدت کا اظہار کیا۔ اور کوئی بھی اُن میں ایسا نہ تھا کہ جو رو رو کر خواجہ صاحب کی قدمبوسی نہیں کر رہا تھا۔ اور خواجہ صاحب بھی اپنی رعایا کو گلے لگا لگا کر دُعائیں دے رہے تھے۔ یہ تھے خواجہ شاہ سلیمان تونسوی ؒ کے نام لیوا خواجہ نظام الدین صاحب جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے

ایسے بُرے وقت میں چار ہزار ہندوؤں کو اپنی پناہ میں رکھا اور اسلام کے اصلی روپ کو وہاں کے مسلمانوں اور ان مہاجروں کو دکھایا۔ اب خواجہ نظام الدین صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ مگر تونسہ شریف (تحصیل سنگھڑ) کا ہر مہاجر ہندو ان کا ممنونِ احسان ہے۔ اور ان کو دل سے یاد کرتا ہے۔ اور دہلی میں مسلمانوں کو اپنے خواجہ کی رعایا پروری کے واقعات بڑے فخر سے سناتا ہے۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے وطن کو یاد کرتا ہے جہاں ہندو مسلم دونوں سگے بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔

عالی جناب راجہ نریندر ناتھ رئیسِ اعظم لاہور پہلے ہندوستانی تھے جو انگریزی حکومت میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر تعینات ہوئے۔ مگر جب انگریزی حکومت نے ایک جونیئر انگریز کو کمشنر بنا کر راجہ صاحب کو پھر ڈپٹی کمشنر بنا دیا تو انھوں نے اسے توہین سمجھا اور انگریزی حکومت کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

جناب راجہ صاحب ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھوں نے عدل و قانون کا جو مظاہرہ فرمایا وہ اہلِ ملتان کے لیے نئی بات تھی۔ کیونکہ انگریز ڈپٹی کمشنر کا ان دنوں دبدبہ ایسا ہوتا تھا کہ اس زمانے میں وزیر اعظم کا بھی نہیں۔ پہلی بار ایک ہندوستانی ڈپٹی کمشنر بنایا گیا تھا۔ اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کو جو اپنے خدا کو حاضر ناظر سمجھتی تھی اور جس سے ناانصافی کی امید ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہر فریادی کو فریاد براہ راست ڈپٹی کمشنر کے حضور کرنے کا موقع پہلی بار ملا تھا لہٰذا راجہ صاحب نے اہلِ ملتان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ راجہ صاحب کا معمول تھا کہ علی الصبح باغ لانگے خاں میں سیر کے لیے جاتے۔ ایک بوڑھا ہر روز ان کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ جونہی راجہ صاحب تشریف لاتے وہ بوڑھا نہایت عاجزی سے سلام کرتا اور چپ چاپ چل دیتا۔ کچھ دنوں کے بعد حسبِ معمول بوڑھا سلام کر کے جانے لگا۔ تو راجہ صاحب نے اُسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہیں کیا چاہیے۔ بوڑھے نے دست بستہ عرض کی کہ حضور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مَیں تو ہر روز آپ کا دیدار کرنے کے لیے آتا ہوں کہ راجہ ساون مل نے آنے میں سو سال لگا دیے۔ یہ کہہ کر بوڑھا حسبِ معمول چلا گیا۔ اور راجہ صاحب اسے حیرت سے دیکھتے رہے۔

باغ لانگے خاں ملتان کا ذکر آیا ہے تو ایک واقعہ اور بھی سن لیجیے۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی انگریز د ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ باغ لانگے خاں میں ایک سیاسی جلسہ ہو رہا تھا آغا شورش کاشمیری تقریر کر رہے تھے۔ سامعین کا جمِ غفیر تھا۔ کہ ملتان کے سیاسی جلسوں میں ایسی نظیر مشکل سے ملے گی۔ آغا شورش کشمیری انگریزی حکومت کے خلاف تقریر کیا آگ اُگل رہے تھے۔ کہ اتنے میں پولیس کا ایک دستہ اسٹیج پر چڑھ گیا اور آغا صاحب کو گھسیٹتے ہوئے پولیس کی گاڑی تک لے گیا اور دو چار پولیس مینوں نے آغا صاحب کو اُٹھا کر پولیس وین میں ڈال دیا اور یہ جا وہ جا۔ سامعین آغا شورش کشمیری زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد اور نہ معلوم کیا کیا نعرے لگا رہے تھے کہ پولیس نے ڈنڈے برسانا شروع کیا اور لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مَیں بڑی مشکل سے ملتان چھاؤنی اپنے مکان پر پہنچا تو صبح آٹھ بجے ہی ملتان چھاؤنی تھانے کے انگریز انچارج مسٹر لوئیس نے بلوایا اور ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ تم رات کو جلسے میں تھا جواب ہاں میں تھا۔ کیونکہ جب مسٹر لوئیس نے پوچھا تو بتایا گیا کہ مَیں روزنامہ "احسان" لاہور کو ملتان کی خبریں بھجواتا ہوں۔ اس لیے جلسہ کی کارروائی سننے گیا تھا۔ خبردار اگر کوئی خبر بھجوائی تو ورنہ بند کر دوں گا۔ یہ کہنے کے بعد مسٹر لوئیس نے میرا ایک خط مجھے دکھایا جو تین دن پہلے اخبار احسان لاہور کے دفتر کو بھجوایا گیا تھا جس میں ملتان کے سیاسی حالات اور انتظامی معاملات پر نہایت محتاط الفاظ میں تبصرہ کیا گیا تھا۔ مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس خط میں تو مسٹر لوئیس کی

خوش انتظامی کی تعریف کی گئی ہے۔ اس پر مسٹر ٹوئیس نے کہا کہ بے شک تم نے میری تعریف کی ہے مگر میری قوم کے خلاف لکھا ہے۔ یاد رکھو کہ انگریز قوم پہلے ہے اور مسٹر ٹوئیس بعد میں۔ کاش کہ ہم ہندوستانیوں نے انگریز سے یہ بھی سیکھا ہوتا کہ ملک اور قوم پہلے اور ہندو مسلمان بعد میں۔

خُدائی قہر

قصبہ پھپھوند ضلع اٹاوہ سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں بھرتھنہ ہے اس گاؤں کے ٹھاکر رام سنگھ اپنے علاقہ کے ایک سرکردہ اور باعزت ٹھاکر تھے۔ بڑے ارمانوں کے ساتھ جب اُن کے اکلوتے بیٹے کی شادی کا وقت آیا تو ٹھاکر رام سنگھ نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ جملہ انتظامات کیے۔ بہورانی کے لیے دلّی سے ہیرے کے جڑاؤ زیورات بنوائے گئے۔ جب ٹھاکر رام سنگھ دہلی سے زیورات بنوا کر رات کی گاڑی سے فیروز آباد پہنچے اور اپنے کسی واقف کار بنئے کی دوکان میں قیام کیا اور اُس بنئے دوکاندار سے کہا کہ صبح جلد سے جلد بہو کے لیے بہترین ساڑھیاں خرید دے تاکہ دوپہر سے پہلے پہلے یہ اپنے گاؤں پہنچ جائیں اس بنئے دوکاندار کے علاوہ ٹھاکر صاحب کے ایک دوسرے واقف کار بنئے اور ایک مسلمان دوکاندار ننھے نے ٹھاکر صاحب کی خواہش کے مطابق بارہ بجے تک تمام سامان وغیرہ دلوا کر ٹھاکر صاحب کو گاؤں روانہ کر دیا۔ ٹھاکر صاحب دہلی جاتے وقت اپنی برق رفتار گھوڑی بنئے کے ہاں چھوڑ گئے تھے تاکہ واپسی پر اسی گھوڑی سے اپنے گاؤں جا سکیں۔

چلتے وقت ٹھاکر صاحب زیورات کا صندوقچہ بنئے کی دوکان میں ہی بھول گئے۔ اور باقی سب سامان گھوڑی پر لاد کر اپنے گاؤں کو روانہ ہوئے۔ ابھی وہ دو کوس ہی گئے ہوں گے کہ اُنھیں زیورات کے ڈبے کا خیال آیا۔ اور وہ اُلٹے پاؤں انتہائی برق رفتاری سے گھوڑی کو دوڑاتے ہوئے بنئے کے ہاں آئے اور زیورات کا ڈبہ بھول جانے کا ذکر کیا۔ دونوں بنئے اور ننھے زیورات کا ڈبہ چھپا چکے تھے۔ اور انھوں نے بڑی سادہ لوحی سے جواب دیا کہ ٹھاکر یہاں تو آپ کوئی ڈبہ نہیں چھوڑ گئے ہیں۔ ٹھاکر نے جب اِن تینوں کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ زیورات کا ڈبہ اِن ہی کے پاس ہے اور اب یہ بددیانت ہو چکے ہیں تو ٹھاکر رام سنگھ نے اِن سے کہا کہ تم بددیانت ہو چکے ہو۔ میرا ایک ہی لڑکا ہے میں اُس کی اور بھگوان کی قسم کھاتا ہوں کہ آج بارات جانے والی ہے جونہی بہو گھر میں قدم رکھے گی میں تمام زیورات اُتروا کر تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اس وقت میری برادری میں بے عزتی نہ کراؤ اور وہ زیورات مجھے دیدو اور میں تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا تمسک نامہ لکھ دیتا ہوں تاکہ اگر میں اپنی قسم اور وعدے کے مطابق زیورات تمہیں واپس نہ کروں تو تم نالش کر کے مجھ سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لینا۔ مگر دونوں بنیوں اور ننھے کے دل و دماغ ہیرے کے جڑاؤ زیورات کی چکاچوند سے ماؤف ہو چکے تھے اور بددیانتی اور بے ایمانی کا غلبہ ان پر پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا اور ٹھاکر ناامید ہو کر پولیس اسٹیشن گیا۔ بنیوں اور ننھے کی مثلث نے پولیس والوں کو بھی

ساتھ ملا کر مثلث کو چکور بنا لیا اور پولیس والوں نے بھی ٹھاکر رام سنگھ کی کوئی مدد نہ کی۔

ٹھاکر رام سنگھ جب مایوس ہو گیا تو اُس نے ان بد دیانتوں سے کہا کہ میرے لیے اب آتم ہتیا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ میں کس منہ سے خالی ہاتھ بیٹے کو بیاہنے جاؤں گا۔ جب کہ برات جانے میں اب صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ میں برادری میں اور اپنے سمبندھیوں میں ایسی بے عزتی برداشت نہیں کر سکوں گا لہٰذا تم مجھ پر رحم کرو اور زیورات مجھے دے دو اور میرے ساتھ میرے گاؤں چلو میں تمہیں اِدھر اُدھر سے نقد روپیہ کا انتظام کر دیتا ہوں مگر بد دیانتوں کی اس چوکڑی نے ایک نہ سُنی۔

ٹھاکر رام سنگھ نے باقی کا تمام سامان گھوڑی کی کمر پر اچھی طرح سے باندھ دیا اور اس پر سوار ہو کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ فیروز آباد سے باہر نکل کر گھوڑی کو تھپکی دے کر اپنے گاؤں کی طرف بھگا دیا اور خود دریائے جمنا کی طرف جا کر عین اُس وقت دریائے جمنا میں چھلانگ لگا دی جب کہ بیٹے کی برات کی روانگی کا وقت تھا۔

گھوڑی مالک کے بغیر جب گھر پہنچی تو گھر والوں اور مہمانوں نیز گاؤں والوں نے اندازہ لگا لیا کہ ٹھاکر رام سنگھ کو راستہ میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے اور وہ قتل کر دیا گیا ہوگا اور گھوڑی بھاگ کر گھر آ گئی ہے۔

ٹھاکر رام سنگھ کی لاش تیسرے دن فیروز آباد سے کافی دُور جمنا کے کنارے لگی ملی۔ مگر یہ راز بد دیانتوں کی چوکڑی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر سب کے راز جاننے والا اس سے بے خبر نہیں تھا۔

ٹھاکر رام سنگھ کی آخری رسُومات پولیس کی ضروری کارروائی کے بعد ادا ہو گئیں۔ ٹھاکر کے اکلوتے بیٹے کی شادی بھی ہو گئی۔ اور بظاہر ٹھاکر رام سنگھ کی اس خودکشی کو ڈاکوؤں کا کام ہی سمجھا گیا۔

اخلاق اور پولیس تو ڈیڑھ لاکھ کے زیورات کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال چکے تھے مگر بھگوان کے ہاں تو بغیر رپورٹ لکھوائے ہی خود بخود مقدمہ زیرِ سماعت آ جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خدائی عدالت کے سمن طلبی کبھی کبھی ذرا دیر سے موصول ہوتے ہیں اور بسا اوقات فوری طور پر بھی تعمیل ہو جاتی ہے۔

دو ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک بنیا چل بسا اُس کے چند روز ہی بعد دوسرا بنیا بھی مر گیا، دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بنیوں کی ساری اولاد یکے بعد دیگرے مر گئی اور دونوں بنیوں کی صرف بیوائیں باقی رہ گئیں۔ ننھے کا یہ حال ہوا کہ سانس لے تو چھ انچ زبان باہر نکل آئے نہ دم نکلے نہ زبان اندر جائے۔ ہر دیکھنے والا خدا کی بے آواز لاٹھی کی اس مار کو دیکھ کر خدا سے دُعا کرتا کہ اے خدا اس بیچارے کا دم نکل جائے تاکہ اس عذاب سے تو نجات پائے مگر لوگوں کو اب کچھ معاملہ سمجھ میں آنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ ٹھاکر رام سنگھ کی آہوں کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے۔

آخر کار کئی دنوں کے بعد ننھے کی جان قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تو دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اُس کی زبان کم از کم آٹھ نو انچ باہر نکلی ہوئی تھی اور شکل اتنی بھیانک ہو گئی تھی کہ دیکھنے والوں کی گلگی بندھ جاتی تھی۔

ننھے کا بھائی بھی چند روز بعد چل بسا۔ ننھا کھاتا پیتا اور اچھا مالدار تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ننھے کے بیٹے نے جُوا کھیلنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سات مکان ہار گیا۔ ابھی حال ہی میں ننھے کی بہو روتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ کرنے والا کون اور بھرنے والا کون۔ ان ننھے کی اولاد کے پاس سر چھپانے کے لیے ایک جھونپڑا رہ گیا ہے۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی ہے۔ ننھے کا دِلی میں بھی کاروبار تھا اور ایک سو درزی ہر وقت کپڑوں کی سلائی کرتے رہتے تھے اور ریڈی میڈ گارمنٹ بیرونِ مُلک جاتے تھے اب یہ کاروبار بھی ختم ہو چکا ہے۔ سب مشینیں فروخت ہو گئیں۔ غرضیکہ ہر طرح تباہی و بربادی کے بھوت نے ننھے کے خاندان کو گھیر رکھا ہے۔

یہ بد دیانتوں کی مثلث تو کیفر کردار کو پہنچی، پولیس کے جس افسر نے ان بد دیانتوں کا ساتھ دیا تھا اور رشوت لے کر ٹھاکر رام سنگھ کی مدد نہ کی تھی۔ سُنا ہے کہ وہ بھی اپنے فعل کی قرار واقعی سزا پا چکا ہے۔ مگر یہ پولیس والے اتنے بے شرم ہوتے ہیں کہ خُدائی قہر کو ہونی کہہ کر اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر از خود وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ کہ انھیں اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے۔

ننھے کے بیٹے کی بیوی روتی ہے اور کہتی ہے کہ اے خُدا جس نے کیا تو نے اُسے سزا دینی تھی اس کی اَولاد نے تیرا کیا بگاڑا ہے اُسے کیوں سزا دے رہا ہے مگر ہندو فلاسفی تو یہی کہتی ہے کہ ماں باپ کے گناہوں اور اچھے کاموں کا پھل اُن کی اَولاد کو بھی ملتا ہے۔ ننھے کی پوتیوں سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ کہیں شادی کرنے کے بعد ان لوگوں کی بدبختی شادی کرنے والوں پر بھی اثر انداز نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ بد دیانتوں کی اس تثلیث نے صرف اسّی ہزار روپیہ میں تو ایک سیٹ فروخت کیا جس میں ہیرے لگے ہوئے تھے۔ اور باقی زیورات بھی اَونے پَونے دلی میں فروخت کیے۔ اور پولیس کو دو تین ہزار روپیہ اس وقت رشوت دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ٹھاکر رام سنگھ جھوٹ بولتا ہے اور بلیک میل کر کے ان سے کچھ اینٹھنا چاہتا ہے کیونکہ ان کے بیٹے کی شادی ہے اور اسے روپیہ کی ضرورت ہے۔

فیروز آباد اور بھرتنا کے لوگ اس واقعہ کی اصلیت سمجھ گئے ہیں اور ان بد دیانتوں کا عبرتناک انجام دیکھنے کے باوجود دُنیا کی ہوَا کے ساتھ اُڑ رہے ہیں اور وہ بھی ہر ممکنہ بد دیانتی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور خُدا ہم عقل کے اندھوں کو ٹھاکر رام سنگھ ایسے واقعہ سے بار بار خبردار کرتا ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

سائیں!

میں ڈھاڈا گنہ گار ہاں

۱۹۴۰ء کے موسمِ گرما میں چراغِ عرب ہوٹل بیرون حرم دروازہ مُلتان شہر (پاکستان) میں مقامی اخبار نویسوں کی ایک میٹنگ تھی۔ خواجہ عبدالکریم قاصف نمائندہ (اُردو روزنامہ احسان لاہور) و نامہ نگار نے فرمایا سرور صاحب میٹنگ کے بعد آپ سے ایک ضروری معاملہ میں مشورہ کرنا ہے۔ اس لیے یہیں رہیے گا۔ میٹنگ کے بعد جب سرکار تشریف لے گئے تو قاصف صاحب مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ پانچ منٹ بعد ایک جوان العمر شخص جس نے کسی حد تک اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے کُرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر کُرسی پر نہیں بیٹھا۔ قاصف صاحب کے کہنے پر یہ شخص بڑی عاجزانہ و نیازمندانہ ہچکچاہٹ کے ساتھ کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ہوٹل کا بوائے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا تو قاصف صاحب نے چائے بناتے ہوئے اس شخص سے کہا کہ اب اپنے چہرہ سے کپڑا ہٹا کر سرور صاحب سے اپنی بات کہو۔ ایک جوانِ رعنا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال ہو گی۔ رنگ سفید و سُرخ، اُوپر والے ہونٹ پر چوٹ کا ایسا نشان کہ جس کی وجہ سے ایک دانت چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہوا۔ جسم گٹھا ہوا پہلوان نما، مُلتانی زبان میں کہنے لگا "سائیں مَیں ڈھاڈا گنہ گار ہاں جے تُساں مہربانی فرما دُتاں میرا بیڑا پار ہو ویسی نہیں تاں اللہ مالک اے جو اوہدی مرضی ہوسی اوہنوں کون روک سکدا اے۔" (محترم مَیں بڑا گنہ گار ہوں اگر آپ مہربانی فرمائیں گے تو میرا بیڑا پار ہو جائے گا۔ وگرنہ اللہ مالک ہے۔ جو اس کی مرضی ہو گی اُسے کون روک سکتا ہے۔)

مَیں نے اسے مُلتانی زبان میں تسلّی دیتے ہوئے بتایا کہ قاصف صاحب میرے محترم دوست ہیں۔ ان کا کچھ کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لیے تمھیں جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو اگر مجھ سے کچھ ہو سکے گا تو ضرور کروں گا۔ میرے ہمدردانہ کلمات سے بھی اس نوجوان کو اپنا حالِ دلی کھُل کر بیان کرنے کے لیے اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا تو قاصف صاحب فرمانے لگے سرور صاحب یہ نوجوان جس کا نام یٰسین ہے، ڈکیت ہے۔ چلتی گاڑی میں عورتوں کے زیور اُتارنا۔ چاقو دکھا کر مسافروں کا مال و اسباب لُوٹ لینا۔ راہ چلتے اکیلے دو کیلے مسافروں کو چھُرے کے زور پر لُوٹ لینا اس کا روزمرہ کا کام ہے مسافروں کو لُوٹ کر چلتی ریل سے اُتر نا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے۔ جس کو چاہے پیٹ ڈالتا ہے۔ پاک دروازہ کے باہر اس کا گھر ہے اور مَیں بھی پاک دروازہ میں رہتا ہوں۔ مَیں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ کل یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ قاصف صاحب مجھے خُدا نے لڑکا عطا فرمایا ہے اور خُدا کے اس عطیہ پر میرے دل و دماغ میں بغاوت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ مجھے اب حلال کی روزی سے اپنے بیٹے کی پرورش کرنی چاہیے وگرنہ حرام کی کمائی سے یہ بھی میرے ہی نقشِ قدم پر چلے گا۔ اور جیسے محلے والے میرے سامنے توڑتے ہوئے پہلوان پہلوان کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے

کہتے ہیں کہ یٰسین ڈاکو، یٰسین چور، یٰسین چاقو باز، جب میرا بیٹا بڑا ہوگا تو وہ دوسرے بچوں سے میرے بارے میں ایسے الفاظ سُنے گا تو کیا سوچے گا۔ لہٰذا بچے کی پیدائش کے بعد سے اب تک کسی جُرم کا مرتکب نہیں ہُوا۔ اور اپنی بیوی کا علاج وغیرہ بھی قرض لے کر کرا رہا ہے۔ چوری سے لُوٹا ہوا سب روپیہ وغیرہ غریبوں میں بانٹ دیا ہے۔ اب اس کے پاس رات کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے کیونکہ اس نے قسم کھائی ہے کہ اب بُرا راستہ اختیار نہیں کروں گا۔ مَیں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں سرور صاحب سے ملا دوں گا وہ تمہارا ایسا انتظام کر دیں گے کہ تم حلال کی روزی سے اپنے بیوی اور بچے کا پیٹ آسانی سے بھر سکو گے۔ لہٰذا اب آپ جانیئے اور یٰسین قاصف صاحب کی باتیں سُن کر مَیں کچھ وقت چُپ چاپ اس نوجوان کو دیکھتا رہا۔ اور یٰسین بھی نیچی نظروں کیے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ مَیں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا یٰسین وعدہ کرتے ہو کہ اپنے اس ارادے میں پکے رہو گے، خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اُٹھانی پڑے۔ یٰسین نے بے ساختہ کہا قسم قرآن دی مرویساں تاں وی چوری نہ کریساں (قرآن کی قسم ہے کہ مر جاؤں گا تاہم چوری نہیں کروں گا)

اُن دنوں کپڑا۔ چینی۔ مٹی کا تیل۔ دوسری جنگ عظیم کے باعث نایابی کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہر چیز پرمٹ پر ملتی تھی اور ضروری اشیاء کا حصول دِن دِن مشکل ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود مہنگائی نہیں تھی۔ لارگیان چند کھڑ اُن دنوں مُلتان میں شادیوں کے لیے کوٹے کا کپڑا دینے کے لیے منظور شدہ کلاتھ مرچنٹ تھے۔ (آج کل آپ صدر بازار میں کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں) مَیں نے ان کے نام ایک چٹ لکھ کر یٰسین کو دی کہ رقعہ حامل کو بارہ تولیے دے دیجیے یہ فروخت کر کے ان کی رقم آپ کو دے جائے گا اور مزید بارہ تولیے لے جایا کرے گا۔ دوسرے دن صبح ہی یٰسین میرے ہاں آیا اور ایک کٹورے میں ان تولیوں کی فروختگی کے پیسے پیش کیے۔ اور بتایا کہ سات روپے بچے ہیں۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ منافع کے سات روپے تو اپنے گھر کے اخراجات میں لے آؤ۔ اور باقی رقم کے بارہ تولیے اور لے آؤ۔ اسی طرح فی الحال ہر روز ایسا کرو۔ اگر تولیے جلد فروخت ہو جائیں تو اُسی وقت پچھلے حساب کو ادا کر کے مزید بارہ تولیے لے لیا کرو۔ دس پندرہ دنوں میں یٰسین دس روپے سے پندرہ روپیہ روز تک کمانے لگ گیا۔ اور اُس زمانے میں دس پندرہ روپیہ روزانہ کما لینا خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان دنوں مُلتان میں راشننگ کے افسر اعلیٰ سید منظور حسین صاحب تھے۔ جو انتہائی ایماندار، محنتی، ہنس مکھ اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ میں نے ان سے گذارش کی کہ اگر وہ یٰسین کے لیے شوگر کا کوٹا منظور فرمائیں تو مَیں اسے چائے اور لسّی کی دوکان کھلوا دوں۔ مگر سید صاحب نے فرمایا کہ وہ شوگر کا نیا کوٹہ منظور کرنے سے معذور ہیں۔ یٰسین نے ایک ایسے شخص کو راضی کر لیا جو پہلے سے شوگر کا کوٹہ ہولڈر تھا۔ اس شخص نے راشننگ آفس میں درخواست دی کہ وہ اور یٰسین دونوں کاروبار میں برابر کے شریک ہیں اور اب وہ الگ الگ کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا شوگر کا کوٹا دونوں کو نصف نصف بانٹ دیا جائے۔ راشننگ والوں نے کاغذات کی ضروری خانہ پُری کے بعد ایسا کر دیا۔ اور یٰسین نے پاک دروازہ کے باہر چائے کی دوکان کھول لی جو چند دنوں میں ایسی چمک اُٹھی کہ دیکھنے والے یٰسین کی محنت کی داد دینے لگے۔ کام بڑھ جانے کے باعث یٰسین سے شوگر کا کوٹا بڑھانے کی درخواست دلوائی گئی۔ جسے راشننگ انسپکٹر کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور یٰسین کو شوگر کا کوٹا پہلے سے چار گنا زیادہ ملنے لگا۔ یٰسین نے اس دوکاندار کو جس نے یٰسین کو اپنا نصف کوٹہ دلوایا تھا اپنے کوٹہ میں سے شوگر دے کر اس کا نقصان پورا کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں اس دوکاندار کا بھی شوگر کوٹہ راشننگ ڈائرکٹر سے کہہ کر بڑھوا دیا گیا۔

یٰسین ملوّل رہتا تھا کہ محلے میں لوگ اُسے اب بھی یٰسین ڈاکو کے نام سے یاد کرتے تھے اور اُس نے

قبول کر لیجیے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ یہ پٹھانی جلال میں آگئیں اور کہنے لگیں اگر کرنسی نوٹوں سے سودا کرنا تھا تو پھر میرے محسن کنور صاحب کے ہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تم میری نہیں کنور صاحب کی توہین کر رہے ہو اور نوٹوں کی گڈی وفد کے ارکان کے منہ پر مارتی ہوئیں یہ جا وہ جا۔ اسی ایک واقعہ سے اس پٹھان نژاد شاعرہ کی بلند اخلاقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شاعر جتنا زیرک اور بلند پرواز خیالات کا مالک ہوتا ہے عشق کے معاملہ میں اتنا ہی غیر معاملہ فہم، جلد باز اور اناڑی ہوتا ہے مگر سمجھتا یہی ہے کہ دنیا کی ہر لڑکی اور عورت اس پر مرتی ہے۔ آئیے کچھ ایسے شعرائے کرام کے پر لطف ذکر سے لطف اندوز ہوجیے جو اس شاعرہ سے ہوائی عشق فرماتے رہے۔

مرحوم بسمل سعیدی ان شاعرہ پر بری طرح عاشق ہو گئے۔ حالانکہ ان دونوں کی عمر کا فرق پچیس تیس سال سے زائد کا تھا۔ بسمل صاحب ان کا نام لے کر روتے تھے اور ہر وقت ان کے نام کا ورد کرتے کرتے ایسے ایسے بے پناہ شعر فرمانے لگے کہ بسمل واقعی بسمل ہو گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وارداتِ قلبی کے دور میں بسمل صاحب نے جو غزلیں کہیں وہ اُن کے سارے کلام میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ دہلی کالج میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں یہ تخصیص رکھی گئی تھی کہ ہر شاعر اپنا کلام سنانے سے پہلے اپنے نظریۂ شاعری سے متعلق چند حرف کہے۔ چنانچہ جب بسمل سعیدی صاحب مائیک پر تشریف لائے تو گلزار دہلوی اپنی روایتی چرب زبانی سے مجبور ہو کر چلا کر کہنے لگے۔ بسمل صاحب آپ کا نظریۂ شاعری تو فلاں صاحبہ ہیں۔ اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور بسمل صاحب ہائے کہہ کر غزل کے دو چار اشعار سنا کر بیٹھ گئے۔ مگر یار لوگوں نے ان محترمہ سے اس واقعہ کی تفصیل اور بھی نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ مرحوم لالہ دیش بندھو گپتا مالک "تیج" کی کوٹھی پر جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ تھا وہاں یہ شاعرہ بھی مدعو تھیں اور بد قسمتی سے گلزار دہلوی بھی۔ اپنے بھانجے سے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں . . اتار دے پنپٹ اس مرغی والے کی۔ اہلِ خانہ اور دوسرے اصحاب نے بیچ بچاؤ کرایا اور معاملہ رفع دفع کرا دیا گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد اردو بازار جامع مسجد مولوی سمیع اللہ مرحوم کی دوکان پر ایک مجمع دکھائی دیا۔ دیکھا تو واقعی ان صاحبہ نے اپنے بھانجے سے گلزار صاحب کی پنپٹ اتروا دی تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگیں۔ سرور صاحب ایمان سے کہنا اس نے دہلی کالج کے مشاعرہ میں کیا کہا تھا۔ معاملہ کی نزاکت۔ ان صاحبہ سے نہایت قریبی تعلقات۔ سچائی کی حمایت کرنا اپنا فرضِ منصبی غرضیکہ کئی مصیبتوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پا کر ان صاحبہ کو نہایت نرمی سے سمجھایا کہ اب اسے معاف کر دیں۔

ایک مشہور شاعر یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ یہ صاحبہ ان پر دل و جان سے مرتی ہیں۔ حالانکہ ان شاعر صاحب کی اپنی بیوی کو یہ شکایت رہی کہ یہ حضرت ازدواجی زندگی کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے قابل نہیں ہیں مگر یہ ایک خاصہ ہے کہ جنسی طور پر کمزور مرد اپنی مردانگی کے خود ساختہ افسانے سنانے میں کسی پیشہ ور قصہ گو سے کم نہیں ہوتا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ان شاعر صاحب اور ان کی بیوی میں یہ معاہدہ قرار پایا ہے کہ جنسی طور پر دونوں آزاد ہیں۔ راقم الحروف نے اس شاعرہ سے جب ان شاعر صاحب کے اس ون وے ٹریفک قسم کے عشق کا ذکر کیا تو فرمانے لگیں۔ آج شام کو گھر آنا ان شاعر صاحب سے اپنے جوتے اٹھوا کر دکھاؤں گی۔ چنانچہ شام کو خلافِ معمول جب ایڈیٹر شانِ ہند ان محترمہ کے گھر گیا تو ڈرائنگ روم میں ان شاعر صاحب کو تشریف فرما پایا جو اپنے اس نیاز مند کو دیکھ کر اچانک چونکے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ محترمہ غسل فرما رہی ہیں۔ اس دوران شاعر صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پون گھنٹے کے بعد یہ صاحبہ نہا کر ایوننگ اِن پیرس میں بسی ہوئی سفید ساڑھی

کئی بار مجھ سے اپنے اس ذہنی کرب کا اظہار بھی کیا اور میں اسے سمجھا دیتا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں چاہ بوہڑ والا مُلتان چھاؤنی میں رہتا تھا اور یٰسین مُلتان شہر پاک دروازہ کے باہر رہتا تھا۔ کم و بیش تین چار میل کا فاصلہ تھا۔ مگر یٰسین کا معمول تھا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے شہر سے سبزی منڈی سے سبزی موسم کے مطابق پھل اور بہترین دودھ لے کر چھاؤنی آتا اور دے جاتا اور بڑی رد و کد کے بعد ان اشیاء کی لاگت وصول کرتا۔ ایک دن یٰسین آیا اور کہنے لگا۔ سائیں بچے دی خوشی کرنی اے اور دھوم دھام نال کرنی اے۔ تمبو لگوانے نے۔ برف دی دو سلیاں دا انتظام کرا دیوتے۔ ایک قوال پارٹی وی چاہی دے ہے۔ تسیں تے بھابھی جی نے بچیاں نال آنا اے۔ اور پرسوں شام دا وقت مقرر کر دِتا اے۔ میں نے اس کی دعوت خوشی سے قبول کر لی اور اُسے انتظام کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات دیں۔ دوسرے دن میں نے لالہ بال کشن بترہ آبرو کیل ایڈیٹر اقبال" جناب اویسی۔ لالہ ہمت رائے ایڈیٹر مسافر۔ جناب شمشی ایڈیٹر لمو خان اور دوسرے ہندو و مسلم مدیرانِ اخبارات کو بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دے دی۔ مُلتان کی گرمی مشہور ہے لہذا ان دنوں برف بارہ آنہ سیر ملنا بھی مشکل تھا۔ میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ کر برف کے کارخانے میں کہلوا دیا اور دو سلی برف کا انتظام کروا دیا۔ راشننگ سول سپلائی۔ ڈاکخانہ۔ پولیس اور میونسپل کمیٹی کے کچھ افسران کو بھی میں نے مدعو کر رکھا تھا۔ صبح کو میں خود یٰسین کے انتظام کو دیکھنے گیا اور اسے ضروری ہدات دیں۔ لالہ امرت لال پاہٹی پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی سے کہہ کر کے سارے محلے میں صفائی کرا دی گئی۔ میونسپلٹی کی چھڑکاؤ کرنے والی موٹر گلیوں میں چھڑکاؤ کر گئی اور شام کو مقررہ وقت پر جملہ مدعو حضرات تشریف لے آئے۔ یٰسین آنے والوں کا استقبال کرتے ہوئے بچھا جاتا تھا۔ محلے کے لوگ اس اجتماع کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ محلے کی عورتوں کا ایسا ہجوم تھا کہ یٰسین کے گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ میراسنیں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ نائنیں بھی دھما چوکڑی مچائے ہوئے تھیں غرضیکہ اس محلے میں یہ تقریب اپنی طرز کی اولین تھی۔ یٰسین نے ایک سو سیر کی بوتل منگا رکھی تھی جو ان دنوں آٹھ آنے کی آتی تھی اور ایک ہزار سوڈا واٹر کی بوتل جو تین پیسے کی آتی تھی ----------

--- قوال موقع شناس نہیں تھے اس لیے وہ موقع و محل کا خیال کئے بغیر گا رہے تھے۔ ع غم خوار جو قائد اعظم ہے گاندھی کی تمنا کون کرے، مگر سیر پلاؤ۔ زردہ کباب کی موجودگی میں مہمانوں نے قوالوں کی اس بے وقت کی راگنی پر دھیان نہیں دیا۔ رات کے گیارہ بجے تک یہ محفل چلی۔ میرے اشارے پر یٰسین نے محلے کے اُن تمام بچوں۔ جوانوں اور بوڑھوں کو جو اس تقریب کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ سوڈا واٹر کی بوتلیں پیش کیں۔ محلے والوں کے لیے یہ عزت افزائی غیر متوقع تھی۔ دوسرے دن یٰسین میرے یہاں آیا تو آتے ہی پاؤں پکڑ لیے اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے ہوئے کہنے لگا بابو جی سارا محلہ یٰسین سیٹھ کہہ رہا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ ایک ہزار دو سو روپے خرچ ہوئے ہیں۔

سیاسی حالات بگڑ رہے تھے مارچ ۱۹۴۷ء میں ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے باہر تلوار کیا گھمائی کہ مُلتان شہر جلنے لگا۔ یٰسین کئی روز چھاؤنی میں میرے مکان کے باہر سوتا رہا۔ اور آخر نوبت یہاں تک آ گئی کہ چاہ بوہڑ والا پر ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات کو دو ہندو چھرے سے ہلاک کر دیے گئے۔ اور مجھے بھی دوسرے غیر مسلم حضرات کے ساتھ حرم دروازے کے اندر گلی صابن والی میں ہندو علاقے میں پناہ لینی پڑی۔ فسادات زوروں پر تھے۔ کسی غیر مُسلم کا گھر سے نکلنا موت کو دعوت دینا تھا۔ نمک تک ملنا مشکل تھا۔ مگر میرے لیے

ایک سو اُنہتّر

-------------- یٰسین ہر صبح سولہ بٹیر ذبح شدہ لے کر آتا، (اُن دنوں ایک روپیہ کے سولہ بٹیر ذبح شدہ ملتے تھے) اور میرے علاوہ میرے پڑوسیوں کی ضروریات کی اشیاء بھی یٰسین مہیا کرتا رہا۔ ریڈیو، پنکھا، اور دیگر سامان یٰسین فروخت کرتا رہا۔ اور اس طرح ایک ہزار روپیہ مجھے فراہم کر دیا۔ یٰسین کو ساتھ لے کر میں چھاؤنی کے ڈاکخانہ میں اپنے سیونگ بنک اکاؤنٹ سے روپیہ نکلوانے گیا۔ ڈاکخانہ کا ہر کلرک میرا واقف تھا۔ انھوں نے مناسب عزّت و احترام کیا۔ مگر روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور بتایا کہ ایسا حکم سرکاری طور پر آگیا ہے کہ غیر مسلموں کو روپیہ نہ دیا جائے۔ اب غیر مسلموں کی ہندوستان کے لیے نکاسی شروع ہو چکی تھی۔ ٹرین کی روانگی سے چار گھنٹے پہلے کرفیو نافذ کر دیا جاتا۔ تانگے والے اسٹیشن تک منہ مانگے دام جو دس روپیہ سے پچاس روپیہ تک ہوتے تھے، لینے لگے۔ کرفیو کے باوجود پولیس اور غنڈے غیر مسلموں کا سامان وغیرہ چھین لیتے تھے۔ ایک فیملی کو ایک بستر اور ایک ٹرنک لے جانے دیتے اور باقی سامان چھین لیتے تھے۔

میرا ارادہ پاکستان میں ہی رہنے کا تھا۔ مگر جب مسلمان دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ ان حالات میں میرا ہندوستان چلے جانا لازمی ہے تو میں نے بھی تیاری شروع کر دی۔ کتابوں کا اسٹاک، گھر کا اکثر سامان سب یٰسین کے حوالے کیا اور اُسے کہہ دیا کہ اگر ہم لوگ پھر اپنے وطن واپس آ گئے تو یہ سامان ہمارا ورنہ تمہارا، اور اسے ایک تحریر بھی دے دی کہ یہ سب سامان میں اپنی خوشی سے یٰسین کو دے رہا ہوں۔ چاہ بوہڑ والا چھوڑے قریباً پونے دو ماہ ہو گئے تھے۔ اور اس عرصہ میں ہماری جملہ ضروریات یٰسین پوری کر رہا تھا۔ آخر کار ۷ر اکتوبر کی رات کو ہمیں مطلع کیا گیا کہ صبح چار بجے سے سات بجے تک کرفیو لگا دیا گیا ہے اور اس وقفہ میں ہمیں مخصوص ریلوے پلیٹ فارم پر ملتان چھاؤنی پہنچنا ہے۔ اب میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ یٰسین کو اس کی اطلاع دی جا سکتی۔ کچھ ضروری سامان تیار ہی تھا صبح حرم دروازے پر آکر بڑی مشکل سے ایک تانگہ لیا گیا۔ سامان اور اہل و عیال کو تانگے میں لیے چھاؤنی اسٹیشن کو روانہ ہوا تو راستہ میں ایک نالہ پڑتا ہے اس نالہ کی پلیا پر پولیس اور چند غنڈے ہر تانگے کی تلاشی لے کر ایک ٹرنک اور بستر چھوڑ کر باقی سب سامان اُتار رہے تھے، ہمارا تانگہ بھی رُکا تو میں فوراً اُتر کر سول سپلائز آفیسر کی کوٹھی میں چلا گیا جو اس پلیا سے چند قدم پر تھی۔ سول سپلائی آفیسر مذہبی اور کٹر مسلمان ہونے کے ناطے پانچوں وقت نماز پڑھتے تھے۔ رشوت کو حرام سمجھتے تھے اور میرے ساتھ اُن کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور کہنے لگے سَرور صاحب اتنے سویرے کیسے آنا ہوا۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہندوستان جا رہا ہوں آخری بار سلام کرنے آیا ہوں۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہنے لگے کہ جو اللہ کی مرضی، اور میرے ساتھ کوٹھی کے باہر آئے اور پولیس والوں سے کہا کہ سَرور صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور ان کے تانگے کو بغیر تلاشی کے جانے دو۔ ایک سپاہی سے کہا کہ ان کے ساتھ جاؤ اور اسٹیشن پر چھوڑ کر آؤ۔

۸ر اکتوبر کو صبح دس بجے جب یٰسین صابن والی گلی میں میری رہائش گاہ پر پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ذبح شدہ بٹیر، دیگر اشیاء سبزی وغیرہ اور دھوبی کے دُھلے ہوئے ہمارے ۲-۴ کپڑے بھی تھے۔ محلہ والوں نے جب اُسے بتایا کہ وہ ہندوستان چلے گئے اور تمہیں سلام کہہ گئے اور تم سے نہ مل سکنے کی تمنّا لے کر گئے ہیں تو بتانے والے بتاتے ہیں کہ یٰسین دھاڑیں مار کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ خُدا نے آج مجھے یتیم کر دیا ہے۔ سب کھانے پینے کی چیزیں اُس نے میرے پڑوسیوں کو دے دیں اور ۲-۴ کپڑے بھی ان کو دینا چاہا کہ جب وہ ہندوستان جائیں تو انھیں دے دیں۔ مگر کسی نے بھی یہ امانت سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کی

امانت کون سنبھالتا۔ یہ سب حالات لالہ فتح چند زرگر نے مجھے بتائے جو صابن والی گلی کے ایک ممتاز باشندے تھے۔ اور اُن کا انتقال حال ہی میں دریا گنج میں ہی ہوا ہے۔

یٰسین نے جس ایمانداری۔ دیانت داری۔ اور خدمت گزاری سے میرے دل کو جیتا یہ اس کا ہی نتیجہ ہے کہ میں نے اپنے دفتر یا پریس میں آج تک کسی غیر مسلم کو ملازم نہیں رکھا۔ ہمیشہ ہی مسلمان افراد ہی کو ساری ذمہ داری سنبھالی۔ یہ یٰسین ہی کی ذات تھی جس نے مجھے یقین دلایا کہ مسلمان وفاداری۔ احسان شناسی اور جاں نثاری میں اپنا جواب آپ ہے (ویسے کالی بھیڑیں تو ہر مذہب اور قوم میں ہوتی ہیں۔)

میں ۲۴ر اکتوبر کو دہلی پہنچا اور دوسرے ہی دن یٰسین کو خط لکھا۔ درجنوں خط لکھنے کے بعد اُس کا ایک خط آیا جس میں صرف یہ لکھوایا تھا۔ (یٰسین خود ناخواندہ تھا) کہ بابوجی مجھے بھی ہندوستان بُلوا لو۔ (اور یہ میرے بس کا نہیں تھا۔) قاصف صاحب نے اپنے خط میں لکھا کہ پولیس نے یٰسین کو خوب تنگ کیا مگر اُس نے آپ کا سامان ایک مقدس امانت سمجھتے ہوئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اطّلاع ملی کہ یٰسین کا انتقال ہو گیا ہے۔ مگر میں اب بھی یٰسین کو اپنے دل و دماغ کے ہر گوشے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کا بھولا بھالا چہرہ جب بھی آنکھوں کے سامنے خیالی طور پر بھی آجاتا ہے تو میری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اب بھی میں اُس کے دل سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات سُنتا ہوا محسوس کرتا ہوں جیسے وہ جنّت میں میرے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگ رہا ہو۔ میں یٰسین کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خدا نے یقیناً اُس کے گناہ معاف فرما دیے ہوں گے اور اسے جنّت میں جگہ دی ہو گی۔ خدا کرے کہ یٰسین کا بیٹا زندہ ہو اور وہ پاک دامنی اور نیکی کی راہ پر زندگی گزار رہا ہو۔ قاصف صاحب کا احسان ہو گا اگر وہ یٰسین کے اہل و عیال کے بارے میں اطلاع دیں۔

اکتیس ۳۱ سال بعد میں یٰسین کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوا برائیوں کو چھوڑ کر نیکی کی راہ پر آنے والے اس محسن کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ جس نے اُس بُرے وقت میں میری خدمت کی۔ جب انسان حیوان سے بھی بدتر حیوانیت پر اُتر آیا تھا۔ اور میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ مرحوم یٰسین کی پاک رُوح کو سلام کہہ رہا ہوں ——— باقی رہے نام اللہ کا۔

ایک آنہ

تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خاں (پاکستان) سے قریباً پندرہ میل کے فاصلے پر کوہِ سلیمان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوہِ سُلیمان کے دامن میں جتنے بھی گاؤں ہیں وہاں کے ہندُو دوکاندار کوہ سُلیمان پر بسنے والے بلوچیوں (جن کو بُزدار کہا جاتا ہے) میں سود اسلف فروخت کرنے جاتے تھے اور تمام اشیائے ضروریہ عام طور پر اُدھار ہی دی جاتی تھیں جس کے بدلے میں یہ بلوچی باشندے بھیڑوں کی اُون، شہد، گھی۔ دُنبے۔ جوار۔ باجرہ وغیرہ دے کر یہ قرض چُکایا کرتے تھے۔ ہندُو دوکاندار ایک تو ایسے ہی الائچی دے کر (اونٹنی) لکھوانے والے ہوتے تھے۔ دوسرے وہ جانتے تھے کہ یہ بلوچی لوگ دس تک کی گنتی نہیں جانتے تو ان کی سادہ لوحی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اُنھیں لُوٹتے تھے۔ پہاڑی علاقے میں خچر یا گدھے ہی بار برداری اور سواری کے کام آتے تھے۔ میرے نانا اور چھوٹے ماموں بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح انھیں بُزداروں میں ہی سود اسلف فروخت کرتے تھے۔ ان بلوچیوں کی زبان تحصیل سنگھڑ (تونسہ شریف) کا ہر ہندُو دوکاندار جانتا تھا کیونکہ ان بلوچیوں کے ساتھ کاروبار کرنے کے لیے اُن کی زبان جاننا نہایت ضروری تھا۔

میرے والد صاحب ضلع لائل پور (اب جس کا نام فیصل آباد رکھ دیا گیا ہے) میں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ مگر سال میں ایک مرتبہ وہ سارے گھر والوں کو اپنے آبائی وطن ہیرو غربی تحصیل تونسہ شریف لے جایا کرتے تھے۔ کیونکہ ہمارے اکثر و بیشتر رشتہ دار ہیرو غربی اور دوسرے نزدیکی مقامات کے ہی رہنے والے تھے۔ لہٰذا شادی کے مواقع پر بے حد دشوار گزار راہوں سے گزر کر وطن جانا ہی ہوتا تھا۔ آج کل تو تونسہ شریف کی شکل و صورت ہی بدل گئی ہے۔ ان دنوں تو وہاں پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ دریائے سندھ کو کشتی سے عبور کرنا ہوتا تھا۔ ساون بھادوں کے دنوں میں جب دریائے سندھ کی چوڑائی بارہ میل تک پھیل جاتی تھی اور ہوا کا رُخ موافق نہیں ہوتا تھا تو بعض مرتبہ کشتی میں ہی بارہ بارہ دن گزر جاتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے نانا سے کہا کہ مجھے بھی پہاڑ پر لے چلیے۔ میری ضد پر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ گدھے کی سواری میرے لیے توہین آمیز تھی کیونکہ لائل پور میں تو گدھے کی سواری مذاق سمجھی جاتی تھی اور مقامی طور پر، چوری یا بدمعاشی کرنے والے کو گدھے پر بٹھا کر اُس کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ لہٰذا میں نے گدھے پر سوار ہونے کی نسبت پیدل چلنے پر ترجیح دی تو میرے نانا فرمانے لگے کہ میدانی علاقہ تو تم پیدل چل لو گے مگر پہاڑ پر تو گدھے کے بغیر گزارہ نہ ہو سکے گا۔ تاہم میرے نانا صاحب نے گاؤں میں سے کسی سے خچر مانگا اور مجھے پہاڑ پر لے گئے۔ جب ہم پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگے تو وہی کوہ سُلیمان جو دُور سے سیاہ و سفید پتھروں کے ٹیلے نظر آتا تھا۔ بہت ہی اچھا لگنے لگا۔ جگہ جگہ محفوظ جگہوں پر بلوچوں نے

ایک سو تہتر

مکانات بنا رکھے تھے۔ بھیڑیں اور دُنبے اس کثرت سے تھے کہ مَیں نے اپنی زندگی بھر کبھی اتنی کثیر تعداد میں نہیں دیکھے۔ جہاں بھی کوئی ہموار جگہ ہوتی بلوچیوں نے وہیں کچھ نہ کچھ بو رکھا تھا۔ پہاڑ پر چشمہ مَیں نے پہلی بار دیکھا۔ ہر بلوچی اپنی زبان میں میرے نانا صاحب سے میرے بارے میں دریافت کرتا۔ گو مَیں اُن کی زبان نہیں سمجھتا مگر اُن کی گفتگو کے انداز سے مَیں بہت کچھ سمجھ لیتا تھا۔ بہر کیف پہاڑی علاقہ میں پانچ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے نانا نے ایک بلوچی کے ہاں دو گدھوں پر لدا ہوا سامان اُتارا اور مجھے بھی خچر سے اتار کر ایک چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ مَیں نے اپنی زندگی میں خچر پر پہلی مرتبہ اتنا سفر کیا تھا۔ کچھ دیر تک تو میری ٹانگیں سیدھی نہ ہو سکیں۔ میرے نانا صاحب نے گُڑ سے بنی ہوئی مٹھائی کھانے کو دی اور پہاڑی چشمہ کا پانی پیا۔ اس وقت گڑ کی مٹھائی نے جو لُطف دیا وہ پھر گھنٹے والے حلوائی کی مٹھائی میں بھی نہ مل سکا۔ سرِ شام بلوچی میزبان نے ایک دُنبہ ذبح کیا اور گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو صاف کر کے دُنبے کی کھال میں ہی رکھ کر اس میں چاول اور مصالحے وغیرہ بھر کر ایک گڑھے میں اُپلے جلا کر رکھ دیا۔ اور گڑھے کو مٹی سے بند کر دیا گیا۔ تین گھنٹے بعد جب دُنبے کا گوشت اور چاول کھانے کو دیے گئے تو وہ کسی دوسرے جہان کی نعمت لگ رہا تھا۔ ایسا لذیذ گوشت اور چاول پھر مَیں نے زندگی میں نہیں کھائے۔ یہ بلوچی باشندے بڑے جی دار اور بہت اچھے نشانہ باز ہوتے ہیں۔ جب کبھی ان کی فصلیں تباہ ہو گئیں تو یہ بھوکے مرنے کی بجائے لُوٹ مار کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر لوٹتے ہندوؤں کو ہی تھے۔ اول تو وہاں کے مسلمانوں کے پاس کچھ ہوتا بھی نہیں تھا۔ دوسرے مذہبی طور پر کافروں کو لوٹنا گناہ نہیں سمجھتے تھے مگر اُن کے اس اخلاق کی داد دینی ہو گی کہ کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

ایک مرتبہ فورٹ سنڈے مین سے ڈیرہ غازی خاں آ رہی بس پر خاصی بلندی سے ایک بلوچی نے ایسا نشانہ لگایا کہ بندوق کی گولی نے بس کا ٹائر اُڑا دیا۔ اور کئی بلوچی بس کے مسافروں کو لوٹنے کے لیے آناً فاناً جمع ہو گئے۔ جس شخص نے کلمہ پڑھ دیا خواہ وہ ہندو ہی کیوں نہ ہو (اکثر ہندوؤں نے بھی کلمہ پڑھنا سیکھ رکھا تھا تاکہ ایسے بُرے وقت پر جان و مال بچانے کے لیے کام آ سکے) اسے کچھ نہ کہا جاتا اور باقی لوگوں سے کہا جاتا کہ جو کچھ نقد روپیہ زیورات وغیرہ ہیں وہ از خود دے دو۔ اگر کسی نے مزاحمت کی تو وہ بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ (عام طور پر مقابلہ ہو جاتا تھا کیونکہ وہاں کے ہندو بھی تو آخر اسی مٹی کے بنے ہوئے تھے) مگر کسی بھی ہندو عورت کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ بڑی حلیمی سے کہتے تھے کہ زیور اُتار کر خود ہی دے دو۔ اگر حلیمی سے بات نہ بنتی تو وہ ڈراتے دھمکاتے مگر نہ تو حملہ کرتے اور نہ ہی ہاتھ لگاتے۔ اگر کسی عورت نے دل کڑا رکھا اور چُپ چاپ کھڑی رہی تو یہ بلوچی اسے بغیر لُوٹے چلے جاتے تھے۔ اس بس میں بھی دو ہندو عورتیں سفر کر رہی تھیں اور اُن کے پاس زیورات بھی خاصے تھے۔ ان بلوچیوں نے سب ترکیبیں کریں مگر عورتیں ٹس سے مَس نہ ہوئیں۔ تو ایک بلوچی نے کہا کہ اگر تم نے زیورات نہ دیے تو تمہارے شوہروں کو بندوق کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ ان عورتوں نے جواب دیا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو خدا اور رسول تمہیں کبھی معاف نہ کریں گے اور تمہاری عورتیں بھی بیوہ ہو جائیں گی۔ یہ سُن کر بلوچی چُپ چاپ چلے گئے۔

چھوٹے چھوٹے گاؤں دو دو چار چار سالوں کے وقفہ سے ان بلوچیوں کے شب خُون کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ مگر قصبہ دہوا جو تونسہ شریف سے تیس میل کے فاصلہ پر ڈیرہ اسماعیل خاں کی شاہراہ پر واقع ہے اکثر و بیشتر ان بلوچیوں کی دست برد کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔ کیونکہ اس قصبہ میں مالدار ہندوؤں کی خاصی تعداد تھی۔ ایک مرتبہ دہوا پر بلوچیوں نے شب خُون مارا تو ایک ہندو دوکاندار نے باہر آ کر ایک بلوچی لیڈر سے کہا کہ اُس کے بیٹے کی بیوی کو بچہ ہونے والا ہے اور وہ دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے۔ دائی اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ بندوقوں کی آواز سے اس کی بہو گھبرا رہی ہے۔ اسے

ایک سو چوہتر

بلوچی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس مکان کے آس پاس کوئی بندوق نہ داغی جائے اور خود اس ہندو کے مکان کے باہر پہرہ دینے لگا تاکہ کوئی دوسرا بلوچی لوٹنے نہ آجائے۔ اس ہندو نے صبح چار بجے جب یہ لٹیرے جانے لگے تو اس بلوچی کو پانچ صد روپے دیے جو اس نے لینے سے انکار کر دیا کہ ہم خیرات نہیں لیتے پھر کسی وقت لوٹ کر لے جائیں گے۔

ایک مرتبہ کچھ بلوچیوں نے چار مالدار ہندوؤں کے لڑکوں کو یرغمال بنایا ان لڑکوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے ہوئے اعلانیہ اُن کے ماں باپ سے کہہ گئے کہ دس دس ہزار روپیہ دے جانا اور اپنے لڑکے کو لے جانا۔ پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے جب صبح ہوئی تو ان بلوچیوں میں سے ایک لٹیرا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ ایک لڑکے کو چھوڑ دیا جائے۔ ساتھیوں نے جواب دیا کہ یہی لڑکا تو سب سے بڑے مالدار کا بیٹا ہے اسے کیسے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر اس لٹیرے نے کہا کہ آج کی لوٹ میں جو میرا حصہ ہو وہ مجھے نہ دینا مگر اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر بھی دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ تو تو پاگل ہو گیا ہے ہم نہیں۔ اسے ہم ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ اس بلوچی لٹیرے نے بندوق اُٹھالی اور کہا کہ پھر ہم سب کو آپس میں لڑنا ہوگا اور یا اسے چھوڑنا ہوگا۔ آخر کار لٹیروں نے فیصلہ کیا کہ آج کی لوٹ میں اسے کچھ نہیں دیا جائے گا اور اس ہندو لڑکے کو چھوڑ دیا گیا۔

یہ ہندو لڑکا سارا دن بھوکا پیاسا پیدل چلتے ہوئے واپس گھر آیا تو شام ہو چکی تھی مگر سارے قصبہ میں شور مچ گیا کہ فلاں لڑکا واپس آگیا۔ فوراً پولیس انچارج نے اُس لڑکے کو بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ تمہیں کیسے رہا کر دیا گیا۔ اُس ہندو لڑکے نے بتایا کہ کچھ روز پہلے ایک بلوچی نے میرے پڑوس والی دوکان سے کپڑا خریدا تھا۔ جب کپڑے کی رقم یہ بلوچی دوکاندار کو ادا کرنے لگا تو ایک آنہ کم تھا۔ دُکاندار نے کہا کہ وہ ایک آنے کا اُدھار نہیں کرے گا اور کپڑا اٹھا کر دوکاندار نے اندر پھینک دیا۔ جس پر یہ بلوچی بڑا پریشان تھا۔ میں نے اس بلوچی سے اس کی پریشانی کا سبب دریافت کیا تو اُس نے بتایا کہ اُسے کپڑے کی اشد ضرورت ہے اور اُس کے پاس صرف ایک آنے کی رقم کم ہے جس کی وجہ سے دوکاندار اُس کو کپڑا نہیں دے رہا (یاد رہے کہ اُن دنوں اڑھائی آنے گز بہترین کپڑا ملتا تھا) لہٰذا میں نے اسے ایک آنہ دے دیا کہ جب اگلی بار آؤ تو مجھے ایک آنہ واپس دے دینا۔ اس بلوچی نے نہایت تشکر آمیز نظروں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک آنہ مجھ سے لے کر دوسرے دوکاندار کو دیا اور کپڑا لے کر چلا گیا۔ اور اسی بلوچی نے مجھے پہچان لیا اور وہ اپنے ساتھیوں سے لڑنے مرنے کو تیار ہو گیا کہ اسے رہا کر دیا جائے اور میں اُس ایک آنہ کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔

ایک مرتبہ کسی بلوچی نے مُخبری کی کہ فلاں رات کو شب خون مارا جائے گا۔ دھوا کے پولیس انچارج نے ڈیرہ غازی خاں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اطلاع دی۔ انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس خاصی نفری میں پولیس کے جوان ساتھ لے کر دھوا پہنچ گیا اور بڑی رازداری کے ساتھ دھوا میں ڈیرہ ڈال دیا اور اسی رات بلوچیوں نے اپنے پروگرام کے مُطابق شب خون مارا۔ اور یہ سپرنٹنڈنٹ اپنے جوانوں کے ساتھ مُقابلے پر آیا۔ کسی بلوچی کی پہلی گولی سے ہی انگریز صاحب بہادر کا ٹوپ (ہیٹ) ہوا میں اُڑتا ہوا نظر آیا اور صاحب بہادر نے دوکان کے آگے لگے ہوئے لکڑی کے پھٹے کے نیچے چھپ کر جان بچائی۔ ایک گھنٹہ کے مقابلہ کے بعد بلوچی حملہ آور رات کی تاریکی میں فرار ہو گئے مگر پولیس کے جوان بلوچی حملہ آوروں کی نسبت زیادہ ہلاک ہو گئے اور زخمی بھی، چونکہ انگریزی حکومت ان بلوچیوں پر ہوائی جہازوں سے بم برساتی تھی اس لیے یہ لوگ انگریز کو سوڑے سے بھی زیادہ بدتر سمجھتے تھے۔ اور یہ ناممکن تھا کہ کسی بلوچی کو کہیں انگریز نظر آجائے اور وہ اس پر بندوق نہ داغے۔ دیسی بندوقوں سے یہ لوگ ہوائی جہازوں کو نشانہ بنا کر گرا دیتے تھے۔

یہ بلوچی اس قول کی منہ بولتی تفسیر تھے کہ جس قوم کے افراد نے جنسی طور پر بلند اخلاقی کا ثبوت دیا اُسے کوئی نہیں ہرا سکتا اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلوچیوں کو نہ تو انگریزی حکومت مغلوب کر سکی اور نہ ہی اب پاکستانی حکومت انھیں اپنا غلام بنا سکی ہے۔ کیونکہ یہ بلوچی بیشک بھوکے مرنے کی نسبت لوٹ لینے کو ترجیح دیتے تھے مگر ان کی بلند اخلاقی کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ قول و قرار کے پکّے۔ کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا خواہ وہ غیر مذہب کی ہو اور لوٹ مار کے وقت بھی کسی عورت کو اُنگلی تک نہ لگانا۔ مختی اتنے کہ سنگ ریزوں میں فصلیں اُگائیں۔ اور اخلاق کے اتنے اونچے کہ احسان فراموشی کو گناہِ عظیم سمجھیں۔ کسی غیر عورت کو اُنگلی لگانے کو جہنم کی آگ میں جلنا سمجھیں۔ قرض کی ادائیگی کو اپنا فرض سمجھیں حالانکہ قرض دینے والوں کی لوٹ کا یہ حال تھا کہ دس روپے کا سامان قرض دے کر ایک سو روپیہ وصول کر لینے کے بعد بھی اُن کے اکیس روپیہ بقایا نکلتے تھے۔ اتنے سچے کہ جھوٹ کا لفظ ہی نہیں جانتے تھے۔ بہادر اتنے کہ اپنی جان کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے رہتے۔ جب کسی قوم کے افراد میں یہ اوصاف ہوں تو بھوکے مرنے کی نسبت لوٹ مار بُرا نہ سمجھنے کو بھی ان کا ایک وصف ہی سمجھا جائے گا۔ کیونکہ بھیک مانگنے سے کسی کٹورے مالدار کو لوٹ لینا کہیں بہتر ہے۔

آج بھی جب ان بلوچیوں کی بلند اخلاقی یاد آتی ہے تو از خود زبان سے ان کی تعریف میں کلمات نکلتے ہیں۔ خدا کرے کہ اب یہ لوگ آسودہ حال ہوں۔ کیونکہ اب وہ مسلمانوں کو تو لوٹ نہیں سکتے۔

"یقین ہے کہ یہاں سے کچھ یادیں پیچھا کریں گی اور کچھ چہرے ساتھ جائیں گے اور بہت دنوں تک خیال و خواب کی دُنیا میں اُن سے رونق اور کشمکش رہے گی۔ پھر وقت کے تقاضے ان پر نقاب ڈالیں گے، انھیں دھندلا کریں گے مٹائیں گے اور میں حالات کے مطابق انھیں بھلاتا اور یاد کرتا رہوں گا۔"

—— پروفیسر احتشام حسین
ساحل و سمندر

بے برگ و شجر راہ گزر

اٹھارہ

میں ——— بادِ بہاری بنی غسل خانہ سے برآمد ہوئیں تو بناوٹی طور پر بڑی حیرت سے دریافت کرنے لگیں۔ سرور صاحب کیسے تشریف لانا ہوا۔ عرض کیا آج کل آپ کے عاشقوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سوچا ہم بھی قسمت آزمائی کر کے دیکھیں۔ یہ سنتے ہی ان صاحبہ نے جو مسلسل قہقہے لگائے ہیں۔ وہ غمازی کر رہے تھے کہ وہ ان ہوائی عاشقوں کی حماقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ملازم کو چائے لانے کا حکم دے کر جوتوں کے اسٹینڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ان شاعر صاحب سے نہایت التفات سے کہنے لگیں . . . آج تو ہم آپ کی نظر انتخاب کا امتحان لیں گے لہٰذا فرمایئے اس لباس کے ساتھ ہم کون سا جوتا پہنیں۔ یہ اعزاز پانے پر شاعر صاحب نے اسٹینڈ پر رکھے پچاسوں مختلف قسم کے جوتوں پر یوں محققانہ نظر ڈالی جیسے ڈاکٹر اقبال پر ریسرچ کر رہے ہوں۔ کم و بیش دس منٹ لی گہری دیکھ بھال کے بعد شاعر صاحب ایک سینڈل کی طرف انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے فرمانے لگے: بیگم صاحبہ مجھے مشکل سے مشکل زمین میں بھی غزل کہتے ہوئے اتنی فکر کی ضرورت نہیں ہوئی جتنی آج آپ کے اس لباس سے میچ کرتے ہوئے جوتے کے انتخاب کے لیے۔ بیگم صاحبہ نے ان شاعر صاحب کے حسنِ انتخاب کی داد دیتے ہوئے زہد شکن انداز میں فرمایا۔ ذرا اسے اسٹینڈ سے اٹھا کر ہمیں دے دیجیے۔ عشق نے حسن کا یہ فرمان پاکر کشاں کشاں یہ سینڈل اٹھا کر حسن کے قدموں کے قریب لا کر رکھ دی اور حسن نے اپنی غزالی آنکھوں کو گھماتے ہوئے مجھے دیکھا اور میں ان شاعر صاحب کے اس سینڈلی ریسرچ اور ہوائی عشق پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا لپٹن گرین لیبل چائے کی خوش گوار چسکیاں لینے لگا۔ یہ صاحب ان صاحبہ کا عطا کردہ رومال ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے اور فخریہ رومال کو دکھایا کرتے تھے۔

ایک اور شاعر جو خدا کے فضل سے ایک دو نہیں سینکڑوں قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں ان صاحبہ سے دل ہی دل میں عشق کرنے لگے اور ہر روز وقت مقررہ پر ان کے ہاں حاضری دینا ان کا معمول بن گیا۔ یہ صاحب تشریف لاتے اور گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے۔ اگر بیگم صاحبہ کے فرمان پر ملازم نے چائے لا دی تو انھوں نے شکریہ کے ساتھ پی لی۔ اگر کسی دن چائے کے ساتھ مٹھائی یا بسکٹ مل گئے تو یہ شاعر صاحب دل ہی دل میں سمجھتے کہ ان کی خاموش وَن وے محبت اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد بیگم صاحبہ کو شرارت سوجھی تو انھوں نے ملائمت سے پوچھا اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو بیئر پیش کی جائے۔ شاعر صاحب نے سمجھا حسن پر عشق کا جادو چل گیا ہے۔ فرمانے لگے: جو آپ کا دل چاہے پلا دیجیے۔ شاعر صاحب بیئر تو کیا جس زمانے میں جانی واکر سولہ روپے کی بوتل ملا کرتی تھی تب سے پینے پلانے کے آداب سے واقف تھے۔ بیئر کا گلاس جو سامنے آیا تو فرمانے لگے اگر اس میں تھوڑی سی وسکی بھی ڈال دی جائے تو بیئر کاک ٹیل کا مزہ دے جائے گی۔

بیگم صاحبہ کی چھٹی حس پھڑکی، اور انھوں نے یکے بعد دیگرے چار پیگ وسکی کے پلا دیے ان شاعر صاحب کو۔ اور جب شراب کے نشے کے باعث شاعر صاحب کے کالے رنگ میں اور گہرا پن آنے لگا تو بیگم صاحب نے کسی قدر دلکش انداز میں دریافت فرمایا . . . صاحب آپ ہر روز تشریف لاتے ہیں۔ کوئی بات تک نہیں کرتے اگر کوئی ضرورت ہو اور میں آپ کے کام آسکوں تو حکم کیجیے میں حاضر ہوں۔ شاعر صاحب نے موقع غنیمت جانا اور مینا کی سی نرم اور لطیف زبان میں گزارش کی "مجھے آپ اچھی لگتی ہیں۔" بیگم صاحبہ نے یہ سنا تو اپنے غصّہ کو بڑی مشکل سے احاطۂ ضبط میں رکھتے ہوئے ملازم سے بولیں۔ ان کو باہر کا راستہ دکھا دو اور کہہ دو پھر یہاں بھولے سے بھی تشریف نہ لائیں۔

شراب نوشی اچھی ہے یا بُری اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں، مگر میرا ذاتی تجربہ شراب نوشی کے بارے میں یہ ہے کہ اگر آپ کی جیب شراب نوشی کی عادت کو تسکین دینے کی اجازت آسودگی سے دیتی ہے تو آپ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی جسارت کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ آپ کی جیب شراب نوشی کی متحمل نہیں ہو سکتی اور آپ کو شراب کی لت پڑ چکی ہے تو پھر دُنیا کی ہر لعنت آپ کے استقبال کے لیے بے قرار ملے گی۔ جھوٹ۔ دھوکہ۔ فریب۔ چوری۔ ایسی بدعتیں تو معمولی نوعیت کی ہیں۔ شراب نوشی کی لت تو بیوی۔ بیٹی حتیٰ کہ بہن سے بھی پیشہ کرانے کو بھی بُرا نہیں سمجھتی۔ شراب کے ایک جام کی خاطر "دلالی" کا فرض انجام دیتے ہوئے اکثر عادی شراب نوشوں کو دیکھا گیا ہے۔ بے غیرتی۔ خود غرضی۔ اور جنسی بے راہ روی خراب کی خاص خاصیتیں ہیں۔

نریش کمار شاد دانشوری کی مضبوط قدروں کا مالک تھا مگر شراب نوشی کی لت کے باعث اُسے خودکشی کرنی پڑی یا خودکشی کے پردے میں وہ موت سے ہم کنار کر دیا گیا۔ شاید ہی دلّی کا کوئی ایسا کھاتا پیتا آدمی ہو گا جسے ہاں نریش کمار نے یہ کہہ کر روپیہ نہ اینٹھا ہو کہ اس کا اکلوتا بیٹا ایکسی ڈنٹ میں موت کا شکار ہو گیا ہے۔ (خدا اس بچے کو عمر طویل دے) لہٰذا اُس کے کفن دفن کے لیے مدد کی جائے۔ اور اس قابل عبرت جھوٹ سے حاصل کیا ہوا روپیہ شراب نوشی کی نذر ہوتا۔ اور جن بدسے بدترین مناظر میں دہلی کے عوام ہی نہیں مُلک کے اکثر مقامات پر نریش کمار شاد کو دیکھا گیا۔ اس کی تفصیل میں جانا کوئی خوشگوار فریضہ نہیں ہو گا۔

بدیع الزماں خاور بانکوٹی دفتر شانِ ہند میں میرے ساتھی تھے۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ وہ شراب کی لت میں اس بُری طرح سے غرق ہو چکے ہیں کہ وہ چوری۔ خیانت۔ بددیانتی اور جھوٹ بولنے کو کوئی بُرائی ہی نہیں سمجھتے۔ ایک اچھا شاعر، اچھا نقاد اور تمام دفتری کام پر پوری طرح حاوی خاور بانکوٹی جب شراب کی لت کے باعث دفتر سے کتابیں چوری کر کے بازار میں فروخت کرتا یا دفتری ادائیگیوں میں ہیر پھیر کرتا اور کاتب سے ایک روپیہ اُدھار مانگ کر بھی شراب پیتا تو مجھ ایسا ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک بھی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا۔ آخر کار انھیں دہلی سے بانکوٹ پہنچایا گیا۔ کیونکہ وہ شراب نوشی کے باعث مقروض ہونے کے ساتھ ساتھ بددیانتی کے باعث ہزار ہا روپیہ غبن کر چکے تھے۔ اور دلّی کی سنٹرل جیل اُن کی تشریف آوری کی منتظر ہی تھی کہ میں نے انھیں بانکوٹ پہنچا دیا۔ خدا کا کرم ہے کہ اب خاور صاحب نے شراب نوشی سے توبہ کر لی ہے۔

ایک مشاعرہ کو جناب آغا امیر قزلباش نے میری سفارش پر نظم کہہ دی۔ جس کا معاوضہ نظم کی پسندیدگی پر ادا ہوتا

تھا۔ یہ متشاعر دلّی سے باہر رہتے تھے۔ ایک شام کو راقم الحروف ناز ہوٹل جامع مسجد میں کسی بیرونی دوست سے مُلاقات کے لیے گیا تو ابھی سیڑھیوں میں ہی تھا کہ پیچھے سے آغا ایئر قزلباش نے ہانپتے ہوئے آواز دی۔ سرور صاحب ایک منٹ میری بات سُنیے دیکھا تو قزلباش کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور پریشانی کی ہر حواس باختگی ان کے حسین وجمیل چہرے کو ایسے مضمحل کیے ہوئے تھی کہ شاید ابھی ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ عرض کیا کہ فرمایئے کیا بات ہے۔ فرمانے لگے کہ میرے لڑکے کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے اور ڈاکٹر اُس کی ڈریسنگ کر رہا ہے اسی وقت دس روپے چاہئیں۔ دس روپے اُن کی خدمت میں فوراً پیش کر دیے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ ابھی تو اس کی شادی ہی نہیں ہوئی تو لڑکا کہاں سے آگیا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ یہ ڈرامہ محض شراب کی لت پوری کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

میرے ایک ملنے والے صاحب تھے جناب عاجز صاحب۔ یہ ملٹری کے کسی دفتر میں مُلازم تھے۔ جہاں سے یہ ملٹری کینٹین سے رَم کی بوتل سستے داموں لاکر دوستوں کو ممنون کیا کرتے تھے۔ جن حضرات کو یہ رَم ارزاں داموں پر دیتے تھے وہ اخلاقاً اور یہ سلسلہ جاری رہنے کے لالچ میں عاجز صاحب کو مفت رَم پلاتے تھے۔ عاجز صاحب سے سستے داموں شراب لینے والے حضرات عیاش طبع تھے اور وہ پیشہ ور عورتوں کو بھی بُلاتے تھے۔ مُفت کی شراب پیتے پیتے عاجز صاحب کو شراب کی لت پڑ گئی اور انھوں نے شراب نوشی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ان پیشہ ور عورتوں سے راہ ورسم پیدا کر لی جن کو عاجز صاحب کے دوست بُلایا کرتے تھے۔ لہٰذا اب یہ نیک کام عاجز صاحب نے انجام دینا شروع کر دیا یعنی اپنے خوش طبع کھاتے پیتے دوستوں کو ان پیشہ ور عورتوں کو سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ اس سے انھیں مُفت کی شراب تو ملتی ہی تھی کمیشن میں مُفت کی عیاشی بھی مل جاتی تھی۔ اور ہمارے دیکھتے دیکھتے مُفت کی شراب پینے کی عادت نے عاجز صاحب ایسے معقول آدمی کو مُفت عیاشی کے چسکے پر ڈال دیا اور یہ چسکا انھیں باقاعدہ ایک پیشہ ور دلال کے روپ میں لے آیا اور اسی بدنامی کے عالم میں ہی عاجز صاحب چل بسے۔

اکثر عیار مالکان اپنے ہاں کی مُلازم لڑکیوں کو کوکا کولا یا دوسرے مشروبات میں بغیر بتائے شراب کی معمولی مقدار ملا کر پلاتے رہتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ شراب کی مقدار میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ لڑکیاں نادانستہ طور پر شراب کی عادی ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ مالکان انھیں بتا کر پلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سو دو سو یا تین سو روپیہ ماہانہ پانے والی لڑکیاں گرہ سے خرید کر شراب کیسے پی سکتی ہیں اور عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے مالکان کی شیطانی خواہشات کو پورا کر کے شراب کی لت پوری کرتی ہیں۔ دہلی میں ایسی ہزاروں لڑکیاں ہیں جنھیں اُن کے مالکان نے شراب کی لت لگائی اور آج وہ شراب نوشی کے لیے اپنی عزت کو نیلام کر رہی ہیں۔ سردار..... سنگھ جو ایک ہندی رسالے کے ایڈیٹر تھے اور معموں کے باعث لکھ پتی ہو گئے تھے۔ اُن کے ہاں کچھ لڑکیاں کام کیا کرتی تھیں، انھوں نے اپنے ملازم کو رازدار بنا رکھا تھا کہ جب بھی وہ کوکا کولا منگایا کریں تو وہ دوسرے کمرے میں بوتلیں کھول کر ان بوتلوں میں سے کچھ پانی نکال کر شراب ڈال دیا کرے (صرف ان بوتلوں میں جو صرف لڑکیوں کو دی جانی ہوں) اسی طرح وہ دن میں تین چار مرتبہ اپنے سارے سٹاف کو کوکا کولا پلاتے۔ سٹاف خوش تھا کہ مالک کس قدر فراخ دل ہے اور مالک اپنی چال پر تھا کہ لڑکیاں شراب کی عادی ہو جائیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ سردار صاحب دانستہ طور پر ان لڑکیوں کے میز پر ہندی کی فحش کتابیں "بھانگ کی پکوڑی" وغیرہ رکھ دیتے تھے اور خود دفتر سے باہر

ایک سوانحی

کسی کام کے بہانے چلے جاتے تھے تاکہ یہ لڑکیاں ان فحش کتابوں کو پڑھ سکیں۔ ان کتابوں میں ننگی تصویریں اور ایسی فحش کہانیاں ہوتی تھیں کہ جنھیں پڑھ کر لڑکیاں اپنے شہوانی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تھیں۔ اور نتیجہ میں شام کو جاتے وقت کوئی نہ کوئی لڑکی سردار صاحب کے ساتھ موٹر میں لفٹ کے بہانے بیٹھ جاتی اور سردار صاحب نے اسی طرح اپنے دفتر کی تمام ملازم لڑکیوں کی عزت لوٹی۔

ایک صاحبہ جن کی جوانی نے نصف دلّی کو تڑپا رکھا تھا۔ شراب کی اس قدر رسیا تھیں کہ پوری بوتل پی جانے کے بعد بھی ہوش وحواس قائم رکھتی تھیں۔ جب اُن کی جوانی ڈھل گئی اور آمدنی کے ذرائع کم ہونے لگے تو مجبوراً چوں پیر شود پیشہ کند دلالی کے مصداق انھوں نے محلّے کی کچھ خوبصورت لڑکیوں سے دوستانہ تعلقات بنائے اور انھوں نے یہی نسخہ آزمایا کہ ان لڑکیوں کو کوکا کولا میں شراب مِلا کر پلاتی رہیں اور رفتہ رفتہ ان لڑکیوں کو اُن "محترمہ" کے ہاں کے کوکا کولا میں عجیب کیف ومستی کا سرور آنے لگا اور جب تک یہ لڑکیاں دن میں چار بار اُن کے ہاں آکر کوکا کولا نہ پئیں انھیں چین نہ پڑتا تھا۔ اور پھر انھوں نے ان لڑکیوں کو بتا دیا کہ کوکا کولا میں شراب ملی ہوتی ہے اور آپ جب تک شراب نہ پیا کریں گی تو بے چین رہا کریں گی۔ آخر کار ان لڑکیوں نے اپنی بے چینی مٹانے کے لیے مُفت کی شراب حاصل کرنے کے لیے اس حرّافہ کے کہنے پر انہی کے سابقہ عاشقان کو سپلائی ہونا شروع کیا جس سے ان صاحبہ کا روزگار چل نکلا اور ان لڑکیوں کو شراب آسانی سے مل جاتی۔

محلہ ناری کا ناکہ جے پور میں ایک ریٹائرڈ پرنسپل اپنی ٹیچر بیوی کے پاس آئے ہوئے تھے۔ (پرنسپل صاحب کی شراب نوشی سے تنگ آکر اُن کی معمر بیوی نے اُن سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور کسی سکول میں پڑھاتی تھیں) ان پرنسپل صاحب کی ایک لڑکی کرشن نگر دہلی میں بیاہی ہوئی تھی جسے مَیں نے ایک مصیبت سے رہائی دلائی تھی اور یہ لڑکی اپنی ماں کے پاس ہی رہتی تھی۔ مَیں جب بھی جے پور جاتا تو اس لڑکی کو دیکھنے ضرور جاتا کیونکہ یہ لڑکی مجھے اپنے باپ سے بھی زیادہ عزت دیتی تھی۔ ایک دن مَیں اس لڑکی سے ملنے ناری کا ناکہ جے پور گیا تو دیکھا کہ پرنسپل صاحب اپنی چھوٹی لڑکی جو ہائر سکنڈری میں پڑھ رہی تھی کو پڑھا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد پرنسپل صاحب نے چند پیسے اپنی چھوٹی بیٹی کو دیے کہ انھیں بیڑی لادے۔ وہ بیڑی لینے گئی۔ پرنسپل صاحب کی بیوی اور بڑی بیٹی میرے ساتھ بات چیت کر رہی تھیں۔ پرنسپل صاحب نے موقع غنیمت جانا اور بچّی کی کتابیں اُٹھا کر رفوچکر ہو گئے اور یہ کتابیں فروخت کرکے شراب پی۔ پرنسپل صاحب کی بیوی نے روتے ہوئے سب حال مجھے بتایا۔ بڑی کھوج کے بعد پتہ چلا کہ انھوں نے یہ کتابیں صرف تین روپیہ میں فروخت کیں اور کچّی شراب پی۔ جب کہ یہ کتابیں ساٹھ ستر روپے کی تھیں۔ جس شخص نے یہ کتابیں خریدی تھیں وہ لڑکی کی ماں کے آنسو نہ دیکھ سکا۔ اور تین روپے لے کر اُس نے کتابیں لوٹا دیں۔

لکھنؤ کی ایک متشاعرہ (جو محض خوش گلوئی کے صدقے میں شاعرہ بنا دی گئی ہیں) کے والدِ نامحترم شراب نوشی کے باعث اس حد تک بے غیرت بن چکے ہیں کہ یہ نام نہاد شاعرہ جہاں بھی مدعو کی جاتی ہیں منتظمین مشاعرہ ان کے والد کو شراب اس کثرت سے پلاتے ہیں کہ انھیں اس کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ ان کی صاحبزادی کیا کچھ کر رہی ہیں چنانچہ اس شاعرہ کو اُردو مشاعروں اور ہندی کوی سمیلنوں میں کثرت سے اسی لیے بلایا جاتا ہے کہ ان کے والد محض شراب نوشی کے عوض دلالی کے فرائض بخوبی انجام دیتے ہیں اور یہ شاعرہ منہ مانگے معاوضہ کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ پریکٹس سے مزید معقول روپیہ کما لیتی ہیں۔

پاکستان کی مشہور شاعرہ پروین شاکر صاحبہ ہندوستان تشریف لائیں۔ تو انھوں نے گفتار۔ کردار۔ کلام اور حسنِ اخلاق

ے نسوانی وقار کو جِلا بخشی اور پاکستانی شاعرہ کی حیثیت سے پاکستان کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔

مگر پچھلے دنوں دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرہ میں ایک دوسری پاکستانی سرکردہ شاعرہ تشریف لائیں تو محض اُن کی شراب نوشی کے باعث بے شک وہ بلبلِ ہزار داستان تو بن گئیں مگر افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے مُلک کا وہ وقار قائم نہ رکھا جسے پروین شاکر صاحبہ نے ہر قدم پر مقدم سمجھا۔ پاکستان کے ہی شاعر کئی ماہ ہندوستان میں رہے اور انھوں نے مشاعرے پڑھنے کے لیے ہر ممکن حربے استعمال کر کے دعوت نامے حاصل کیے اور بڑے طمطراق سے ہر مشاعرہ میں یہ کہتے رہے کہ پاکستان میں اُن کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے مگر شراب نوشی کے لیے جو سفلہ پن مع بے غیرتی اور گداگری انھوں نے فرمائی اُسے دیکھتے ہوئے بیشک اِس کا یقین ہو گیا کہ ان اوصاف میں واقعی پاکستان کا کوئی شاعر اُن کی ٹکر کا نہیں۔

■■

"انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنا ہی وہ اس کی فطرت کے ایسے پہلوؤں کو دیکھنے کے لیے بے چین رہے گا جو اس بڑے آدمی کو عام انسانی سطح پر لاتے ہیں۔"

—— انیسہ الطاف فاطمہ

اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقا

بھوکے عاشق

جون ۱۹۵۷ء کی کوئی تاریخ تھی کہ صبح سات بجے ایک نوجوان آیا اور خالص جن سنگھی انداز میں نمسکار کرنے کے بعد مُسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ انکل مجھے پہچانا۔ مَیں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اسے بغور دیکھا تو شکل جانی پہچانی لگی۔ مگر مَیں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ برخوردار مَیں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تو مُسکراتے ہوئے اس نوجوان نے کہا کہ قنوج میں سیٹھ چندر گپت صاحب چیرمین میونسپل بورڈ کے ہاں آپ کی اور آنٹی کی سیوا کون کرتا تھا۔ فوراً اپنا عزیز دوست سیٹھ چندر گپت اور ان کی دونوں بیویاں (جو سگی بہنیں ہیں) اور ان کی طویل وعریض کوٹھی اور اس نوجوان کا خیال آیا اور مَیں نے خضوع وخشوع سے اس نوجوان کو گلے لگایا اور رُدّی کو آواز دی کہ دیکھو سیٹھ چندر گپت جی کے عزیز آئے ہیں، ردجی نے فوراً ناشتہ تیار کیا اور ہم سب نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں ناشتہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں معاً مَیں نے نوجوان سے پوچھا کہ تمہارا سامان کہاں ہے۔ انکل میرے ساتھ کچھ دوست تھے اس لیے لکھنؤ سے صبح دہلی پہنچتے ہی مہاراجہ ہوٹل میں ہم نے کمرہ لے لیا ہے۔ وہ لوگ تو وہیں ہیں اور مَیں اپنے انکل اور آنٹی سے ملنے چلا آیا۔ سیٹھ چندر گپت صاحب سے میرے تعلّقات سگے بھائی جیسے ہیں اس لیے مَیں نے اُس نوجوان کو کہا کہ سیٹھ جی کو جب یہ معلوم ہوگا کہ تو دہلی میں ہوٹل میں رہا تو وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ تمہارے ساتھ دوست تھے تو کیا ہُوا ان کو بھی ساتھ لے آتے اور یہیں قیام کرتے۔ مگر نوجوان نے ٹال مٹول کر کے بات آئی گئی کردی۔

قنوج میں ۱۹۵۶ء میں ایک کُل ہند مشاعرہ میں مَیں نے اور رُدّی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد منتظمین نے چند منٹ میں ہی شامیانے اور دریاں لپیٹ کر ایسی چُپ سادھی کہ بیچارے شعراء حضرات زادِ راہ کے لیے بھی ترس گئے تھے یہ واقعہ غالباً شانِ ہند میں لکھا جاچکا ہے۔ اس وقت یہ نوجوان ہمیں قنوج میں ملا تھا۔ اور اُس نے کہا تھا کہ آپ دونوں کو میرے بہنوئی سیٹھ چندر گپت نے بُلایا ہے اور یہ نوجوان ہمیں سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ سیٹھ صاحب نے بتایا تھا کہ یہ نوجوان اُن کا دُور سے رشتے میں سالا لگتا ہے اور لکھنؤ میں رہتا ہے۔ ہمیں سیٹھ جی نے ایک ہفتہ تک اپنا مہمان رکھا اور یہ نوجوان ہر وقت ہماری خدمت کے لیے حاضر رہتا اس لیے ہم پر اس صاحبزادے کی خاطر مدارات لازم تھی۔

چند منٹ بعد یہ نوجوان کہنے لگا انکل آپ سے ایک پرائیوٹ بات کرنی ہے۔ کپڑے پہن لیجیے اور ذرا میرے ساتھ نیچے چلیے۔ مَیں نہا دھو کر آدھ گھنٹہ بعد اس نوجوان کو نیچے گولچہ سینما کے عنبر ریسٹورنٹ میں لے گیا اور کہا کہ یہاں کافی بھی پیو اور پرائیوٹ بات بھی کرو۔ میرا خیال تھا کہ اسے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوگی اور مَیں بخوشی دے سکتا ہوں۔

مگر اس نوجوان نے جب یہ بتایا کہ اُن کے ساتھ دو مسلمان لڑکیاں بھی ہیں جنھیں یہ اغوا کر کے لائے ہیں تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُن دنوں ..... مہاراجہ ہوٹل کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان حضرات کے پاس ہوٹل کے کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ اور ایسے بھوکے عاشقوں کی بیوقوف معشوقاؤں کے تو انتظار میں رہتے ہیں یہ ہوٹل والے۔ کافی کا پیالا جلدی جلدی اُنڈیلتے ہوئے مَیں نے اس نوجوان سے کہا کہ میرے ساتھ فوراً مہاراجہ ہوٹل چلو گو کچہ سینما کی سیڑھیاں اُتر کر مَیں اپنے گھر فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ پر آیا۔ کچھ روپے بیوی سے لیے اور سائیکل رکشا پر ہم دونوں نادلٹی سینما کے پاس مہاراجہ ہوٹل پہنچے۔ راستہ میں یہ لڑکا بڑے فخر سے کہتا رہا کہ مَیں نے اپنی جاتی کے لیے یہ کام کیا ہے کہ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ایک ہندو لڑکے سے کرا رہا ہوں۔ مگر مَیں سوچ رہا تھا کہ جاتی کا یہ رکھوالا کہیں جیل کی ہوا نہ کھائے۔ جونہی ہم ہوٹل پہنچے تو ہوٹل کے ملازمین نے مجھے جن مشکوک نگاہوں سے دیکھا وہ میرے لیے پہلا موقع تھا۔ جونہی میں جاتی کے رکھوالے کے کمرے میں داخل ہوا تو دونوں لڑکیوں اور دو مزید نوجوانوں نے بڑے احترام سے نمسکار کیا۔ مَیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چھوٹی لڑکی جو حُسن و شباب میں اپنا جواب آپ تھی ایک نوجوان کے کندھے سے اپنا گال لگا کر بیٹھی، اور دوسری لڑکی جو عمر میں چھوٹی لڑکی سے پانچ چھ برس بڑی تھی اور معمولی شکل و شباہت کی تھی وہ دوسرے نوجوان کے پاس بیٹھ گئی۔ مگر اُس کے بیٹھنے کے انداز میں کچھ لکھنوی شرم و حیا تھی۔ مَیں نے اپنے واقف نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا کہ کہیے مَیں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ اس پر بڑی لڑکی کہنے لگی چچا مَیں نے تو صبح سے چائے بھی نہیں پی، میرا تو سر گھوم رہا ہے۔ مَیں نے بیرے کو آواز دی اور کہا کہ فوراً ایک سیٹ چائے اور ناشتہ لائے۔ جب دونوں لڑکیوں اور دوسرے نوجوانوں نے ناشتہ کر لیا تو مَیں نے بڑی لڑکی سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم سچائی سے کام لوگی اس لیے تم بات سچ سچ بتا دو تاکہ تم لوگوں کے بارے میں سوچا جائے۔ لڑکی نے نہایت متانت سے سلسلۂ گفتگو جاری کرتے ہوئے بتایا کہ ہم دونوں سگی بہنیں ہیں میری شادی ہو چکی ہے۔ مگر میرا خاوند مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر چکا ہے اور میری چھوٹی بہن دسویں کلاس کی طالبہ علم ہے۔ یہ مسلمان لڑکا ہمارے پڑوس میں رہتا ہے اس نے کئی دنوں سے مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ مجھے چاہتا ہے اور میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس نے ہی یہ بھی بتایا کہ یہ دوسرا لڑکا جو کہ ہندو ہے میری اس چھوٹی بہن کو چاہتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسی مسلمان لڑکے نے میری موجودگی میں اپنے گھر پر اس ہندو لڑکے سے میری بہن کی کئی ملاقاتیں کرائیں اور دونوں نے شادی کرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اس ہندو نوجوان کا گھر ہمارے گھر سے ساتواں مکان ہے۔ میری بہن بخوشی ہندو بننے کے لیے تیار ہے۔ اس ہندو لڑکے نے ہم سے کہا کہ لکھنؤ میں تو میرے ماں باپ یہ شادی ہونے نہیں دیں گے، دہلی میں میرے رشتہ دار ہیں وہ بخوشی یہ شادی کرا دیں گے۔ لہٰذا ہم سب نے دہلی آنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس لڑکی نے اب میرے ننھا سا نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بھائی صاحب اس ہندو بھائی صاحب کے دوست ہیں انھوں نے ہم سب کو یقین دلایا تھا کہ دہلی میں سرور صاحب ایک اخبار کے ایڈیٹر ہیں مَیں اُن سے کہہ کر سب انتظام کرا دوں گا۔ اب یہ ہمیں اس ہوٹل میں بٹھا کر آپ کو لینے گئے اور آپ آ گئے ہیں۔ اب جیسا آپ مناسب سمجھیں اُس طرح سے ہم دونوں بہنوں کی شادی کرا دیجیے اور اب ہم کسی طرح بھی لوٹ کر گھر نہیں جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے بھائی ہم کو قتل کر دیں گے۔ مَیں نے ساری داستان سُن کر دوسری لڑکی سے جو ابھی تک اس ہندو نوجوان سے چپکی بیٹھی تھی دریافت کیا کہ کیا تم ہندو بننے کو تیار ہو۔ اُس نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا کہ کیا ہندو خدا کے بندے نہیں ہوتے۔ مسلمان جہیز مانگتے ہیں۔ ذات

برادری کی بات کرتے ہیں۔ کوئی لڑکا غریب مسلمان لڑکی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تو ایسی حالت میں اگر مجھے ایک ہندو لڑکا ملتا ہے جو نوجوان ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ اچھے گھر کا ہے۔ جہیز نہیں چاہتا۔ صرف مجھے چاہتا ہے تو مجھے ہندو ہونے میں کیا خدشہ ہے۔ اب میں نے اس ہندو لڑکے سے پوچھا کہ برخوردار تمہارا کیا ارادہ ہے۔ جھینپتے ہوئے کہنے لگا انکل جی آپ کی شرن میں آ گئے ہیں ہمارا کلیان کرا دیجیے اور میری شادی اس لڑکی سے کرا دیجیے (لڑکیوں اور نوجوانوں کے نام نادانستہ طور پر نہیں لکھے گئے) میں نے اس لڑکے کو یقین دلایا کہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم ایک مسلمان لڑکی کو اپنی جاتی میں لا رہے ہو اور اس سے شادی کر رہے ہو۔ میرے گھر کے سامنے ہی مندر ہے وہاں اس لڑکی کو شدھ کر کے آپ سے شادی کرا دیں گے۔ مگر شادی کے وقت کوئی بڑے بھی ہونے ضروری ہیں اس لڑکی کی تو بڑی بہن موجود ہے۔ تمہارے جو رشتہ دار دہلی میں ہیں اُن کا نام پتہ بتاؤ میں اُن کو لے آؤں۔ لڑکے نے بتایا کہ میرے ماموں دریا گنج میں گولچہ سینما کے پاس انصاری مارکیٹ میں دوکان کرتے ہیں اور اُن کا نام یہ ہے۔ میں نے کہا کہ جن کا پلاسٹک کا کارخانہ ہے لڑکا حیران رہ گیا کہ میں ان سے کیسے واقف ہوں۔ لڑکے کی حیرانی دُور کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ میں بھی انصاری مارکیٹ میں رہتا ہوں اور تمہارے ماموں کا فلیٹ مارکیٹ کے ایک طرف ہے۔ اور میرا دوسری طرف۔ جو لوگ صبح سے چائے کے بغیر بیٹھے ہوئے تھے اُن کی مالی بدحالی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر کو کمرے میں بُلایا اور کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں۔ میرا یہ نام ہے، یہ پتہ ہے اور یہ ٹیلی فون نمبر ہے۔ انھیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ان کو چائے کھانا وغیرہ اِن کے حسب منشا دیجیے۔ منیجر جی بہت اچھا کہہ کر واپس چلا گیا تو میں نے ان سب فلمی عاشقان کو تسلّی دی کہ آج آپ سب کا معاملہ ٹھیک کر دیا جائے گا۔ اور یہ کہہ کر میں نے دوپہر کے کھانے کے بعد پھر آنے کا وعدہ کیا اور دریا گنج آ کر سیدھا ہندو نوجوان کے ماموں کے ہاں پہنچا اور تمام معاملہ ان کے گوش گزار کیا تو اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا بابو جی آپ کا بھلا ہو لکھنؤ سے صبح ہی تار آیا ہے کہ...... دہلی پہنچا ہو تو تار سے اطلاع دو۔ میں نے لالہ جی کو سب اونچ نیچ سمجھائی کہ اگر لڑکیوں کے اغوا کا کیس پولیس نے رجسٹر کر لیا ہو گا تو چھوٹی لڑکی جسے آپ کا بھانجا ہندو بنا کر شادی کرنا چاہتا ہے نابالغ ہے اور یہ معاملہ اگر بدترین صورت اختیار کر گیا تو ہندو مسلم مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ لالہ جی کے ہاتھ کانپنے لگے اور زبان میں لکنت آ گئی۔ میں نے انھیں حوصلہ دلاتے ہوئے کہا کہ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیے اور اپنے بھانجے کو جُوتے مارتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئیے۔ لالہ جی نے اپنے دو جوان لڑکوں کو بھی بُلا لیا اور میرے ساتھ مہاراجہ ہوٹل میں آئے۔ ان سب کو تو میں نے ناولٹی سینما کے پاس کھڑا کر دیا اور خود ہوٹل میں جا کر اس نوجوان کو بُلا لایا۔ بس پھر کیا تھا ماموں اور اس کے دو نوجوان بیٹوں نے اس عاشق کا مجو تو ٹی اور مکوں سے جو سواگت کیا ہے وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ فوراً ٹیکسی لے کر ماموں صاحب اپنے دونوں بیٹوں اور بھانجے کو لیکر رفوچکر ہو گئے اور میں نے ہوٹل جا کر اس صورت حال سے قافلے کے باقی ماندہ لوگوں کو آگاہ کیا۔ اور لکھنؤ سے جو تار اس لڑکے کے ماموں کو آیا تھا دکھایا کہ یہ تار پا کر اُس کا ماموں اسے اسٹیشن کے آس پاس کے ہوٹلوں میں ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ مجھے مل گئے اور میں نے اس ڈر سے کہ اگر وہ لوگ ہوٹل میں آ کر اپنے بھانجے کی سمری ٹرائل کرتے تو تم سب ہوٹل والوں کی نظروں میں مشکوک ہو جاتے اور معاملہ پولیس تک پہنچ جاتا اور سب راز کھلنے پر جو حال تمہارا ہوتا اُس کا اندازہ خود لگا لو اچھا ہوا کہ میں ..... کو باہر بُلا کر لے گیا اور اسے وہیں جُوتے پڑے۔ یہ سنتے ہی چھوٹی لڑکی زار و قطار رونے لگی مگر بڑی بہن نے اسے سمجھا بجھا کر چپ کرایا اور بڑی لڑکی سنجیدگی سے کہنے لگی انکل جی اب پردیس میں آپ ہی ہمارے سب کچھ ہیں۔ جب میں نے معاملہ راہ پر آتے دیکھا تو میں نے دونوں بہنوں سے کہا کہ وہ...... تو اب آنے کا نہیں

بنا اسے آپ لوگ لکھنؤ میں دیکھیں گے اور دہلی میں تو اُس کے ملنے کا سوال ہی نہیں رہا یہ مُسلمان لڑکا تو اس سے یہ تو ممکن ہے کہ یہ تم دونوں بہنوں کو فروخت کر کے کسی کوٹھے کی زینت بنا دے یا خود بیشہ کرا کے زندگی بسر کرے اور یہ جہانشے جی جاتی کو بڑھانے والے آپ کو ایک وقت کی چائے بھی نہیں پلا سکتے۔ جب سیٹھ چندر گپت کو خبر لگے گی تو وہ اسے لکھنو بھی نہیں رہنے دیں گے۔ ان باتوں نے ان سب پر اثر کیا۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ اب آپ سب میرے ساتھ میرے گھر چلیے، ہوٹل کا بل ادا کر دیا گیا۔ مُسلمان لڑکے کو میں نے اپنے مکان کے نیچے بھارت ٹی اسٹال میں بٹھا دیا اور ٹی اسٹال کے مالک مرحوم بابو گولال سے کہہ دیا کہ اسے کھانا وغیرہ کھلا دیں اور چائے بھی جتنی بار چاہے پلا دیجیے۔ دونوں لڑکیوں اور جاتی کے رکھوالے اپنے واقف نوجوان کو میں اپنے مکان میں لے آیا۔ رُدجی سے میں نے کہا کہ وہ ان بچیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور انھیں تین بجے والا شو بھی دکھائے۔ لڑکیوں سے کہا گیا کہ اب تم یہ سمجھو کہ اپنے باپ کے گھر میں ہو اور تمہیں اپنے خدا رسولؐ کی قسم ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرو گی۔ اور ہمارا کہا مانو گی۔ لڑکیوں کے چہرے کِھل اٹھے۔ رُدجی انھیں گولچہ میں تین بجے کا شو دکھانے لے گئی۔ اور جاتی کے رکھوالے نوجوان کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ لکھنؤ کا کرایہ اِن کو دیا گیا۔ اور کہا کہ تمہارا لکھنؤ سے غیر حاضر رہنا تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہاں رپورٹ درج ہو گئی ہو لہٰذا تم فوراً لکھنؤ اپنے گھر چلے جاؤ باقی معاملہ میں نپٹ لوں گا۔ سینما کا شو ختم ہونے سے پہلے پہلے میں نے ارادہ کر لیا کہ ان لڑکیوں کو آج رات ہی لکھنؤ لے جایا جائے۔ سوا چھ بجے رُدجی اور لڑکیاں سینما دیکھ کر لوٹیں تو میں نے کچن میں جا کر رُدجی سے کہا کہ آج رات کو لکھنؤ چلنا ہے اور ان لڑکیوں کو ساتھ لے جانا ہے رُدجی نے بتایا کہ لڑکیاں لکھنؤ جانے سے مر جانا بہتر سمجھتی ہیں۔ اس لیے جو بھی قدم اُٹھایا جائے وہ سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے سات بجے ...... کے ماموں آ گئے میں نے انھیں دیکھتے ہی سیڑھیوں میں ہی روک لیا اور نیچے لے گیا اور انھیں بتایا کہ دونوں لڑکیاں اُوپر ہیں۔ لالہ جی بہت گھبرائے کہنے لگے بابوجی یہ آپ نے کیا کیا کہ اغوا شدہ لڑکیوں کو گھر لے آئے۔ آپ پر کوئی مصیبت آ گئی تو کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ وہ تو دیکھا جائے گا میں تو ان لڑکیوں کو لکھنؤ لے جا رہا ہوں تاکہ ان کے وارثوں کے سپرد کر کے آؤں اگر وہاں اغوا کا کیس درج بھی ہوگا تو مجھے کیا ڈر ہے اور چونکہ دو لڑکیوں کا ساتھ ہے اس لیے میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔ دو لڑکیاں ایک وہ مسلمان لڑکا اور دو ہم میاں بیوی پانچ آدمیوں کا لکھنؤ جانا اور دو کا واپس آنا۔ ان دنوں میری مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان اخراجات کا متحمل ہو سکتا۔ مگر آدمی کی نیت نیک ہو تو سب انتظام اُوپر والا کر دیتا ہے۔ نصف گھنٹے بعد لالہ جی د..... کے ماموں آئے اور سو سو روپے کے دو نوٹ دیتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ بابوجی آپ کے آنے جانے کا خرچ میں دے رہا ہوں اسے قبول کیجیے اور اس معاملہ کو جیسے بھی ختم کرائیے۔ میں نے رسماً روپیہ لینے سے انکار کیا مگر لالہ جی نے زبردستی دو صد روپیہ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ اور میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور نیچے بھارت ٹی اسٹال سے مسلمان لڑکے کو ساتھ لے کر دہلی اسٹیشن کی راہ لی۔ آئی۔ سی سکسینہ (ریلوے افسر) کی مہربانی سے لکھنؤ میل میں پانچ بیٹھنے کی سیٹیں ریزرو ہو گئیں۔ مسلمان لڑکا کہنے لگا انکل بڑی لڑکی تو مان سکتی ہے لیکن چھوٹی لڑکی راستے میں ریل سے چھلانگ تو لگا سکتی ہے۔ مگر لکھنؤ نہیں جائے گی۔ ٹکٹ ریزرو کرانے کے بعد پونے آٹھ بجے گھر آیا۔ رُدجی اور یہ لڑکیاں مل کر کھانا تیار کر چکی تھیں۔ میں نے رُدجی سے کہا کہ کھانا ساتھ رکھ لو راستے میں کھا لیں گے اور خود ان دونوں لڑکیوں کو اُوپر چھت پر لے گیا۔ سلسلۂ گفتگو شروع کرنے سے پہلے میں نے ان لڑکیوں سے کہا کہ میں تمہیں لکھنؤ لے جانے کا سب انتظام کر چکا ہوں، ٹکٹ خرید لیے ہیں۔ یہ میرا ذمّہ ہے کہ تمہارے ماں باپ یا بھائی تمہیں کچھ نہیں

...اِتنا تو مِیر نے دیکھا!

کہیں گے۔ اگر وہاں رپورٹ درج ہو چکی ہو گی تو تم پولیس سے کہہ دینا کہ ہمیں کسی نے اغوا نہیں کیا ہم دونوں بہنوں نے دہلی دیکھنے کے ارادے سے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر دہلی جانے کا پروگرام بنایا اور وہاں سرور انکل کے ہاں رہے اور اب انھیں بھی لکھنؤ آنا تھا لہٰذا ان کے ساتھ واپس آ گئی ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہوا کہ یہ تجویز لڑکیوں کو پسند آئی اور انھوں نے کہا تو اتنی جلدی کیا ہے دو چار دن بعد چلیں گے۔ اب انھیں سمجھایا کہ بیٹی جتنی دیر ہو گی تمہارے گھر والے زیادہ پریشان ہوں گے۔ اس لیے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا ضروری ہے۔ خدا خدا کر کے ہم سب دہلی مین اسٹیشن سے لکھنؤ میل میں بیٹھے۔ حرام ہے جو ساری رات میری یا رُوحی کی آنکھ بھی لگی ہو ان دنوں ریل کی کھڑکیوں میں سلاخیں بھی نہیں لگی تھیں۔ اور ڈر تھا کہ کہیں کوئی لڑکی کسی اسٹیشن پر کھڑکی سے نہ کود جائے دونوں طرف کھڑکیوں کے پاس مَیں اور رُوحی بیٹھے اور اپنے ساتھ ایک ایک لڑکی کو بٹھایا مسلمان لڑکے کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ بھی پوری طرح سے چوکنا رہے۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ اس مُسلمان لڑکے نے پوری ایمانداری کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا۔ خدا خدا کر کے صبح چار باغ ریلوے اسٹیشن آیا۔ زنانہ مسافر خانہ میں جا کر لڑکیوں نے برقعے اوڑھے اور ابھی ہم تانگے میں سوار ہوئے ہی تھے کہ لڑکیوں کے بھائیوں نے اپنی بہنوں کے برقعوں کو ہی پہچان کر تانگے کو گھیر لیا اور لڑکیوں کے نام لے کر گالی دیتے ہوئے کہا کہ تم کہاں مر گئی تھیں۔ مَیں نے حوصلہ سے کام لیتے ہوئے تانگے والے سے کہا کہ تانگہ نزدیک ترین پولیس اسٹیشن لے چلو۔ یہ کون غنڈے ہیں جو لڑکیوں کو دھمکا رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں تو لڑکیوں نے کہا انکل یہ ہمارے بھائی صاحب ہیں۔ اب مَیں نے خندہ پیشانی سے ان دونوں لڑکوں سے سلام و دعا کی اور کہا کہ بھئی یہ تو ہماری بیٹیاں ہیں ہم سے ملنے دہلی آ گئی تھیں۔ کئی سال سے یہ ہمارا رسالہ پڑھتی ہیں اس طرح ان سے قلمی واقفیت ہو گئی تھی، چونکہ ہمیں بھی لکھنؤ آنا تھا اس لیے اِن کو بھی ساتھ لیتے آئے ہیں۔ لڑکے خاموش ہو گئے، تانگہ سیدھا اُن کے گھر پہنچا۔ مُسلمان لڑکا تو لڑکیوں کے بھائیوں کو دیکھتے ہی اسٹیشن سے ہی گم ہو گیا تھا۔ لڑکیوں کے ماں اور بھائیوں نے اپنی بساط کے مطابق ہمیں چائے ناشتہ کرایا۔ اور "دانش محل" امین آباد پارک کے اوپر ہوٹل میں ہم دونوں میاں بیوی چلے آئے۔ دن بھر ہوٹل میں رہے اور لکھنؤ سے کُرتے وغیرہ خریدے۔ رات کا کھانا اُس ہندو نوجوان کے گھر کھایا جو چھوٹی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکے کی ماں ہم دونوں پر قربان ہوئی جا رہی تھی کہ کس خوبی سے معاملہ سُلجھایا گیا تھا۔ اسی رات مَیں اور رُوحی نے لکھنؤ سے کانپور کی گاڑی پکڑی اور صبح قنوج میں سیٹھ چندر گپت صاحب کے وہاں پہنچ گئے۔ تمام حالات اُن کو سُنائے۔ سیٹھ صاحب اور اُن کی دونوں بیویوں نے معاملہ کو بخیر و خوبی نپٹانے کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اب اگر وہ صاحب دہلی پہنچیں تو گھر میں قدم نہ رکھنے دیجیے گا۔

شاہ صاحب

۱۹۵۰ء میں پہلی بار جے پور گیا تو قبلہ مولانا کوثر مرحوم سے پارسا جے پوری نے مُلاقات کرائی۔ کوثر مرحوم ایسی ہستیاں اب ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتیں چند ہی لمحوں میں مشرقی تہذیب و شرافت کا یہ مجسمہ راقم الحروف کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ کوثر صاحب نے میرے نام کے ساتھ "تونسوی" لکھا ہوا دیکھا تو فرمانے لگے خواجہ سلیمان تونسوی رح کے خلیفہ سے تو جے پور میں آپ ملے ہوں گے۔ خواجہ سُلیمان تونسوی اور تونسہ کا ذکر میرے لیے نوید جانفزا تھی۔ میرے استفسار پر مولانا کوثر نے قبلہ مولینا حاجی معین الدین شاہ صاحب جودھ پوری سے متعلق ایسی باتیں بتائیں کہ مَیں نے مولانا کوثر مرحوم سے یہ استدعا کی کہ وہ اپنے ساتھ مجھے حضرت شاہ صاحب کے ہاں لے چلیں۔ فرمانے لگے، صبح آٹھ بجے سے پہلے پہلے آجانا تو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ ساتھ ہی کوثر صاحب نے یہ تاکید بھی کر دی کہ وقت کی پابندی ضرور کیجیے گا۔ کیونکہ شاہ صاحب نو بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ میرا قیام مُسلم مسافر خانہ میں تھا دوسرے دن صُبح سویرے تیار ہو کر مَیں ساڑھے سات بجے کے قریب پارسا کوثری کے ہاں پہنچا تو یہ رندِ بلانوش ابھی رات کی بادہ نوشی کے خُمار میں بے خبر سو رہا تھا۔ کوثر صاحب کے درِ دولت پر تنہا ہی گیا تو مولانا کوثر تیار بیٹھے تھے۔ فوراً میرے ساتھ ہو لیے اور اپنے مخصوص لب و لہجہ میں حضرت شاہ صاحب سے متعلق بات چیت کرتے ہوئے تین منٹ کے بعد ایک رتیلے چوک میں لے آئے اور فرمانے لگے کہ خواجہ سُلیمان تونسوی کا عُرس اسی چوک میں منایا جاتا ہے اور یہ سامنے کا دروازہ وہ دروازہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسی دروازہ سے سب کچھ دلوا دیں۔ ایک منٹ کے بعد ہی حضرت شاہ صاحب کے سامنے تھا علیک سلیک ہونے کے بعد کوثر صاحب نے میرا تعارف شاہ صاحب قبلہ سے کرایا۔ کچھ لوگ وہاں پر اور بھی موجود تھے۔ قبلہ شاہ صاحب نے تونسہ سے متعلق کچھ باتیں دریافت فرمائیں۔ تونسہ شریف کے خواجگان حافظ صدید الدین صاحب مرحوم اور خواجہ غلام نظام الدین صاحب اور ان کے صاحبزادگان کے بارے میں کئی سوالات فرمائے۔ ہم ایک گھنٹہ تک قبلہ شاہ صاحب کے پاس رہے پورے نو بجے شاہ صاحب اُٹھے اور فرمانے لگے اچھا وقت ہو گیا، سب حاضرین باہر جانے لگے تو شاہ صاحب نے قبلہ کوثر صاحب سے فرمایا کہ آپ دونوں میرے ساتھ اُوپر چلیے۔ نصف گھنٹہ کے قریب قبلہ شاہ صاحب سے مزید بات چیت رہی۔ اس مختصر سے وقت میں حضرت شاہ صاحب نے میرے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ مجھے جو عقیدت تونسہ شریف سے تھی اس کے پیشِ نظر جے پور میں حضرت مولانا حاجی معین الدین شاہ صاحب مرحوم جودھ پوری کا دروازہ موزوں و مناسب دکھائی دینے لگا اور گذشتہ انتیس ۲۹ سال سے نہایت خضوع و خشوع سے اس دروازہ کے ساتھ اپنی اس عقیدت کو وابستہ کیے ہوئے ہوں جو مجھے اپنے وطنِ مالوف تونسہ شریف اور وہاں کی درگاہوں سے تھی۔

قبلہ شاہ صاحب سے اس ملاقات کے بعد مَیں کسی نہ کسی بہانے جے پور جانے کا پروگرام بناتا رہا کیوں کہ نادانستہ طور پر بھی کچھ دنوں کے بعد قبلہ شاہ صاحب کے ہاں حاضری دینے کو دل چاہتا۔

ایک دفعہ مَیں گورنمنٹ ہوسٹل جے پور میں ٹھہرا ہوا تھا اور دوسرے دن صبح کوٹہ جانے کا پروگرام تھا کہ شام کو عزیزی ہربنس لال نے ٹرنک کال سے بتایا کہ اگلے ہی روز ہائیکورٹ میں مقدمہ کی تاریخ لگ گئی ہے لہٰذا آج رات کو ہی دہلی کے لیے روانہ ہو کر صبح ہائی کورٹ کھلنے سے پہلے پہلے آ جائیے، ان دنوں پنجاب ہائی کورٹ کے دہلی سرکٹ بنچ میں میرے خلاف توہین عدالت کا ایک کیس چل رہا تھا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے مقدمات کی تاریخیں پہلے سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ ایک روز پہلے مقدمات کی تاریخیں ہندوستان ٹائمز اور دوسرے موقر انگریزی روزناموں میں چھپ جاتی ہیں۔ کوٹہ جانا بھی اشد ضروری تھا اور اُدھر ہائی کورٹ کا معاملہ، چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ کوٹہ تار دے کر پروگرام ملتوی کر دیا جائے۔ اور رات کو احمد آباد میل سے دہلی واپس جایا جائے۔ مَیں جانتا تھا کہ شاہ صاحب سے شام کو ملاقات نہیں ہو سکتی مگر مَیں نے اس خیال سے کہ دروازہ پر دستک دے کر بشیر الدین صاحب کو باہر بلا کر یہ اطلاع تو دے ہی دینی چاہیے کہ مَیں رات کو دہلی واپس جا رہا ہوں راستہ میں ہمدرد دواخانہ رام گنج بازار میں پارسا صاحب مل گئے انھیں مَیں نے دہلی واپس جانے کے بارے میں کہا تو فرمانے لگے سرور صاحب اگر آپ کوٹہ نہ گئے تو کافی نقصان ہو گا۔ اس لیے آپ شاہ صاحب سے پوچھ لیجئے کہ معاملہ یوں ہے اگر دہلی نہ جاؤں تو ہائیکورٹ میں مقدمہ کی کیا صورت رہے گی جبکہ کوئی وکیل بھی نہیں کیا ہوا، اور اگر کوٹہ نہیں جاتا ہوں تو ویسے نقصان ہوتا ہے۔ پارسا صاحب میرے ساتھ ہی شاہ صاحب کے دروازے تک آئے۔ دروازے پر دستک دی تو بشیر الدین صاحب باہر تشریف لائے ان سے قصہ بیان کیا تو فرمانے لگے آئیے شاہ صاحب کے پاس چلیے۔ مَیں اوپر گیا تو وہاں راجہ جے پور کے بھائی بھی تشریف فرما تھے اور شاہ صاحب ایک سلیٹ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ قدمبوسی کے بعد مَیں نے اپنا مُدعا بیان کیا۔ ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔ سرور صاحب آپ بلا خوف و خطر کوٹہ جائیے۔ دہلی ہائی کورٹ میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ مَیں شاہ صاحب سے رخصت لے کر باہر آیا تو پارسا صاحب سے کہا کہ بھائی مَیں تو شاہ صاحب کے فرمان کے باوجود ہائیکورٹ سے ڈر رہا ہوں۔ پارسا کوثری نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا۔ سرور صاحب اگر شاہ صاحب نے آپ کو کوٹہ جانے کی اجازت دی ہے تو پھر ہائی کورٹ کیا دُنیا کی کوئی بھی عدالت آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور آپ بغیر کسی فکر کے کوٹہ جائیے۔ چنانچہ مَیں اپنے پروگرام کے مطابق کوٹہ چلا گیا شام کو جب کوٹہ پہنچا تو مَیں نے ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد سب سے پہلے جو کام کیا وہ دہلی ٹرنک کال بُک کرانے کا تھا۔ رات کے نو بجے کے قریب عزیز ہربنس نے مجھے فون پر بتایا کہ ہائی کورٹ میں جج متعلقہ بیماری کے باعث تشریف ہی نہیں لائے تھے۔ لہٰذا اب مقدمہ کی کوئی اور تاریخ مقرر ہو گی جس کا اعلان اخبارات میں ہو جائے گا۔ مَیں نے دوسرے دن قبلہ شاہ صاحب کو جے پور خط سے اطلاع دی کہ ہائیکورٹ کا معاملہ یوں ٹل گیا ہے۔

ایک عُرس کے موقع پر رُوحی صاحبہ میرے ساتھ تھیں۔ رُوحی صاحبہ کو اختلاج قلب کا عارضہ تھا۔ عُرس کے اختتام پر دہلی آنے کے لیے جب شاہ صاحب سے رخصت لینے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضری دی تو مَیں نے بشیر الدین صاحب سے کہلوایا کہ رُوحی صاحبہ بھی سلام کے لیے حاضر ہوئی ہیں۔ کیونکہ خواتین کو شاہ صاحب کے سامنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے رُوحی صاحبہ کا سلام دو تین قدم کے فاصلے سے ہی قبول فرمایا تو مَیں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ انھیں اختلاجِ قلب کے دَورے پڑتے ہیں۔ فرمانے لگے عنبر ایک ماشہ لے کر ایک ایک رتی کی

خوراک بنا کر آٹھ دن کھلا دینا یہ شکایت نہیں رہے گی۔ حکیم عبدالرحیم صاحب ٹونک والے شاہ صاحب کے پاس ہی بیٹھے تھے اُنھوں نے کہا۔ سرور صاحب میرے پاس خالص عنبر موجود ہے۔ چنانچہ حکیم صاحب سے ایک ماشہ عنبر خرید کیا گیا اور شاہ صاحب کی ہدایات کے مطابق آٹھ دن ایک پڑیا روحی صاحبہ کو کھلائی گئی۔ اُس کے بعد یہ عارضہ جاتا رہا۔

دو سال ہوئے عُرس کے موقعہ پر جناب لکشمی نارائن صاحب فارغ کو نہایت ادب کے ساتھ قبلہ شاہ صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جناب فارغ صاحب شاہ صاحب سے بات چیت کر کے واپس جانے لگے تو مَیں بھی ان کے ساتھ واقف صاحب کے دفتر تک گیا۔ راستہ میں از راہِ مذاق مَیں نے فارغ صاحب سے کہا کہ آپ نے کب سے شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ فرمانے لگے۔ سرور صاحب آپ کو علم نہیں ہے کیا کہ شاہ صاحب نے کس قدر احسان فرمایا ہے۔ مجھ ناچیز پر۔ اس کے بعد وہ خود ہی بتانے لگے کہ میرا لڑکا جو کہ ملٹری مین ہے اچانک بیمار ہو گیا اور اُس کے پاؤں پر ایسی بیماری ہو گئی کہ تمام دواؤں کے استعمال سے بھی آرام نہ آیا اور ڈاکٹروں نے کہا کہ پاؤں کاٹنا پڑے گا۔ فارغ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تمہاری بات یاد آ گئی اور مَیں لڑکے کو رکشا میں بٹھا کر شاہ صاحب کے پاس لے آیا۔ شاہ صاحب نے چند دنوں میں میرے لڑکے کو ٹھیک کر دیا۔ وہ ڈاکٹر جو میرے لڑکے کو لا علاج قرار دے چکے تھے اور کہتے تھے کہ پاؤں کاٹنے کے سوا کوئی راستہ اور ہے ہی نہیں۔ وہ دریافت کرتے ہیں کہ آخر وہ کون سی ادویات تھیں جن سے اس لڑکے کو آرام ہو گیا۔ سرور صاحب! اب مَیں ان ڈاکٹروں کو کیا بتاؤں کہ جنگل میں مَرے ہوئے کتّے کی ہڈی کا سفوف اور گلو کے پتوں سے اس لا علاج بیماری کا علاج ہُوا ہے۔ کیونکہ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ قبلہ شاہ صاحب کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میرا بچّہ چند دنوں کے بعد ماؤنٹ آبو پر پریڈ میں شریک ہو گیا۔ فارغ صاحب فرمانے لگے۔ سرور صاحب یہ تو اہلِ جے پور کی بدقسمتی ہے کہ شاہ صاحب ایسی ہستی اُن کے شہر میں ہو اور یہ بدنصیب ان سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اِدھر اُدھر کی فضولیات میں بہکتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگوں کے کہنے پر مَیں نے گوڑ گاؤں کی عدالت میں ایک بدتمیز (جب کہ مَیں اس شخص سے قطعاً ناواقف تھا) کی پانچ ہزار کی ضمانت دی۔ مگر یہ شخص مفرور ہو گیا۔ اور پتہ چلا کہ اس شخص کے خلاف چلتی ریل میں ڈاکہ ڈالنے کا الزام ہے۔ ایڈیشنل سیشن جج گوڑ گاؤں کی عدالت میں میرے خلاف ضبطیِ ضمانت کی کارروائی شروع ہوئی۔ میرے پاس کوئی طریقہ، کار نہیں تھا کہ مَیں اس مفرور کو گرفتار کرا سکتا۔ مَیں سیدھا جے پور گیا اور قبلہ شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اس نئی مصیبت سے نجات دلوائیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ گھبرائیے نہیں یہ مصیبت بخیر و خوبی گذر جائے گی اور مفرور گرفتار ہو گا۔ میرے خلاف کارروائی چلتی رہی۔ سردار پرتاپ سنگھ کیروں کے قتل کے سلسلہ میں پولیس مشتبہ اشخاص کی دیکھ ریکھ کر رہی تھی کہ یہ مفرور تھانہ سرائے روہیلہ کے علاقے کے ایک باغ سے گرفتار کر لیا گیا۔ گو راقم الحروف کو اس چکّر میں کم و بیش ایک ہزار روپیہ کا زیر بار ہونا پڑا۔ مگر واقعی یہ مصیبت بخیر و خوبی گذر گئی۔

میرے محترم جناب محمد نذیر صاحب (مرحوم) مالک روزنامہ "اُردو ٹائمز" بمبئی نے اخبار "اُردو ٹائمز" کیا جاری کیا گویا یار لوگوں نے اُن کے راستے میں قدم قدم پر کانٹے بچھا دیے۔ بمبئی کے دوسرے مشہور اُردو روزنامہ کے مالکان نے تجارتی حسد کے تحت "اُردو ٹائمز" کو فیل کرانے کے لیے کیا کیا چالیں نہ چلیں۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے..... "اُردو ٹائمز" اپنا مقام پیدا کرتا چلا گیا۔ نذیر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور قبلہ شاہ صاحب کی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ اُردو ٹائمز اس وقت بمبئی کا ایک موقر روزنامہ بن گیا ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ حکومت بمبئی اور بمبئی کارپوریشن کو اس کا مقام تسلیم کرنا پڑا اور ان دونوں اداروں کے اشتہارات اس اخبار میں شائع ہونے لگے۔

راقم الحروف ذاتی طور پر جانتا ہے کہ اگر شاہ صاحب کی دعائیں آڑے نہ آتیں تو "اُردو ٹائمز" کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔

رنگ بہاری لال تبسم دہلوی (مرحوم) محکمۂ سنٹرل پی۔ ڈبلیو ڈی میں ایک اچھے عہدے پر ملازم تھے۔ انھیں کار کے حادثے میں اندرونی طور پر کوئی ایسا زخم ہو گیا جس سے بے انتہا پریشان تھے۔ سرکاری طور پر اُن کا علاج ہر اچھے مقامی اور بیرونی ہسپتال میں کرایا گیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ مرچ کھانا اُن کے لیے زہر کا حکم رکھتا تھا۔ کیلا۔ دہی۔ ہاف فرائی انڈے وغیرہ ہی کھا کر گزارا کرتے تھے۔ روٹی تک کھانا منع کر دیا گیا۔ اُن کی یہ حالت کئی سال سے تھی اور وہ انتہائی کمزور ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ قبلہ شاہ صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ بھئی تبسم کی بہت تعریف سُنی ہے اس مرتبہ عُرس کے مشاعرے میں اُسے بلائیے گا۔ شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل میں مَیں نے تبسم صاحب کو عُرس کے مشاعرے میں بھجوا دیا (اس سال عُرس میں مَیں شرکت نہ کر سکا تھا) جناب تبسم سُناتے تھے کہ کھانے کے وقت شاہ صاحب فرمانے لگے۔ جائیے تبسم صاحب آپ بھی کھانا کھا لیجیے۔ اب تبسم صاحب اپنی حالت بتا نہیں رہے کہ وہ تو کھانا کھا ہی نہیں سکتے۔ آخر کار مشہور قوال شنکر نے شاہ صاحب سے حقیقتِ حال عرض کی تو فرمانے لگے تبسم صاحب آپ جا کر کھانا کھائیے۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ لنگر کا کھانا جو امیر غریب سب کھاتے ہیں۔ جے پوری مرچیں۔ تبسم صاحب کہتے ہیں کہ جب لقمہ حلق سے اُترا تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے پیٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ مگر وہ کھانا کھاتے گئے۔ ایک مدّت کے بعد گیہوں کی روٹی اور دال کھانے کو ملی تھی۔ پیٹ بھر کھایا خدا کا کرنا کیا ہوا کہ تبسم صاحب نے سارا دن کوئی تکلیف محسوس نہ کی۔ رات کو بھی وہی لنگر کا کھانا کھایا اور دو دن عُرس میں رہ کر جب واپس دہلی آئے تو انھیں یہ تکلیف دوبارہ نہیں ہوئی۔ پھر تبسم صاحب عقیدتاً ہر سال عُرس کے مشاعرے میں شریک ہوتے رہے۔

عالم مجبوری میری درخواست پر عُرس کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ خُدا کا کرنا انھیں اس سال اس قدر شہرت ملی اور مشاعروں سے اس قدر آمدنی ہوئی کہ وہ اب ہر سال عُرس کے مشاعرے میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ مجھے اس در سے فیض ملا ہے۔ اسی سال خُدا نے انھیں فرزند ارجمند بھی عطا فرمایا۔

قبلہ شاہ صاحب بھئی نذیر صاحب کے مکان پر قیام فرما تھے کہ مشہور موسیقار نوشاد کے ساتھ مشہور شاعر حضرت شکیل بدایونی تشریف لائے ان دنوں شکیل صاحب صرف انہی فلموں کے لیے گانے لکھتے تھے جن فلموں کا میوزک نوشاد کی تحویل میں ہوتا تھا۔ اور اس حقیقت کا اظہار شکیل صاحب خود فرماتے تھے کہ انھیں مالی طور پر فکر ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب جے پور تشریف لائے تو شکیل صاحب نے فون پر شاہ صاحب سے بات چیت کی کہ وہ بھی دُعا کے طالب ہیں۔ شاہ صاحب نے ایڈیٹر شانِ ہند سے فرمایا کہ اب شکیل شہرت کے آسمان پر اُڑے گا اور اسے مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔ لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے شکیل صاحب فلمی لائن پر چھا گئے اور مالی طور پر اُن کی آسودگی زبان حال سے پکارنے لگی۔ ایک دوسرے موقع پر شکیل صاحب نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ انھیں ذیابیطس کا مرض ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ عُرس کے مشاعرے پر آجانا یہ مرض جاتا رہے گا۔ چنانچہ ایڈیٹر شانِ ہند کے ہمراہ شکیل صاحب جے پور عُرس کے مشاعرہ میں شریک ہوئے اور عُرس کے دنوں میں وہ جے پوری چاول حلوا گوشت۔ دالیں وغیرہ سب ایسی غذائیں کھاتے رہے جو ذیابیطس مریض کو چھونی نہیں چاہئیں۔ مَیں نے قبلہ شاہ صاحب سے عرض کیا کہ کیا واقعی شکیل صاحب کو اب یہ مرض نہیں رہے گا۔ فرمانے لگے اسے کہنا کہ بیٹک ڈاکٹروں سے پیشاب ٹیسٹ کرا کے دیکھ لے۔ اس کے بعد شکیل صاحب وعدے کے باوجود عُرس کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں کہ فلمی دُنیا میں لوگ خُدا تک کو بھول جاتے ہیں۔ اگر شکیل صاحب قبلہ شاہ صاحب کو بھول گئے ہوں

تو کیا عجب ہے اور ویسے بھی دولت کی مُہتات مُحسنوں اور دوستوں کو بھول جانے کا سبق دیا کرتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں ہزار ہا درگاہوں پر عُرس لگتے ہیں مگر جہاں بھی جائیے پیسہ کا سوال پہلے ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے تیرتھ استھان ہوں یا مُسلمانوں کے متبرک مزارات۔ پنڈے اور خادم زائرین..... کی جیبیں خالی کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر شاہ صاحب قبلہ ہر سال خواجہ سُلیمان تونسوی کا عُرس کراتے رہے اب ان کے جانشین بشیرالدین صاحب یہ عُرس کراتے ہیں۔ تو جملہ زائرین کی رہائش اور طعام کا انتظام اپنے پاس سے کرتے ہیں۔ بعض حضرات مہینوں قیام کرتے ہیں مگر انھیں چائے کھانا سب شاہ صاحب کے یہاں سے ملتا رہتا ہے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ کسی بھی زائر سے نذر و نیاز کے طور پر ایک پیسہ نہیں لیا جاتا۔ اور اس امر کے لیے اعلان شائع کیے جاتے ہیں کہ اس عُرس کے نام پر یا قبلہ شاہ صاحب کے نام پر کسی کو ایک پیسہ نہ دیجئے۔ بعض امرا نے اپنی مُرادیں پوری ہونے پر ہزار ہا روپیہ پیش کیا مگر شاہ صاحب نے پہلے تو نرمی سے انکار فرمایا اور اگر کسی نے روپیہ دینے پر اصرار کیا تو اسے سختی سے منع فرمایا۔ لہٰذا اس لحاظ سے یہ آستانہ اپنی نوعیت سے ایک جُداگانہ حیثیت رکھتا ہے کہ اس دَور میں جب کہ ہر شخص جلبِ زر کے لیے دُنیا بھر کے جھوٹ فریب سے کام لیتا ہے۔ یہاں از خود روپیہ دینے والوں کو بھی منع کیا جاتا ہے کہ وہ ایسا نہ کریں چنانچہ آج کا دُکھی انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ جے پور کے آستانے پر روپیہ بٹورنے کا دھندہ نہیں ہوتا۔ بلکہ خدمتِ خلق ہی واحد نظریہ ہے تو وہ اس آستانے پر آنے کے بعد حقیقتاً رُوحانیت کی روشنی محسوس کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی پریشانی وغیرہ دُور کر دیتا ہے۔

جے پور کا یہ عُرس بھی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے عُرسوں کی طرح محض قوالیوں اور شرک و بدعت کو ہی شعار نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ پندرہ دنوں تک نہایت مفید اور دلچسپ پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ جن میں سیرت النبی پر تقاریر۔ بچوں اور بچیوں کو تعلیمی انعامات۔ نعتیہ مشاعرہ۔ کُل ہند اُردو مشاعرہ۔ کوی سمّیلن۔ میوزک کانفرنس۔ چار بیت۔ قوالیاں وغیرہ شامل ہیں۔

کیسی کیسی ہستیاں

ہیں رونقِ میخانہ آج

ذرا غور سے سُنیے جناب صدر اعلان فرما رہے ہیں کہ اب شاہدہ سُلطانہ صاحبہ نکہت اپنا کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں گی۔ وہ دیکھیے نکہت صاحبہ پورے نسوانی جلووں کے ساتھ کُرسی سے اُٹھ کر ایک خاص ادائے ناز سے میکروفون پر تشریف لے آئی ہیں۔ غرارہ پہنے ہوئے سفید جارجٹ کا دوپٹہ جس کے کناروں پر سنہری پائپنگ لگ رہی ہے۔ گلے میں عجیب بہار دے رہا ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ اور زُلفِ مشکیں لال رنگ کی ربن میں نہایت سلیقے سے بندھی ہوئی ہیں۔ نکہت صاحبہ نے غزل پڑھنا شروع کی ہے۔ غزل کیا ہے سننے والوں پر ایک جادو کر دیا ہے۔ بہترین اشعار منجھا ہوا ترنم۔ اور پڑھنے والی ایک شاعرہ، غزل۔ موسیقی اور حُسن کی یہ تثلیث اس قدر مسحور کن نظارہ پیش کر رہی ہے کہ مَیں بھی غزل کا کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔ واہ واہ، خوب خوب اور داد تحسین کے قیامت خیز شور میں نکہت صاحبہ نے غزل ختم کی تو اس جادو کا اثر دل و دماغ سے یک دم ہٹا تو نکہت صاحبہ کو دوسری غزل سُناتے پایا۔ مطلع فرماتی ہیں۔ ؎

اگر اس میکدے میں مُبتلائے غم بھی پیتے ہیں
تو ساقی یہ رہے ملحوظ آنسو ہم بھی پیتے ہیں

داد و تحسین کے شور میں نکہت صاحبہ نعرہ سرا ہیں ؎

ہماری موج ہے عادت نہیں ہے روز پینے کی
کبھی برسوں نہیں پیتے کبھی پیہم کبھی پیتے ہیں

سُنیے نکہت صاحبہ کس والہانہ انداز میں فرماتی ہیں ؎

خدا اک ہے اب جیسی بھی گزرے پیرِ خانہ
کسی کا نام لے کر تو کبھی پی اور ہم بھی پیتے ہیں

بس کچھ نہ پوچھیے کہ داد کا کیا عالم ہے اور نکہت صاحبہ پیہم پینے کی ضد میں فرما رہی ہیں ؎

نظر ساقی کی جانب چشمِ تر ٹوٹا سا پیمانہ
بایں صورت بایں حالت بایں عالم بھی پیتے ہیں

داد ہے کہ شاید ہی اب کسی شاعر کو اس قدر مل سکے اور نکہت صاحبہ ہیں کہ ضد کیے ہوئے ہیں کہ وہ آج پینے کی نئی راہیں کھول کر ہی دم لیں گی۔ چنانچہ فرما رہی ہیں ؎

برائے ترکِ غم تو پینے والے ہیں بہت لیکن
تمہارے دَرد میں دو اک برائے غم بھی پیتے ہیں

داد کا وہی عالم ہے ہر مصرع اور ہر شعر پر ہال میں کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اور نکہت صاحبہ مقطع فرما رہی ہیں۔ ؎

پئے لیتی ہوں نکہتؔ جیسی ہو ساقی کے کہنے سے
وہ کہتا ہے کہ پی بھی لے مریضِ غم بھی پیتے ہیں

غزل ختم کرنے کے بعد نکہت صاحبہ اپنی جگہ تشریف لے جا رہی ہیں۔ نکہتؔ صاحبہ کے ہر قدم پر ہزاروں نظریں چل رہی ہیں اور بڑی بڑی داڑھیوں والے حضرات کی نظریں تو نکہت صاحبہ کے ہر گام پر بلائیں لے رہی ہیں (مشاعرہ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔ ۳۰؍اپریل ۱۹۵۰ء)۔

۹؍اگست ۱۹۵۱ء کو لال قلعہ کے دیوانِ عام میں اُردو سبھا دلّی کی طرف سے ہفتۂ آزادی کے سلسلہ میں ایک کُل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ گوپال متل صاحب ایڈیٹر تحریک نے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے جناب عرش ملسیانی سے مذاق میں فرمایا کہ آپ کو اپنے تخلص عرش کے ساتھ ملسیانی کی بجائے فرشی لکھنا چاہیے۔ عرش صاحب نے جواباً فرمایا کہ میں تو ایسا کرلوں گا لیکن جب آپ کو گوپال متل کے بجائے گوپال مثلی کہا جائے تو پھر کیسے رہے گا۔ متل صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ بابا تم ملسیانی ہی رہو۔

لال قلعہ کے ایک مشاعرہ میں اسٹیج دیوانِ عام میں شہ نشین پہ بنایا گیا پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (مرحوم) نے امنؔ صاحب لکھنوی سکریٹری اُردو سبھا سے فرمایا کہ کیا آپ کی مشاعرہ کمیٹی میں سے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ یہ کون سا مقام ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ جہاں پہلی جنگِ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفرؔ اور خلد آشیاں شاہجہاں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔ وہاں آپ اسٹیج بنا رہے ہیں۔ کیا غضب ہے کہ جشنِ آزادی کے مشاعرہ میں پہلی جنگِ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفرؔ کی توہین کی جا رہی ہے۔ علامہ نے نہایت غصّے میں فرمایا کہ امنؔ صاحب مجھ سے یہ اُمید نہ رکھیے کہ میں اس توہین میں حصّہ دار بن سکوں گا۔ لہٰذا میں آپ کی اس اسٹیج پر نہیں بیٹھوں گا۔ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان نے گڑگڑا کر علامہ کیفی سے گُزارش کی، اب وقت ہے نہیں کہ اسٹیج کا کوئی دوسرا انتظام کیا جا سکے۔ اگر آپ اس مسئلہ کو چھیڑتے ہیں تو بدنظمی ہو جائے گی۔ لہٰذا کوئی ایسا راستہ نکالیے کہ آج کا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہو جائے آئندہ ہم خیال کریں گے اس پر علامہ فرمانے لگے کہ میں جب تک اسٹیج پر رہوں گا کھڑا رہوں گا اور بیٹھوں گا نہیں۔ کیفی صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کہ حکومت بھی کیسے کیسے غیر ذمّہ دار لوگوں کو قلعہ کے استعمال کی اجازت دے کر غیر ذمّہ داری کا ثبوت دیتی ہے۔

چیمسفورڈ کے انڈو پاکستان مشاعرہ منعقدہ ۱۵؍نومبر ۱۹۵۲ء میں شعراء کے رات کے کھانے اور پینے کا انتظام بھی کلب ہی میں تھا۔ اور شعراء کے لیے ڈنر کارڈ جناب ساحرؔ ہوشیارپوری کی تحویل میں تھے تاکہ جنھیں وہ مناسب سمجھیں یہ ڈنر کارڈ دے دیں اور یہ ڈنر کارڈ دکھا کر ہی کلب کے بیروں سے کھانا لیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا جب ساحر ہوشیارپوری شعراء کو ڈنر کارڈ تقسیم کرنے لگے تو ہفتہ وار اخبار "اتالیق" کے ایڈیٹر مسٹر رام نگری نے بھی ڈنر کارڈ حاصل کرنے کے لیے ساحرؔ صاحب سے لجاجت آمیز گذارش کی، جس پر

یہ کتاب اُردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

مرحوم رسالہ "شعلہ و شبنم" کے مدیرِ مسئول جناب گوہر دہلوی بھی اپنے دل و دماغ کے اکثر گوشوں میں ان بیگم صاحبہ کے تئیں مختلف زاویوں سے عشق کی منازل طے کر رہے تھے مگر ایک تو جینی ہونے کے ناطے اُن میں یہ ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے عشق کا اظہار کھل کر کر سکتے۔ دوسرے ان کی صرافی کی دُکان تھی اور یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر بیگم صاحبہ پر ان کے جینیانہ عشق کا راز افشا ہو گیا تو صرافی کی جگہ شائد مونگ پھلی بیچنی پڑے۔ اس لیے یہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے عشق کا گلا دباتے رہے۔ مگر بُرا ہو شاعرانہ مزاج کا کہ وہ انھیں کسی نہ کسی بہانے بیگم صاحبہ کی بارگاہِ حسن تک لے ہی جاتا۔ تخلص تو ان کا گوہر ہے مگر شاعری کے لحاظ سے گوبر تھے۔ گوہر صاحب ہر سال مہاویر جینتی کے مبارک موقع پر ایک مشاعرہ بھی کراتے ہیں۔ لہٰذا اس مشاعرہ میں بطورِ خاص ان بیگم صاحبہ کو مدعو کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گوہر صاحب بیگم صاحبہ کے لیے سی آئی ڈی کا کام بھی کرتے تھے یعنی "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے" کے مصداق انھوں نے بیگم صاحبہ کے ہاں اکثر و بیشتر اوقات حاضری دینے کا یہ طریقہ نکالا کہ انھیں سچ یا جھوٹ یہ اطلاعات بہم پہنچاتے کہ کس شاعر نے بیگم صاحبہ کے خلاف کیا کچھ کہا۔ ازل سے آج تک کسی بھی ایسی عورت نے جنم نہیں لیا جو خوشامد پسند نہ ہو یا اپنے بارے میں عوامی رائے جاننے کی متمنی نہ ہو اور عورت کی یہ فطری فضیلت تا ابد قائم رہے گی۔ چنانچہ گوہر صاحب کی سی آئی ڈی سے بیگم صاحبہ خوش تھیں اور انھیں اس خدمت کے صلہ میں چند قہقہے، دو چار پُرکشش مسکراہٹیں اور گھٹیا شعروں پر بڑھیا داد کا مل جانا ہی ان کے اندرونی عشق کی کافی حد تک تکمیل کر دیتا تھا۔ چنانچہ گوہر صاحب اپنی خبر رسانی کے دوران کئی مرتبہ ایڈیٹر شانِ ہند کے خلاف بھی بیگم صاحبہ کے کان بھرتے رہے جس کی اطلاع ایڈیٹر شانِ ہند کو بھی مل جاتی تھی۔ اُس وقت تک راقم الحروف نے ان بیگم صاحبہ کو دیکھا تک نہ تھا مگر دہلی کی ادبی دُنیا میں ان بیگم صاحبہ کے حسنِ تغزل اور ترنم کا سکہ، حسنِ شاہی یوں چل رہا تھا کہ جس کے سامنے حکومتِ ہند کا سکہ ماند پڑ رہا تھا۔ چنانچہ اس بلبلِ ہزار داستان کو دیکھنے کے لیے مہاویر جینتی کے مشاعرہ میں یہ نیازمند بھی شریک ہوا۔ اور دیدہ و دانستہ اسٹیج پر بیٹھا تاکہ اس آفتِ جاں کو قریب سے دیکھ سکوں مشاعرہ شباب پر تھا کہ بیگم صاحبہ نصف شب کے قریب پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں۔ جینی حضرات بظاہر مہذب اور پُروقار انداز میں مشاعرہ سُن رہے تھے۔ مگر شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو گی جو ان بیگم صاحبہ کے ہوش رُبا انداز کی داد نہ دے رہی ہو۔ بیگم صاحبہ عالمِ رویا میں تھیں۔ آتے ہی گوہر صاحب سے اشارتاً کہا کہ ابھی پڑھوا دو۔ جو شاعر کلام سُنا رہے تھے ان کی غزل اور ترنم ویسے ہی بیگم صاحبہ کے آتے ہی دم توڑ چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے مقطع

ٹ گوہر صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک سَو اٹھانوے

ساحرؔ صاحب فرمانے لگے کہ جن اصحاب کے دعوت ناموں میں کھانے کی دعوت کا ذکر تھا ان کو ہی ڈنر دیا جا سکتا ہے مگر رام نگری صاحب کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے وہ بدستور ساحرؔ صاحب کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ نے رہنمائے تعلیم کے ایڈیٹر سردار جگت سنگھ کو شراب بھی پلائی اور ڈنر کارڈ بھی دے دیا ہے۔ مجھے شراب بھی نہیں پلائی اور اب ڈنر کارڈ بھی نہ دیا تو میری بدنامی ہو جائے گی۔ اور ساحرؔ صاحب اپنی مجبوریاں بتا رہے ہیں۔ مسٹر رام نگری کی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوا کہ میں نے صحافی بن کر غلطی کی ہے اور دل میں آیا کہ رام نگری کو پانچ روپیہ پیش کروں کہ لیجئے اس سے قیمتاً کھانا کھا لیجئے (اُس زمانہ میں پانچ روپیہ میں کھانا کھایا جا سکتا تھا) مگر خدارا یہ بھیک مانگ کر اخبار نویسوں کی توہین نہ کرائیے کہ اتنے میں ساحرؔ صاحب نے میرے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے رام نگری صاحب کو ڈنر کارڈ کی بھیک دے دی اور وہ مُسکراتے ہوئے کھانے کی میز پر چلے گئے۔ کھانے کی میز پر اکثر شعراء اور مسٹر رام نگری ایسے مدعوئین کھانے پر اس طرح جھپٹ رہے ہیں جیسے کئی دنوں سے فاقہ زدہ ہیں۔ کلب کے بیرے ان حضرات کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور روزنامہ "ملاپ" کے شاعر خصوصی مسٹر رام کرشن مُضطر لکھوڑوی (جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا کلام ہر روز صبح سویرے دو لاکھ اشخاص کی نظر سے گزرتا ہے) شکایت کر رہے ہیں کہ ایک تو انھیں شراب کم ملی ہے اور اب کھانے کی کوئی چیز ان تک پہنچنے نہیں پاتی کہ راستہ ہی میں اُچک لی جاتی ہے۔ بعض حضرات پُڈنگ کو چپاتی کی جگہ کھا رہے ہیں اور ان کا ہاتھ اس تیزی سے چل رہا ہے جیسے اونٹ داشتہ آید بکار کے طور پر اپنے کوہان میں ہفتہ بھر کی خوراک بھر لیتا ہے۔

مشاعرۂ یوم چکبست ۷ راگست ۱۹۵۰ء میں جب اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب جناب نوحؔ ناروی کے نواسے سہیلؔ ناروی کلام سنائیں گے تو گوپال متل صاحب نے پنڈت ہری چند اخترؔ سے پوچھا کہ نواسۂ فلاں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر پنڈت ہری چند اخترؔ فرمانے لگے کہ چونکہ نواسہ بیٹی کا مُربعہ ہوتا ہے۔ یعنی بیٹی ضرب بیٹیا مساوی ہے نواسہ کے۔ اخترؔ صاحب کے ریاضی داں ہونے کا سکہ پاس بیٹھے تمام شعراء مان گئے ہیں اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہیں۔

مشاعرہ یوم چکبست میں ہی جناب نقش صحرائی نے یہ مطلع سُنایا۔ ؎

مقدر سوز بھی ہے ساز بھی ہے
یہ تیر انداز چارہ ساز بھی ہے

پنڈت ہری چند اخترؔ فرما رہے ہیں کہ مطلع میں ایطائے جلی ہے مگر نہ معلوم اخترؔ صاحب نے اس امر کو ذہن میں کیوں نہیں رکھا کہ ایطائے جلی جب ہوتا ہے کہ قافیہ ہم معنی ہو جائے۔ اور اس مطلع میں دونوں جگہ معنی جُدا جُدا ہیں لہٰذا اعتراض غلط ہے۔

مشاعرہ چیمسفورڈ کلب نئی دہلی ۲ر جنوری ۱۹۵۲ء میں کسی سفارشی شاعر ممتاز شاہجہاں پوری نے یہ شعر پڑھا ؎

کیوں فریب عشق دے کر اب انھیں رُسوا کریں
خود تو دھوکا کھا چکے ہیں آرزوئے دل سے ہم

ممتاز کو داد بالکل نہیں مل رہی تھی اس پر بسمل شاہجہانپوری شعراء سے کہہ رہے ہیں کہ بھائی داد دو۔ روشنؔ دہلوی فرما رہے ہیں کہ کس کو داد دیں۔ پنڈت ہری چند اخترؔ فرمانے لگے کہ ہماری اپنی داد کا اسقاط ہو گیا ہے۔ ذرا دیکھیے

تو دل کا قافیہ کیا مزے کی تکرار سے آیا ہے۔

مشاعرہ محولہ بالا میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے گلزار دہلوی کا نہایت موزوں الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ آپ پروفیسر ہیں جس پر پنڈت ہری چند اخترؔ فرما رہے ہیں کہ محض پروفیسر ہی نہ کہیے بلکہ پروفیسر دہلی کلاتھ ملز کہیے۔ کنورؔ صاحب مسکراتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ آپ خاندانی شاعر ہیں آپ کے والد محترم دہلی کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ اور اُن کے بھائی بہن۔ اور والدہ محترمہ بھی شعر کہتی ہیں۔ پنڈت ہری چند اخترؔ فرما رہے ہیں بلکہ محلہ والوں پر بھی ان کی وجہ سے شاعری کا دَورہ پڑنے لگا ہے۔ ابھی قہقہے لگ ہی رہے تھے کہ گلزار صاحب نے یہ قطعہ پڑھا ؎

بھر سے اُلفت کا ہائے دم کے فریب
دام گیسو میں کس لیا مجھ کو
پی کے بادہ میرے ہی ساغر سے
ایک ناگن نے ڈس لیا مجھ کو

اس پر کنور صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرات قبلہ داغؔ فرما گئے ہیں ؎

خُدا دراز تمھارا کچھ اور سن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خُدا وہ دن تو کرے

کنور صاحب نے گلزارؔ پر جو چوٹ کی ہے۔ اس پر سامعین میں ہنسی کا ایک طوفان بپا ہو گیا ہے۔ ذرا خاموشی ہوئی تو اتنے میں گُلزار صاحب سنبھل چکے تھے فرمانے لگے حضرات ہمارے ایک ساتھی جو اخبار پرتاپ میں کام کرتے ہیں (خان غازی کابلی) ان کا ایک شعر ہے ؎

ہم محبت کی نظر رکھتے ہیں سردار پہ بھی   واسطہ ہم کو فقط ہندو مُسلم سے نہیں

گلزار کی اس حاضر جوابی نے محفل کو دیوار قہقہہ بنا دیا ہے ہنسی کا دَورہ کچھ رُکا تو کنورؔ صاحب فرمانے لگے خیر مجھے تو کیا البتہ میرے سکھ بھائیوں کو جن کی خُدا کے فضل سے اس کلب کے ممبران میں بہت زیادہ تعداد شامل ہے خوشی ہونی چاہیے کہ اُن پر بھی کوئی عاشق ہے۔ کنور صاحب کے اس فرمان پر ہنسی پھر عروج پر پہنچ گئی ہے۔

اب کنور صاحب نے مسٹر جگن ناتھ آزادؔ کو کلام سُنانے کی گُزارش کی ہے۔ کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ دہلی میں تین خاندانی شاعر ہیں۔ گلزارؔ، عرشؔ اور آزادؔ۔ آزاد صاحب کی لحن میں سوز ہے۔ پنڈت ہری چند اخترؔ کہہ رہے ہیں کہ سوز ہے یا نہیں البتہ ساز ضرور ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی کنور صاحب نے وسکی کا ایک گھونٹ پی کر گلاس رکھا ہی تھا کہ آزادؔ صاحب نے گلاس اُٹھا کر وسکی پینی شروع کر دی ہے۔ اس پر کنورؔ صاحب فرمانے لگے۔ اِسے کہتے ہیں سرقہ بالجبر۔

مسٹر گول سپرنٹنڈنٹ پولیس فرما رہے ہیں حُکم ہو تو سرقہ بالجبر پر ہتھکڑی لگا دوں۔ آزادؔ صاحب نے ایک قطعہ پڑھا ہے اور پھر کنور صاحب کے گلاس سے ایک گھونٹ وسکی کا پیا ہے۔ جس پر ہری چند اخترؔ فرما رہے ہیں کہ کنور صاحب اور آزادؔ صاحب باری باری مصرع کہہ رہے۔ کنورؔ صاحب میکروفون کو ہاتھ میں کچھ عجیب انداز سے تھامے ہوئے ہیں جن پر جناب شنکر پرشاد چیف کمشنر دلّی فرما رہے ہیں کہ دیکھیے اس وقت کنور صاحب کے ہاتھ میں پیچوان ہے۔

"ہم سبھوں کے نامۂ اعمال میں دھرا ہی کیا ہے جس پر سر اٹھا کر چلیں۔ بابا آدم سے روایت چلی آرہی ہے کہ لوگ اپنا ذکر اپنے اسلاف سے کرتے ہیں تاہم کرشن چندر نے ڈھارس بندھائی کہ ہر آدمی ایک تاریخ ہوتا ہے۔"

——— عابد علی خاں

بحوالہ آپ بیتی نمبر
فن و شخصیت، بمبئی

ایں گناہیست

کہ در شہرِ شما نیز کنند

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے چھوٹے کنور زادے کی شادی خانہ آبادی اپنے انداز کی ایک بے مثال شادی خانہ آبادی تھی۔ کناٹ سرکس کے نزدیک ہی ایک کوٹھی شادی کی تقریبات کے لیے عاریتاً حاصل کی گئی جس میں سات دن تک شادی کا وہ جشن رہا کہ پھر ایسا شاہانہ جشن کسی اور شادی میں دیکھنے میں نہ آیا۔

برات چڑھنے سے قبل ایک رات دعوتِ عام تھی۔ دعوتِ عام یوں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور جنوں وزراء / سفراء کے علاوہ ہزاروں امراء اعلیٰ حکام کے ساتھ پہلوانوں، مرغ لڑانے والے، بٹیر لڑانے والوں، پتنگ بازوں، موسیقاروں، قوالوں، شعرائے کرام اور فلمی اداکاروں کا ایک ایسا جمِ غفیر تھا کہ پھر کسی دوسری شادی میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کا ایسا مُنہ بولتا منظر دیکھنے میں نہ آیا۔ شراب نوشی کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایسے محترم جو چند انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، ان حضرات کے علاوہ ہر کوئی اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ قریباً ایک صد بیرے خوبصورت TRAYS میں قرینے سے رکھے ہوئے وہسکی کے گلاس اور سوڈے کی بوتلیں لیے بھاگے پھر رہے تھے۔ اور یار لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ شاید پھر ایسی محفل نصیب ہو کہ نہ ہو یا زندہ رہیں یا نہ رہیں آج تو وہسکی کی حسرت پوری کر لی جائے۔

مرحوم سلام مچھلی شہری، عزیز وارثی اور کئی دوسرے شعرائے کرام ٹرے میں رکھے چار پانچ گلاسوں کی وہسکی اپنے اپنے گلاسوں میں انڈیل لیتے تو بیرے پھٹے پھٹے دیدوں سے یوں دیکھتے کہ ایسے ندیدے بھی اس دنیا میں ہیں۔

مرحوم ملہوترہ صاحب ثاقب رزلامی بھی مدعوئین میں سے تھے اور ساتوں دن وہ میرے ہی ساتھ اس جشن میں شریک ہوتے رہے۔ اس جشن میں ہم دونوں نے شراب بہت کم پی مگر یار لوگوں کی حرکات کا نظارہ خوب خوب کیا۔ ایک شاعر بنا ادیب نہ معلوم گھر سے ہی کوٹ کی اندرونی جیب میں خالی چپٹا ادھالے کر آئے تھے یا کسی بیرے سے حاصل کیا، جونہی کوئی بیرا ٹرے میں وہسکی کے گلاس لاتا تو وہ جھٹ دو تین گلاسوں کی وہسکی اپنے گلاس میں انڈیل لیتے مگر سوڈا نہ ڈلواتے اور یہ کہتے کہ میں نیٹ (بغیر سوڈا یا پانی ملائے) ہی پیتا ہوں۔ اور نظر بچا کر ادھا کوٹ کی جیب سے نکالیں اور وہسکی کا اکثر حصہ اس میں ڈال کر پھر جیب میں رکھ لیں اور ایک آدھ گھونٹ پی کر پھر کچھ دُور جا کر کھڑے ہو جاتے تاکہ کسی دوسرے بیرے کی ٹرے پر شب خون مار سکیں۔ یہ صاحب اب بھی ایک روزنامے میں کام کرتے ہیں مگر انھوں نے مجھے قسم دے رکھی ہے کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ آپ کو بھی قسم ہے کہ ان کا نام دریافت کرنے کی ضد نہ کیجیے گا۔

حضرت جوش ملیح آبادی معہ اپنے برادرِ خورد جناب رئیس احمد خاں اور کئی بستہ برداروں کے ساتھ تشریف لائے۔ ظاہر ہے کہ حضرت جوش کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (اُن دنوں آپ نائب صدر جمہوریہ ہند تھے) ایسے سرکردہ حضرات کی صف میں جگہ ملی اور ان کے بھائی اور دیگر حضرات جس کے جہاں سینگ سما سکے وہیں احباب میں گھل مل کر شراب کی پیاس بجھانے لگے ——— جناب جوش اور ان کے بھائی شراب کے معاملے میں اگر اپنی زر خرید ہو تو، انتہائی کنجوس تھے اور گھڑی رکھ کر مقررہ مقدار میں پیتے تھے اور اگر مفت کی ہو تو دونوں بھائی بڑی فراخدلی کا مظاہرہ فرماتے اور گھڑی کیا بقول مجاز مرحوم گھڑا سامنے رکھ کر پینے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ محض پروپیگنڈا ہے کہ جوش صاحب ایک گھنٹے میں صرف چار پیگ ہی پیتے تھے۔ مگر میں نے خود اور دہلی کے کئی احباب نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ اکثر مشاعروں اور پارٹیوں میں وہ آٹھ آٹھ پیگ تک پی گئے ——— رئیس احمد خاں شراب نوشی کے سلسلے میں پیگ، پیگ نہیں تھے مگر اس دعوتِ عام میں انھوں نے جس کثرت اور تیزی سے پیگ لنڈھائے اسی قدر تیز روی سے مرغ و ماہی سے بھی انصاف فرمایا۔ نتیجتاً لان کے ایک طرف جا کر الٹی کی اور سوڈے سے کلی کر کے پھر پینے لگ گئے ——— عزیز وارثی تو خیر ہر بار نفت کی شراب پینے کے بعد الٹی کرتے ہی ہیں مگر اس دعوتِ عام میں تو انھوں نے کئی بار الٹی کی اور ہر الٹی کے بعد پہلے سے زیادہ شراب پی۔

ایک صاحبہ جو دہلی کے ادبی حلقوں میں اُن دنوں شباب شعر اور شراب کی تثلیث سمجھی جاتی تھیں اس دعوتِ عام میں پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر تشریف لائیں۔ ملہوترہ صاحب بلا کے حسن پرست اور حسن شناس تھے، فرمانے لگے . . . یار سرور یہ آفتِ جاں کون ہے . . . ؟ میں نے تعارف کرایا، تو ملہوترہ صاحب نے جھٹ سے اپنی قیام گاہ ہوٹل 'نزولہ' میں دوسرے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت دے دی وہ یوں کہ دوسرے دن رات کا کھانا تو برات کے ساتھ دلہن والوں کے ہاں تھا۔ میں کچھ وقت تک جناب وہی، شنکر صاحب سے بات چیت میں مصروف رہا۔ چند منٹ کے بعد جناب وہی شنکر سے اجازت لے کر واپس لوٹا تو ملہوترہ اور اُن صاحبہ کو غائب پایا۔ ہزاروں کا مجمع طویل و عریض کوٹھی کا لمبا چوڑا لان قریباً نصف گھنٹہ تک تلاش کرنے پر بھی ان دونوں کا پتہ نہ چلا تو میں دوسرے دوستوں کے ساتھ محمد رفیع کے گانے سنتا رہا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ یہ دونوں متوالے دوسرے دن کا انتظار کیے بغیر اسی وقت نزولہ ہوٹل چلے گئے تھے۔ آخر کچھ ذاتی ضرورتیں بھی تو ہوتی ہیں انسان کی۔

ایک دوسرے شاعر اور ادیب جو کچھ عرصہ فلمی شاعر بھی رہے ہیں، کا یہ واقعہ تو دلّی بلکہ بمبئی کے شعراء اور ادیبوں میں ایک عرصہ تک موضوعِ سخن رہا تھا کہ انھوں نے اشوک ہوٹل کی ایک پارٹی میں ایک فلمی مہمان کے کمرے کے غسل خانے کی نالی کی جالی چوری کر لی تھی تاکہ وہ اپنے زیرِ تعمیر مکان کے غسل خانے کی نالی پر لگوا سکیں۔ یہ جالی چور حضرت بھی اس دعوتِ عام میں شریک تھے ——— جس قدر بہتر شراب پی رہے تھے اتنے ہی اچھے اشعار بھی سُنا رہے تھے (اپنے نہیں)۔ ایک فلمی اداکار فرمانے لگے . . . سرور صاحب پارٹی کے بعد ان حضرت کی تلاشی لینے کے لیے بیروں سے ضرور کہہ دیجیے گا، ورنہ کم از کم ایک درجن چمچوں کی خیر نہیں ہے۔ آخر ان صاحب کو اپنے تعمیر ہونے والے مکان کے کچن میں چمچوں کی بھی تو ضرورت ہو گی نہیں، اس پر ایک طویل قہقہہ لگا مگر یہ صاحب سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے پینے میں مصروف رہے۔

مخمد رفیع (مرحوم) اپنے کمال کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہر پینے والا شراب اور مرغ و ماہی کی کئی کئی

تہیں معدے میں جما چکا تھا۔ مُفت کی شراب میں ویسے بھی مستی زیادہ ہوتی ہے۔ اس پر رفیع کی مسحور کن آواز۔ لہٰذا موسیقی کی یہ محفل ایسی جمی کہ میں نے پھر کبھی رفیع صاحب کو ایسی مستی میں گاتے ہوئے نہیں سُنا۔ یار لوگ مستی کے اس عالم میں کچھ پتے کی باتیں بھی کہہ جاتے تو لُطف دو بالا ہو جاتا۔

دہلی کے ایک فلمی پرچے کے مالک ایڈیٹر جو اُن دنوں صحافت کے لفظی معنوں سے بھی نا آشنا تھے کہنے لگے: رفیع ہے تو نائی کا بچّہ نہ معلوم اس کی تان میں ربڑ کی سی لچک کہاں سے آجاتی ہے . . . رفیع صاحب کے انتقال پر ان صاحب نے بھی اپنے رسالے کا 'رفیع نمبر' شائع کیا ہے۔ وہی نائی کا بچّہ مرنے کے بعد بھی اس نا اہل کے لیے خاصی روزی کا انتظام کر گیا —— نہ معلوم شراب پینے کے بعد اکثر پینے والے اپنی اوقات کیوں بھول جاتے ہیں۔

چلتے چلتے اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سُن لیجیے —— شادی میں شریک ہونے والے سینکڑوں حضرات جب تنبول اور شگُن کے طور پر نقد روپیہ کنور صاحب کو پیش کرنے لگے تو کنور صاحب نے کچھ اصحاب کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ شگُن دینے والوں کے نام اور روپیہ کی مقدار لکھتے جائیں۔ کنور صاحب رَوا رَوی میں ایک شاعر کو بھی اس خوش گوار اور مفید ڈیوٹی پر تعینات کر گئے۔ کنور صاحب کو روپیہ پیسہ کے معاملہ میں بہت کم یاد رہتا ہے —— اور شادی کے اس ہنگامے میں تو انھیں یہ کہاں یاد رہتا کہ انھوں نے کس کس صاحب کی ڈیوٹی تنبول یا شگن کا روپیہ وصول کرنے اور اس کی تفصیل پر لگائی ہے۔ اس ڈیوٹی پر فائز باقی سب ذمہ دار اصحاب نے اپنا فرض ایمانداری سے نبھایا۔ مگر شاعر صاحب شگُن دینے والوں کے ناموں کی تفصیل معہ روپیہ جیب میں ڈال چپکے سے چلتے بنے۔ یہ راز کی بات ہم دو چار دوستوں کو ہی معلوم ہے۔

اِس پر بھی آپ کو شکوہ ہے کہ سرور تونسوی نے شاعری کیوں چھوڑ دی؟

یاد کسی کی
ساون سی

ماہنامہ 'شمع' کے مالکان پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فلم سازی کے باعث انھیں اٹھائیس لاکھ روپیہ کا نقصان ہونے کی وجہ سے 'شمع معمہ' کے انعامات کی ادائیگی تک کرنا بھی مشکل ہوگئی ——— مگر قبلہ حافظ محمد یوسف دہلوی کی قوتِ ارادی، بلند حوصلگی اور دیانت داری کے باعث رب العزت نے انھیں اس کڑے امتحان میں بھی سُرخرو رکھا۔

انہی دنوں دہلی کے مشہور کاغذی میسرز جے، این سنگھ کا بھی کافی روپیہ 'شمع' کے ذمے واجب الادا ہوگیا تو میسرز جے، این سنگھ نے روپیہ کی فوری ادائیگی کے لیے 'شمع' کو نوٹس دیا۔ نوٹس موصول ہونے پر حافظ صاحب میسرز جے، این سنگھ کے مالکان سے ملے، اور طے پایا کہ آئندہ سے کاغذ ہر ماہ نقد خریدا جائے گا۔ اور سابقہ بقایا میں سے ایک ہزار روپیہ ماہوار ادائیگی ہوتی رہے گی مگر اس باہمی فیصلہ کے باوجود میسرز جے، این سنگھ والوں نے 'شمع' پر دیوانی مقدمہ دائر کر دیا۔

عدالت سے سمن موصول ہونے پر حافظ صاحب پھر مالکان میسرز جے، این سنگھ کے ہاں گئے اور ان سے باہمی فیصلہ ہوجانے کے باوجود مقدمہ دائر کرنے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے . . کہ روپیہ وصولی کی میعاد تین سال پوری ہو رہی تھی اس لیے مقدمہ دائر کرنا ضروری تھا۔ حافظ صاحب نے کہا کہ یہ معمولی بات تھی، میعاد گزر بھی جاتی تو کیا تھا باہمی فیصلہ کے مطابق آپ کو ہر ماہ ایک ہزار روپیہ ادا ہوتا رہتا اور اگر آپ کو بداعتمادی تھی تو کاغذات نئے سرے سے تحریر کیے جا سکتے تھے ——— مگر جب ستارہ گردش میں ہوتا ہے تو دیرینہ دوست بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔ لہٰذا میسرز جے، این سنگھ کے مالکان نے گزشتہ چوتھائی صدی کے تعلقات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے عدالتی کارروائی کو حق بجانب قرار دیا۔

تاریخ مقررہ پر حافظ صاحب وکیل کی معیت میں عدالت میں پیش ہوئے اور جواب دعویٰ پیش کر دیا۔ اور عدالت نے آئندہ پیشی ڈال دی ——— دیوانی مقدمات کچھ تو ویسے ہی طوالت کھینچ لیتے ہیں اور پھر حافظ صاحب نے اپنے وکیل کو ہدایت کی کہ جیسے بھی ہو مقدمہ کو زیادہ سے زیادہ طول دیا جائے۔ لہٰذا عدالتی کارروائی کچھوے کی چال چلتی رہی اور ادھر حافظ صاحب نے کاغذ کالین دین کسی دوسری فرم سے طے کر لیا۔ مگر جے۔ این سنگھ والوں کے لیے ایک ہزار روپیہ ہر ماہ بنک میں الگ جمع کراتے رہے۔

کافی طویل عرصہ کے بعد مقدمہ کا جب فیصلہ ہوا تو وہ جے۔ این سنگھ والوں کے خلاف تھا اس پر بھی حافظ صاحب نے جے۔ این سنگھ والوں سے کہا کہ میں اب بھی باہمی فیصلہ پر قائم ہوں۔ لہٰذا ایک ہزار روپیہ

ماہوار کے حساب سے جو روپیہ جمع ہے وہ لے لیجیے اور باقی روپیہ ہر ماہ ایک ہزار کے حساب سے ادا ہوتا رہے گا۔ مگر جے این سنگھ والوں نے کہا کہ وہ مقدمے کے جملہ اخراجات کے علاوہ روپیہ کا سود بھی لیں گے۔ اس پر حافظ صاحب خاموش ہو رہے اور جے، این سنگھ والوں نے عدالتی فیصلے کے خلاف اپیل کر دی۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد اس اپیل کا فیصلہ بھی جے، این سنگھ والوں کے خلاف ہوا۔

مدعی اپیل کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں جا سکتا تھا مگر اس سلسلے میں کئی قانونی رکاوٹیں ایسی تھیں کہ مدعی نے ہائی کورٹ میں نہ جانا ہی مناسب سمجھا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ جب جے، این سنگھ والوں کو اچھی طرح یہ ذہن نشیں ہو گیا کہ اب یہ روپیہ وصول ہونے کی کوئی امید نہیں تو اچانک حافظ صاحب اُن کے ہاں گئے اور کہا کہ باہمی فیصلہ کے مطابق ایک ہزار روپے کے حساب سے اب تک جو روپیہ ہوتا ہے اُس کا یہ چیک لیجیے۔ اور جو بقایا رہ گیا ہے وہ حسبِ وعدہ ایک ہزار روپیہ ماہوار آپ کو ملتا رہے گا۔ جے، این سنگھ والوں نے حافظ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ ہمیں آپ کو سمجھنے میں غلطی ہو گئی، معاف کر دیجیے اور پھر سے حسبِ سابق کاغذ کا لین دین جاری کر دیجیے مگر حافظ صاحب نے فرمایا کہ آپ کا قرض ادا کرنا میرا فرض ہے، مگر میں اب کاغذ آپ سے کبھی نہیں خریدوں گا۔

جے، این سنگھ کے سب بزرگ مالکان انتقال فرما چکے ہیں اور جے، این سنگھ والوں کا کاروباری ستارہ جو اُس وقت نصف النہار پر تھا، اب ڈھل چکا ہے۔ مگر اس فرم کے دیرینہ ملازمین اب بھی حافظ صاحب کی دیانت داری اور ایمان داری کا تذکرہ اپنے نادہندہ گاہکوں سے کرتے ہوئے انھیں حافظ صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

■■

اکیس

پڑھا اور بیٹھ گئے۔ گوہر صاحب نے مائیک سنبھالا اور بیگم صاحبہ کے تعارف میں اپنی تمام چرب زبانی ختم کرنے کے بعد انھیں کلام سنانے کی عاجزانہ درخواست کی۔ شاعری، شراب اور ترنم کی یہ تثلیث مائک پر آئی تو ہزار ہا سامعین کا مجمع مبہوت ہو کر رہ گیا۔ غزل کا ہر شعر دل و دماغ کو چھونے والا۔ ترنم ایسا کہ اگر داؤد سن لے تو اپنی لحن بھول جائے۔ اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے گوہر صاحب نے اشاروں سے بیگم صاحبہ کو یہ بتا دیا تھا کہ سرور تونسوی یہ ہیں۔ یہ اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ بیگم صاحبہ ابھی کلام سنا ہی رہی تھیں کہ میں چپکے سے اسٹیج سے اتر رکشا لے چاندنی محل کی طرف چل دیا کیونکہ یہ میں نے سن رکھا تھا کہ مشاعروں کی رُوداد میں جن شعرا کی پول کھولی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ سے سرور تونسوی کی بے عزتی کرائی جائے اور اس کی تصدیق بعد میں بیگم صاحبہ نے فرمائی۔

ہارڈنگ لائبریری میں مشاعرہ تھا۔ میں اور نقش[1] صحرائی صاحب ٹکٹ خرید کر سامعین میں جا بیٹھے۔ مشاعرے کی رُوداد کے لیے میں مختصراً نوٹ لکھ رہا تھا کہ یکدم ہال میں سناٹا چھا گیا۔ جو شاعر کلام سنا رہے تھے وہ بھی خاموش ہو گئے دیکھا تو یہ آفتِ جاں تشریف لائی ہیں۔ امریکی جارجیٹ کی سفید براق ساڑھی، گیسو تراشیدہ، آہو چشم، سرخ و سفید رنگ ہونٹوں پر مشہورِ زماں 'ماٹو' لپ اسٹک کا سرخ رنگ چغلی کھا رہا تھا کہ جیسے ابھی کسی عاشقِ زار کا خون پی کر آئی ہوں۔ چال ایسی کہ ہر قدم پر ہزاروں دل فرشِ راہ بننے کی تمنا رکھیں۔ شریع داڑھیاں ہلنی شروع ہو گئیں۔ نقش صحرائی فرمانے لگے . . . سرور صاحب یہ کون ہیں؟ عرض کیا کہ یہی وہ بلبل ہزار داستان ہے جنھیں نکہتِ بادِ بہاری بھی اپنا حریف سمجھتی ہے۔ اس مشاعرہ کی رُوداد جب 'شانِ ہند' میں شائع ہوئی تو اس رُوداد میں اس شاعرہ کا ذکر جس پیرائے میں کیا گیا تھا اُسے اتنا سراہا گیا کہ 'نرالی دُنیا' اور دیگر کئی رسائل و جرائد نے اس حصہ رُوداد کو شائع کیا جس پر حاسدوں نے بیگم صاحبہ کے کان بھرے کہ سرور تونسوی آپ کو اتنا بدنام کر رہا ہے کہ اب دوسرے رسائل و جرائد بھی سرور تونسوی کی وہ تحریر شانِ ہند سے اخذ کر کے شائع کر رہے ہیں جس میں آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مگر ان بدبخت حاسدوں کو نسوانی خاصیت کا تجربہ ہی نہ تھا کہ خدا نے آج تک ایسی عورت پیدا ہی نہیں کی جو اپنی تعریف سے خوش نہ ہوتی ہو یا اپنے آپ کو خوبصورت نہ سمجھتی ہو۔ چنانچہ یہ حاسد شانِ ہند کی رُوداد بیگم صاحبہ کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور وہ دل ہی دل میں اپنے حسن اپنے سراپا، اپنے کلام، اپنے ترنم اور فراخ دلی کی تعریف سن سن کر ایڈیٹر شانِ ہند کی مدّاح بنتی گئیں۔

غالباً لال قلعہ کا ہی مشاعرہ تھا کہ جونہی یہ بیگم صاحبہ تشریف لائیں بجلی فیل ہو گئی۔ جب شانِ ہند میں اس مشاعرہ کی رُوداد شائع ہوئی تو لکھا گیا کہ جونہی . . صاحبہ مشاعرہ میں جلوہ افروز ہوئیں بجلی کے قمقمے ان کے حسنِ جہاں تاب کی جلوہ سامانی نہ دیکھ سکے اور انھوں نے ندامت سے اندھیرے میں منہ چھپا لیا۔ ہائے ظالم میر نے اسی موقع کے لیے تو کہا تھا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یار لوگ شانِ ہند لے کر بیگم صاحبہ کے پاس پہنچے اور انھیں سنایا کہ دیکھیے سرور تونسوی نے آپ کو کس انداز میں . . . بدنام کیا ہے۔ مگر بیگم صاحبہ کے دل و دماغ میں ایڈیٹر شانِ ہند کے لیے اور بھی جگہ بن گئی۔ چنانچہ انھوں نے ایک بہت بڑے افسر کو ایک پارٹی میں بتایا کہ جب کچھ لوگ سرور تونسوی کے خلاف مجھے بھڑکانے

---

[1] جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں۔

"میں خود میں فی الحال اتنی ہمت نہیں پاتا کہ اپنی
تمام کمزوریوں، خامیوں اور موقع پرستیوں کی
داستان سناؤں جو چار دھے زندگی نے
مجھ پر مسلط کر رکھی ہیں اور اگر ان کا ذکر نہ کروں
تو آپ بیتی میں لکھوں کیا ——— ؟"

——— حسن کمال
بحوالہ آپ بیتی نمبر
فن و شخصیت، بمبئی

مُشترى هُشيار باش

تقسیمِ ملک سے پہلے تین مشتہرین ایسے تھے جو "مشتری ہشیار باش" کی معنوی تفسیر تھے۔ یہ تینوں حضرات ہر شام کو جامع مسجد سے متصل سبزہ زار میں اکٹھے ہوتے اور عوام کی جیب سے اشتہار بازی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اور آسان سے آسان طریقہ سے روپیہ نکالنے کی تراکیب سوچتے۔ اس اتحادِ ثلاثہ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ فی ہزار اشاعت پر رسائل کو پانچ روپیہ فی صفحہ اور اخبارات کو اتنی ہی جگہ کے لیے یہی اُجرتِ اشتہار دی جائے گی۔ اس شرط پر ہر رسالہ یا اخبار ان سے جس قدر چاہے اشتہارات حاصل کر سکتا تھا مگر اشتہارات کی اُجرت کی ادائیگی تب ہی ممکن تھی کہ تعدادِ اشاعت کی تصدیق کرائی جائے۔

یہ تینوں حضرات ایک دوسرے سے بڑھ کر فطری اور ذہنی طور پر ایسے شاطر اور نامی مہذب اشتہاری جیب کترے تھے کہ قانونی طور پر بالکل محفوظ، معصوم اور دلی کے خاندانی شریف سمجھے اور جانے جاتے تھے۔
جس طرح ڈاکوؤں کے گروہ کا بھی ایک سردار ہوتا ہے، اُسی طرح اس اشتہاری تثلیث نے بھی ظفر نیازی کو اپنا امام مقرر کر رکھا تھا۔ ظفر نیازی بڑے ہی تیز طرار، چاق و چوبند اور خالص دلی پن کی جملہ خوبیوں کے مالک تھے —— یہ مختلف پریسوں میں جاتے اور رسائل و جرائد کی تعدادِ اشاعت انچی ٹیپ (فیتے) سے نلپتے۔ مثلاً ایک ہزار داب چار انچ موٹائی رکھتی ہے تو تمام چھپا ہوا فرما اسی حساب سے ناپ لیا جاتا تھا جس سے کسی بھی اخبار یا رسالے کی تعدادِ اشاعت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

اُن دنوں روسی نیوز پرنٹ کاغذ ۲۲ × ۱۸ سائز کا چودہ آنے اور ۳۰ × ۲۰ سائز کا ایک روپے چار آنے میں ریم ملتا تھا۔ اچھا خوشنویس ڈیڑھ روپیہ میں ۱۶ = ۳۰ × ۲۰ سائز کے آٹھ صفحات کی کتابت کرتا تھا اور چھپائی ایک ہزار داب کی آٹھ آنے سے ایک روپیہ تک ہوتی تھی۔

ماہنامہ 'شمع' کے بانی الحاج حافظ محمد یوسف صاحب نے 'شمع' کی توسیعِ اشاعت کے لیے ہمیشہ 'شمع' کے مستقل خریداروں اور ایجنٹوں کی تعداد میں اضافہ پر دھیان دیا۔ حالانکہ عام طور پر رسائل و جرائد کے مالکان زیادہ سے زیادہ توجہ اشتہارات کی فراہمی پر صرف کرتے ہیں۔

اُن دنوں 'شمع' اپنی روشنی کی کرنیں پھیلانے میں کوشاں تھا اور مشتہرین کی یہ دہلوی تثلیث حیران تھی کہ شمع کا مالک ان کے حضور حاضر ہو کر حصولِ اشتہار کی درخواست کیوں پیش نہیں کر رہا —— جب 'شمع' کی طرف سے حصولِ اشتہارات کے لیے کوئی بھی سلسلہ جنبانی نہ ہوئی تو مشتہرین کی اس فرعون دماغ ٹولی نے مشورہ کیا کہ ظفر نیازی صاحب شمع کے مالک سے اشتہارات کی طباعت کے لیے گفت و شنید

کریں۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ظفر نیازی صاحب خود دفتر شمع کی تلاش میں نکلے، اور حافظ محمد یوسف صاحب کو دعوت دی کہ وہ اکسیری دواخانہ میں تشریف لائیں۔

حافظ صاحب حسبِ وعدہ اکسیری دواخانہ پہنچے اور علیک سلیک کے بعد جب معاملہ پر بات چیت ہوئی تو انھوں نے بتایا 'شمع' دو ہزار چھپتا ہے جس کی تصدیق ظفر نیازی صاحب پہلے ہی کر چکے تھے۔ لہٰذا نرخ مقررہ پر کچھ صفحات 'شمع' میں اشاعت کے لیے دے دیے گئے اور اس کے ساتھ ہی ظفر نیازی صاحب نے تاکید کی کہ ان کے دوسرے ہم پیشہ حضرات سے بھی اشتہارات لیتے جائیں۔

انڈو جینوئن کے مالک صاحبزادہ مستحسن فاروقی اپنے دو ہم پیشہ حضرات کے مقابلہ میں بدمعاملگی کی صنعت کے بھی حامی تھے۔ اس لیے ان سے تو حافظ صاحب کا نباہ نہ ہو سکا۔ مگر دوسرے دونوں حضرات سے معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔

یہاں تک کہ شمع کی اشاعت چھ ہزار تک پہنچ گئی۔

ریلوے کی ہڑتال یا کسی دوسری وجہ سے نیوز پرنٹ کی کمی ہو جانے کے باعث ایک ماہ 'شمع' کی اشاعت کے لیے کاغذ صرف اتنا میسر آسکا کہ یہ بجائے چھ ہزار کے دو ہزار ہی چھپ سکا ——— لہٰذا حافظ صاحب نے دو ہزار اشاعت کے حساب سے دس روپیہ فی صفحہ اُجرت کا بل بھجوایا تو چند دنوں کے بعد ایک ملاقات میں ظفر نیازی صاحب نے بڑے طمطراق کے ساتھ حافظ صاحب سے کہا کہ آخر پکڑ ہی لی ہم نے آپ کی چوری ——— دوسروں سے دس روپیہ فی صفحہ اُجرتِ اشتہار لیتے ہو اور ہم سے تیس روپیہ فی صفحہ اُجرت لیتے ہو۔ اس مرتبہ تمھارے دفتر کے کلرک نے غلطی سے آپ کے مشورے کے بغیر ہمیں بھی دس روپے فی صفحہ کے حساب سے اُجرت کا بل بھجوایا ہے۔ آخر ہیرا پھیری ایک دن ثابت ہو کر رہتی ہے . . .

ظفر نیازی صاحب کی اس متکبرانہ تقریر پر حافظ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، میاں اس دفعہ شمع چھپا ہی دو ہزار ہے تو بل بھی اسی حساب سے بھجوایا گیا ہے . . . اس پر ظفر نیازی صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ شمع دو ہزار نہیں چھ ہزار ہی چھپا ہے۔ میں نے خود دفتری کے ہاں شمع کا سرورق چھ ہزار گنا ہے ——— اس پر حافظ صاحب نے حقیقتِ حال بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کاغذ نہ ملنے کے باعث شمع دو ہزار ہی چھپا ہے اور اس کا سرورق پہلے ہی چھ ہزار چھپایا جا چکا تھا۔ بقیہ چار ہزار سرورق اب بھی آپ دفتری کے ہاں دیکھ سکتے ہیں . . . اس پر نیازی صاحب کے دماغ کے چودہ طبق کھل گئے۔ اور انھوں نے حافظ صاحب کو گلے لگاتے ہوئے کہا کہ آپ اس قدر ایمان دار ہیں کہ اس کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اب میں کبھی شمع کی تعدادِ اشاعت کے بارے میں تحقیق نہیں کروں گا اور آپ جس رقم کا بھی بل بھجوایا کریں گے ادا کر دیا کروں گا۔

اسی شام ظفر نیازی صاحب نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے سارا ماجرہ سُنایا اور کہا کہ حافظ محمد یوسف پہلا مالک و ایڈیٹر رسالہ دیکھا ہے جس نے دیانت داری کے معاملہ میں مجھے نیچا دکھا دیا ہے۔

کسی وقت شمع میں اشتہارات کی اُجرت غالباً سالم صفحہ کا چار صد روپیہ اور نصف صفحہ کا اڑھائی صد روپیہ فی اشاعت تھا۔ کسی اشتہار دینے والی ایجنسی نے کسی کمپنی سے شمع کے لیے نصف صفحہ کا اشتہار چار صد فی صفحہ اُجرت کے خیال سے دو صد روپیہ میں طے کر کے اشتہار کا مسوّدہ دفتر شمع کو برائے اشاعت

بھجوایا تو دفتر سے جواب گیا کہ نصف صفحہ کی اُجرتِ اشتہار اڑھائی صد روپیہ ہے۔ لہٰذا رلیز آرڈر اڑھائی صد اُجرت کا بھجوائیے ——— اس پر اشتہار بھجوانے والی ایجنسی نے لکھا کہ ہم نے بڑی کوشش کے بعد تو پارٹی سے اشتہار حاصل کیا ہے اور آپ ہیں کہ دو اور اڑھائی صد کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ مگر شمع کے ہاں تو اصول اور قاعدہ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ لہٰذا اشتہار کی اشاعت سے معذوری ظاہر کر دی گئی تو ایجنسی مذکورہ نے پارٹی سے اجازت لے کر بذریعہ تار اطلاع دی کہ اشتہار شائع کیا جائے۔ اُجرت اڑھائی صد ہی منظور ہے ——— اسی دوران کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ہندوستانی رسائل کا داخلہ پاکستان میں ممنوع قرار دے دیا گیا اور شمع کی اشاعت میں کئی ہزار کی کمی آ گئی۔

چنانچہ جب اس اڑھائی صد روپیہ اُجرت کے نصف صفحہ والے اشتہار کا بل اس اشتہاری ایجنسی کو گیا تو وہ دو صد روپیہ سے بھی کم تھا۔ لہٰذا بل دیکھ کر ایجنسی والوں نے دفتر شمع کو خط لکھا کہ آپ کا کاروبار عجیب قسم کا ہے۔ پہلے تو آپ نے دو صد کی بجائے اڑھائی صد روپیہ اُجرت لینے کا تقاضا کیا۔ اور جب ہم نے پارٹی سے یہ اضافہ منظور کرایا تو بل دو صد سے بھی کم کا بھجوا دیا۔ آپ ہمیں اشتہار دینے والی کی نظروں میں ذلیل کرانا چاہتے ہیں، کیوں کہ پارٹی تو یہی سمجھے گی کہ شاید ایجنسی والوں نے از خود روپیہ ہڑپ کرنے کی خاطر شمع والوں کی ضد کا بہانہ بنایا ہوگا ——— مگر دفتر شمع نے جواب میں لکھا کہ رسالہ کم تعداد میں چھپا ہے، لہٰذا ہم اُجرتِ اشتہار اسی لحاظ سے لیں گے . . . اس پر ایجنسی والوں نے لکھا کہ اشاعت کی کمی بیشی کا آپ سے کون حساب مانگ رہا ہے۔ آپ سے جو اُجرت طے ہو چکی ہے آپ وہی لے لیجیے . . . مگر شمع کے دفتر نے جواب دیا کہ ایسا کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ ہم نے تمام مشتہرین اور اشتہار دینے والی ایجنسیوں کو سرکلر بھجوا دیا ہے کہ پاکستان میں شمع کی ترسیل بند ہونے کے باعث اس کی تعدادِ اشاعت میں جو کمی آئی ہے ہم اسی لحاظ سے اُجرتِ اشتہار کے بل بھی کم اُجرت کے بھجوا رہے ہیں۔

آج شمع کی اس ایمانداری اور دیانت داری کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی مشتہر تعدادِ اشاعت دریافت ہی نہیں کرتا، بلکہ یہ دریافت کرتا ہے کہ ہمیں اشتہار کے لیے جگہ مل سکتی ہے یا نہیں۔

بَرِیُٹھا مَاسُٹر

پینتالیس سال ہوئے کہ شاعرِ رومان (خودساختہ) افضل پشاوری ملتان چھاؤنی میں مقیم تھے اور گورہ پلٹن کے لانڈری کنٹریکٹر تھے ——— افضل صاحب نے ملتان چھاؤنی میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی جس میں رہائش کے علاوہ لانڈری کا کام بھی ہوتا تھا، پچاسوں دھوبی ان کے ہاں ملازم تھے۔ دن بھر گورے فوجی سیٹیاں بجاتے ہوئے آتے اور اپنے کپڑے دھونے یا پریس کرنے کے لیے دے جاتے اور دُھلے ہوئے تیار کپڑے لے جاتے ——— افضل صاحب کو خاصی آمدنی تھی، چنانچہ شراب، طوائف اور شاعری کی تثلیث نے انھیں اپنی لپیٹ میں ایسا لیا کہ دُنیا و مافیہا سے کافی حد تک بے خبر رہنے لگے۔

احمد یار کا تانگہ انھوں نے مُستقل طور پر تین رُوپیہ یومیہ میں بُک کر رکھا تھا۔ صُبح دس بجے کے قریب احمد یار اُن کی کوٹھی پر تانگہ لاکر کھڑا کر دیتا اور جہاں دھوبی برآمدے میں کپڑے پریس کرتے وہاں بیٹھا رہتا۔ افضل صاحب کو جب بھی کہیں صدر بازار میں یا فوجی دفاتر میں جانا ہوتا تو احمد یار کو آواز دی جاتی اور وہ بڑی مستعدی سے 'جی حُضور' کہتا ہوا تانگہ کی جھاڑ پونچھ شروع کر دیتا ——— مگر ہر شام کو افضل صاحب بازارِ حُسن بیرونِ حرم دروازہ میں گانا سننے ضرور جاتے اور ہفتہ میں دو ایک بار حُسین آگاہی سے ذرا آگے باغ سے ملحق سناتن دھرم ہائی اسکول (اب معلوم نہیں اس اسکول کا کیا نام ہوگا) کے پاس ایک کال گرل کے ہاں بھی پھیرا ڈالتے۔

چھاؤنی میں ایک قالین فروش محمد حسین کشمیری بڑے کینڈے کے چرب زبان اور گپ باز تھے اور جُملہ کشمیری صفات خُدا نے انھیں وافر عطا کی تھیں۔ انھوں نے افضل صاحب کی شاعری کی بے تحاشا داد دے دے کر ان کا قُرب حاصل کر لیا تھا اور ایک نوجوان برنس مین جو شراب کا رسیا تھا، اس نے بھی افضل صاحب سے رسم و راہ بنا رکھی تھی، لہٰذا یہ دونوں حضرات افضل صاحب سے مُفت کی شراب پیتے، تانگے میں سیر کرتے اور رات کو مُفت کا گانا بھی سُنتے۔

افضل پشاوری ان دنوں شاعری کے لحاظ سے فعلن، فعولن کی صحیح املا بھی نہیں جانتے تھے مگر انھوں نے 'ترویج اُردو' کے نام سے ایک بزم قائم کر رکھی تھی اور یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ یہ نوآموز اور مبتدی حضرات کے کلام کی اصلاح اُجرتاً کرتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں جو خطوط مبتدی شعراء کو لکھے جاتے ان میں سے ایک خط بہاول پور کے کسی صاحب کو لکھا ہوا ایڈیٹر 'شانِ ہند' کے ہاتھ لگا تو اس میں افضل صاحب کے

اپنے قلم سے لکھی ہوئی یہ تحریر تھی۔۔۔ "ہم تین آنے فی اشعار اصلاح کی اُجرت لیتے ہیں۔۔۔" اُن دنوں 'شانِ ہند' مُلتان کا ایک باوقار ہفت رُوزہ تھا۔ افضل صاحب کا یہ خط 'شانِ ہند' میں شائع کیا گیا تو عوام کو پتہ چلا کہ مُبتدی شعراء کے کلام کی اصلاح کرنے والے حضرت 'فی اشعار' لکھتے ہیں، چنانچہ اس خط پر ایسی لے دے ہوئی کہ افضل صاحب مجھے اور 'شانِ ہند' کو اپنا مخالف سمجھنے لگے۔

جناب غنچہ امروہوی (مرحوم)، جناب قیصر ہوشیارپوری، جناب ظفر ادیب اور راقم الحروف کا ایک الگ محاذ سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا افضل صاحب اور ان کے شرابی حواری ہم سب کی مخالفت اپنا ایمان سمجھتے تھے مگر افضل صاحب اور ان کے جملہ حواری سوائے شراب نوشی اور حرام کاری کے ادبی طور پر سب کے سب جاہلِ مطلق تھے لہٰذا میں نے ایک خیالی مشاعرہ لکھا جس کا عنوان تھا 'دھوبی گھاٹ کا مشاعرہ' یہ خیالی مشاعرہ 'شانِ ہند' میں چھپا اور اس قدر مقبول ہوا کہ مُلتان کے علاوہ جہاں جہاں بھی شانِ ہند جاتا تھا ہر شہر اور قصبہ سے اس کی تعریف میں خطوط آئے۔ اس خیالی مشاعرہ کی اشاعت کے بعد افضل صاحب کی طرف سے محمد حسین کشمیری راقم الحروف سے ملے اور کہا کہ افضل صاحب آپ کے ہاں آنا چاہتے ہیں۔ وقت مقرر ہوا اور افضل صاحب اکیلے ہی غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔ اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ ہم سب کی آپس میں صُلح ہو جانی چاہیے اور یہ 'ادبی' لڑائی ختم سمجھی جائے۔

دوسرے دن میں نے ظفر ادیب صاحب اور غلام حسین قیصر صاحب سے صلاح و مشورہ کیا اور قبلہ غنچہ صاحب کی اجازت سے ہم سب اکٹھے ہو گئے اور افضل صاحب نے محمد حسین کشمیری کو اپنے حواریوں میں سے نکال دیا۔ کیوں کہ یہی محمد حسین کشمیری ہی اپنی چرب زبانی اور غیر ذمہ داری کے باعث ہم سب میں پھوٹ ڈلوانے کی سب سے بڑی وجہ تھا۔

افضل صاحب کا کاروبار بڑا وسیع تھا، لہٰذا آمدنی بھی اُسی لحاظ سے نہایت ہی معقول تھی۔ مُلتان کی گرمی مشہور ہے، لہٰذا گورہ پلٹن موسم گرما میں ڈلہوزی چلی جاتی اور افضل صاحب کو بھی لانڈری کنٹریکٹر ہونے کے باعث گورہ پلٹن کے ساتھ ہی معہ دھوبیوں کے ڈلہوزی جانا ہوتا تھا۔

موسم گرما آیا تو افضل صاحب نے مجھ سے دوستانہ طور پر یہ کہا کہ اُن کی عدم موجودگی میں ہر روز اُن کی کوٹھی پر آ کر ڈاک وغیرہ دیکھ لیا کروں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی والدہ صاحبہ سے ہر روز یہ بھی دریافت کر لیا کروں کہ اگر انھیں کوئی ضرورت ہو تو اُن کے فرمان کے مطابق تعمیل کر دی جائے۔ ایک ہفتہ بعد ہی پتہ چل گیا کہ افضل صاحب جس قدر بے راہ ہیں اُن کی والدہ اُتنی ہی نیک اور خدا ترس خاتون ہیں۔ وہ اپنی بہو (اہلیہ افضل صاحب) اور اپنے پوتے عظمت کا بڑا خیال رکھتیں۔ میں روزانہ ایک گھنٹہ افضل صاحب کی رہائش گاہ پر رہتا۔ ڈاک وغیرہ دیکھتا۔ ان کی والدہ اس عرصہ میں میرے پاس ہی بیٹھی رہتیں اور جو کچھ کہنا ہوتا فرماتیں اور میں ان کے سامنے ہی ملازمین کو بھجوا کر ان کی مرضی کے مطابق ہر کام کرا دیتا۔

ایک دن پوسٹ مین دس روپے کچھ آنے کا وی، پی لایا —— وی، پی جو کہ ایک لفافہ تھا،

ے ۔ یہ دونوں حضرات ابھی اِنتقال فرما گئے ہیں۔

دھول کر دیا گیا، اور اسے کھولا گیا تو اس میں ایک غزل تھی جو نازش حیدری صاحب نے دہلی سے بھجوائی تھی جو انھوں نے افضل صاحب کے نام سے لکھی تھی اور اس کی اُجرت دس روپے کے عوض وی، پی سے بھجوائی تھی۔ اب افضل صاحب کی شاعری کا حدود اربعہ اور بھی کھل کر میرے سامنے آگیا تھا۔ مَیں نے یہ غزل انھیں ڈلہوزی بھجوا دی۔ اور ساتھ ہی یہ معذرت نامہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے جاتے ہوئے مجھے یہ نہ بتایا کہ اگر کوئی وی، پی لفافہ آئے تو اسے بغیر کھولے آپ کے ہاں بھجوا دوں، آئندہ مَیں خود ہی خیال رکھوں گا۔

اس کے بعد ساڑھے پانچ ماہ کے عرصہ میں نازش حیدری صاحب کا کوئی وی، پی لفافہ نہ آیا۔ غالباً افضل صاحب نے انھیں لکھ دیا کہ وہ وی، پی وغیرہ براہِ راست ڈلہوزی بھجوائیں، مُلتان کے پتہ پر نہیں۔ موسمِ سرما شروع ہوتے ہی گورہ پلٹن مُلتان واپس آگئی ——— افضل صاحب اپنی شاعری اور اس کے منبع کا مجھ پر انکشاف ہو جانے سے نادم تو تھے ہی، کچھ خائف بھی رہنے لگے۔

اُن دنوں مَیں شراب کبھی کبھار کسی پارٹی وغیرہ میں پی لیتا تھا۔ چنانچہ افضل صاحب نے آئے دن مجھے بھی اپنی شراب نوشی میں شریک ہونے کی دعوت دینی شروع کر دی ——— اُن دنوں ریڈ لیبل جانی واکر وسکی کا اَدّھا پونے نو روپیہ کا ملتا تھا اور بیئر کی بوتل آٹھ آنے میں۔ جس طرح نامَرد اپنی نامردی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی مردمی کی خود ساختہ داستانیں ڈینگیں مار مار کر اپنے احباب کو سُناتا ہے، عین اُسی طرح متشاعر بھی اپنے شاعر ہونے کا یقین بار بار دلاتا ہے . . چنانچہ شراب نوشی کے دوران افضل صاحب اکثر و بیشتر اپنا کلام سُناتے اور داد کے طالب ہوتے، مگر مَیں چونکہ ان کے متشاعر ہونے کا علمی اور عقلی جواز رکھتا تھا، لہٰذا داد دینا تو درکنار، ان کے اشعار سُنتے سُنتے میرا نشہ بے کیفی میں تبدیل ہونا شروع ہوتا تو مَیں احمد یار کو آواز دیتا کہ بھئی اب بہت دیر ہو گئی ہے مجھے بابُو محلہ صدر میں پہنچاؤ ——— احمد یار مجھے بابُو محلہ میں اُتارتا ہوا افضل صاحب کو حرم گیٹ کے باہر کسی گانے والی کے ہاں لے جاتا۔ اور جس روز مجھے نشہ کیف و سُرور کی حد تک ہوتا تو افضل صاحب دیدہ و دانستہ احمد یار کو اشارہ کر دیتے کہ مُلتان چھاؤنی اسٹیشن کے راستے تانگہ سیدھے حرم دروازہ لے چلے ——— اور اس طرح مجھے بھی بیسیوں بار ان کے ساتھ گانا سُننے کا اتفاق ہُوا۔

مُلتان میں اُن دنوں زیادہ تر سرائیکی زبان میں کافیاں اور علاقائی گانے ہی طوائفیں گاتی تھیں جو حُسن و عشق کی ایسی داستانیں ہوتی تھیں کہ اُردو شاعری اُن کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ مگر بُرا ہو افضل صاحب کے متشاعر ہونے کا کہ اُنھوں نے اکثر گانے والیوں کو اپنی غزلیں جو یقیناً نازش حیدری صاحب ہی کی کہی ہوتی تھیں دے رکھی تھیں، اور انھیں ہدایات دے رکھی تھیں کہ جب بھی وہ اپنے ہمراہ کسی دوست کو گانا سنوانے لائیں تو ان کی غزلیں ہی گائی جائیں۔ اور جوں ہی کسی طوائف نے افضل صاحب کی غزل شروع کی، افضل صاحب نے روپیہ روپیہ کے نوٹ برسانے شروع کر دیے (اُن دنوں ایک روپیہ کی وقعت موجودہ روپیہ سے کم از کم بیس گنا زیادہ تھی) اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گانے والی غزل نہیں گنا رہی بلکہ شراب کے کیف و سرور کے اُتار کے لیے کسی عمل کو سُر تال کے ساتھ کانوں میں اُنڈیل رہی ہے۔ قہر درویش بر جان درویش

ایک دو غزلوں کو سُننا ہی پڑتا۔ اور میں افضل صاحب سے یہ بہانا بناتا کہ میں حکیم امین اللہ صاحب کا کرایہ دار ہوں۔ لہٰذا رات کو دیر سے گھر جانے پر صبح وہ مجھ سے باز پرس کرتے ہیں کہ رات کو اتنی دیر گئے کہاں سے آئے تھے . . . اس لیے مجھے رخصت دیجیے۔ احمد یار مجھے گھر پہنچا کر پھر آجائے گا۔

آتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ان کے مُنہ نوچ لوں اور اُس افسر نے اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر بیگم صاحبہ کو سُنایا :

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خُدا کا اِس زمانے میں

تو دونوں نے قہقہے لگاتے ہوئے اپنے اپنے جام ہونٹوں کو لگا لیے۔

یہ حاسد حضرات اِدھر تو بیگم صاحبہ کو میری تحریروں کو دِکھا دِکھا کر میرے خلاف بھڑکاتے اور اُدھر مجھے رُوداد کے اندازِ تحریر پر داد دیتے ہوئے بیگم صاحبہ کے بارے میں لکھی گئی سطور پر کچھ اس انداز میں تبصرہ کرتے کہ جس سے وہ کچھ اور میری زبان سے سُن کر وہاں آگ لگا سکیں۔ مگر مَیں اس سلسلے میں ہمیشہ محتاط رہتا ہوں کہ لکھتے وقت رعایت کرنا گناہ ہے اور زبانی طور پر جاہلِ مُطلق کی بھی دل شکنی نہیں کرتا۔

"جہاں تک ہو سکا واقعات کو بے کم و کاست
بیان کرنے کی کوشش کی ہے نہ کسی کو اچھالنا مقصود
ہے اور نہ کسی کو خواہ مخواہ گرانا اپنی ذاتی کوتاہیوں کو
کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اس لیے بغیر احتساب کسی
کے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔"

——— یوسف حسین خان
یادوں کی دنیا

چہ دلاور است دزدے

اُردو کے دوسرے بلکہ کسی حد تک تیسرے درجے کے شاعر نثری مضامین میں دوسروں کی محنت و کاوش کو اپنا پدری ورثہ سمجھ کر بغیر کسی حوالے کے کئی کئی پیراگراف نقل کر لینا۔ خصوصاً پاکستانی انگریزی مصنفین کے بیش بہا شہ پاروں کا ترجمہ یا تلخیص کو اپنے مضامین میں سمونا۔ تعلیمی لحاظ سے ایم۔ اے مگر انگریزی بولنے لکھنے میں طفلِ مکتب۔ کسی پرائمری اسکول کی ٹیچری کا تجربہ بھی نہ رکھنے کے باوجود شیخ عبداللہ کی نظرِ عنایت یا یونیورسٹی کے نااہل سربراہوں کے طفیل جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے ہیڈ جناب جگن ناتھ آزاد بھی اس بیگم صاحبہ کے تیرِ نظر کا اس بُری طرح سے نشانہ ہوئے کہ بیگم صاحبہ کے عطا کردہ ایک مستعملہ رومال کو "اسرارِ خودی" سمجھ کر ڈاکٹر اقبال پر ریسرچ کرنا بھول گئے (کیونکہ آپ کی فارسی دانی بھی ایڈیٹر شانِ ہند کی طرح ایں۔ آں۔ است۔ مادر۔ پدر تک ہی محدود ہے) اور اس امر کی تحقیق پر تھیسس لکھنے لگے کہ بیگم صاحبہ نے اس رومال کو اپنے کس کس عاشقِ زار کو آنسو پونچھنے کے لیے دیا ہوگا۔ اور بوقت ضرورت اس سے کیا کیا کام لیا ہوگا۔ چنانچہ اکثر محفلوں میں اپنے بے تکلف دوستوں کو فخریہ طور پر یہ رومال دکھاتے اور بیگم صاحبہ کے اس بیش بہا عطیہ پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ تقسیمِ ملک کے وقت جو ہندو ہندوستان میں مہاجر بن کر آئے وہ ڈاکٹر اقبال سے اس لیے ناخوش تھے کہ پاکستان کا نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال کے ذہن کی پیداوار تھا۔ اس لیے اس وقت ڈاکٹر اقبال کے خلاف ہندوستان کے غیر مسلموں میں خفگی کا ایک جذبہ ابھرا جسے مسلمانوں نے بُرا منایا اور جگن ناتھ آزاد کی دُوررس نظروں نے ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر اقبال کی تعریف میں نظمیں اور مضامین لکھنے شروع کر دیئے جن کو پاکستانی اخبارات نے بڑی شدّومد کے ساتھ شائع کیا۔ اور ہندوستانی مسلمانوں نے جگن ناتھ آزاد کو ڈاکٹر اقبال کا مدّاح پا کر انھیں اپنا اور اسلام کا ہمدرد سمجھ لیا۔ اور آزاد صاحب کا مشاعروں کا روبار چل نکلا —— خوش قسمتی سے جناب دی شنکر صاحب جو اس وقت سردار پٹیل کے سکریٹری تھے۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور دیگر کئی حضرات کی سفارش پر اس بات پر تیار ہو گئے کہ آزاد صاحب کو بھی سرکاری اُردو ماہنامہ "آجکل" کا سب ایڈیٹر بنا دیا جائے۔ چنانچہ انٹرویو لینے والے حضرات میں جو مسلمان ممبران تھے وہ آزاد کی اقبال مداحی کے باعث اور فراق گورکھپوری ایسے ممبر اس خیال سے کہ آزاد محرومؔ صاحب کے بیٹے ہیں اور کچھ احباب کی سفارش پر آزاد صاحب کے حق میں متفق ہو گئے، اور عرش ملسیانی کے ساتھ ساتھ آزاد صاحب بھی "آجکل" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں چُن لیے گئے۔ بال مکند عرشؔ کی پُشت پر سردار سورن سنگھ بھی تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ عرشؔ صاحب جہاں پنڈت لبھورام جوشؔ ملسیانی ایسے استادِ محترم کے صاحبزادے تھے۔ وہاں وہ بذاتِ خود ایک مسلّم شاعر اچھے ادیب اور ادارتی ذمّہ داریوں کو سنبھالنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ مگر آزاد صاحب کا صعود اربعہ

محض جناب تلوک چند محرومؔ کا بیٹا ہونے تک ہی محدود تھا۔ ہاں لاہور میں "ویر بھارت" ایسے اُردو کے چوتھے درجے کے روزنامے میں مُترجم کا کام بھی کرتے رہے تھے۔ مگر ہندوستان آنے پر جہاں اُن پر اقبال کی مداحی نے مُلک بھر میں مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں روشناس ہونے کا موقع عطا فرمایا وہاں "آجکل" کی اسسٹنٹ ایڈیٹری نے بھی من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کے مصداق ان کو شہرت دی۔ یعنی جن شعراء اور ادیبوں کے کلام اور مضامین "آجکل" میں چھپتے وہ کوشش کرتے کہ ان کے ہاں ہونے والے ادبی اجتماعات یا مشاعروں میں "آجکل" کے ایڈیٹر صاحبان بھی مدعو کئے جائیں تاکہ عوض معاوضہ کے طور پر اُن حضرات کا کلام اور مضامین "آجکل" میں شائع ہوتے رہیں۔ اور انھیں نقد معاوضہ ملتا رہے۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی تو پہلے ہی مُلک گیر شہرت رکھتے تھے۔ اور بالکندؔ عرش اپنے بل بُوتے پر آگے آئے اور آزاد صاحب شہرت کے اتنے بھوکے تھے کہ یہ کندھے مار مار کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے تھے کہ مجھ "اقبالیے" کو بھی دیکھو۔ مُسلمان پاکستانی ہو یا ہندوستانی اسے اگر غلط فہمی بھی ہو جائے کہ کوئی غیر مسلم ان کے تئیں اپنے دل میں کچھ لچک رکھتا ہے تو وہ اس غیر مُسلم کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہی سلوک دونوں مُمالک کے مُسلمانوں نے آزاد صاحب سے روا رکھا۔ کیونکہ ہر جلسے، ہر مشاعرے اور ہر ادبی اجتماع میں جہاں بھی آزاد کو موقع ملا انھوں نے کسی نہ کسی بہانے اپنی اقبال مداحی کا مظاہرہ اچھے دلپذیر انداز میں کیا۔ حالانکہ ڈاکٹر اقبال پر شاید ہی آزاد ایسا گھٹیا نقاد ہندو پاکستان میں ہو۔ جب کہ ایک مُسلمان ناقد کی رائے میں اقبال صاحب کے سب سے بڑے نقاد آزاد صاحب ہیں۔

آئیے اقبال کے اس سب سے بڑے نقاد کا کچھ حدود اربعہ بھی ناپتے چلیے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر اقبال کے صد سالہ جشن پر ایک سیمینار ۳۱ اکتوبر تا ۳ نومبر ۷۷ء نئی دہلی میں ہوا جس میں افغانستان، پاکستان، ایران، بغداد، مصر، ایڈنبرا یونیورسٹی، انگلینڈ، سوویٹ روس، وغیرہ ممالک کے وفود نے شرکت فرمائی۔ اس اقبال سیمینار کا کیا فائدہ ہوا۔ شاید سردار جعفری بتا سکیں ہاں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ پاکستانی وفد کے کچھ ارکان کو خوب دعوتیں دی گئیں۔ جہاں شراب ناب کے جام پر جام لنڈھائے جاتے رہے۔ بلکہ بعض حضرات جناب کرشن موہن کی طرف سے دی گئی دعوت سے جاتے ہوئے سکاچ وہسکی کی بوتلیں بھی چھپا کر ساتھ لے گئے۔ ایک صاحب تو بوتل کے منہ پر ڈھکنا لگانا بھی بھول گئے۔ جب شراب ان کے کوٹ کی جیب سے بہنے لگی تو کرشن موہن نے بوتل کا ڈھکنا دیتے ہوئے ان صاحب سے کہا کہ لیجیے بوتل کا منہ اس سے بند کر لیجیے ورنہ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ ان دعوتوں کو دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ پاکستان کے شعراء اور ادیب ہندوستانی ادبی ثقافتی وفود میں آنے کے لیے کیوں بے تاب ہوتے ہیں۔

اس سیمینار کی پہلی نشست میں جگن ناتھ آزاد نے جو پیپر پڑھا اس کا عنوان تھا "اقبال اور موجودہ اسلام"۔ پیپر میں فلسفۂ اسلامیہ پر توجہ مبذول کراتے ہوئے پرنسپل رستوگی نے سوال کیا کہ "اسلامک فلاسفی کی وضاحت کی جائے اور اس ضمن میں جو Buddha Christ and Mohammad کے مصنف نے رائے ظاہر کی ہے، اس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ موصوف نے کہا ہے کہ دراصل فلسفۂ اسلام ایک بمعنی اصطلاح ہے۔ کیونکہ مُسلمانوں میں فلسفے کا آغاز ہسپانیہ میں یونانی فلاسفہ کی تشریحات سے ہُوا۔ یعنی ان تشریحات سے جو ابن رُشد، ابن سینا وغیرہ نے لکھیں۔ آزاد صاحب بغلیں جھانک کر رہ گئے۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا اور یہ نشست ختم ہو گئی۔ رستوگی صاحب نے آزاد صاحب سے کہا کہ دوسری نشست میں جلد آئیے گا۔ کیوں کہ آپ کے پیپر کے بارے میں ابھی سترہ سوالات اور ہیں۔ چنانچہ ان سوالات کا سامنا کرنے سے آزاد نے بچنے کا یہ طریقہ نکالا کہ دوسری نشست

میں تشریف ہی جب لائے جب کہ نشست کے ختم ہونے میں چار پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ آزاد صاحب نے اس طریق سے ان ۱۷ سوالات کے جوابات دینے سے تو بچاؤ کر لیا مگر اس وقت پھر گھیرے میں آگئے جب انھوں نے ایک معترض کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوتے ہوئے ظ۔ انصاری کے مقالہ Separation in Iqbal پر کہا کہ اقبال کے یہاں اس ضمن میں پیش کیے ہوئے خیالات کو صرف تصوّف کے تحت ہی لیا جا سکتا ہے۔ رستوگی صاحب نے اس پر کہا کہ تصوف کو ہر جگہ بیچ میں گھسیٹ کر شعریت کا خون کر دینے سے کیا فائدہ۔ مثلاً اس شعر میں اگر تصوّف کی چھری استعمال کی گئی تو معنویت و شعریت میں کچھ کا خون ہو جائے گا۔

شعر یہ تھا ؎

چناں پیشِ حرم چوں من کشیدم نالۂ دردے
کہ دارم محرماں را لذّتِ سوزِ جدائی را

آزاد صاحب کے اقبال کا سب سے بڑا نقاد ہونے کا دوسرا ثبوت سنیے۔

۱۹۶۵ء میں "بزمِ اقبال" لاہور سے جناب بشیر احمد ڈار کی ایک کتاب Iqbal and Post Kantian Voluntarism کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اقبال کن مغربی فلسفیوں سے متاثر ہوئے۔ اور کس حد تک انھوں نے اُن کے افکار و تصوّرات کو قبول یا مسترد کیا۔ اس کتاب میں بڑی تفصیل اور گہرائی سے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر ابھی تک اُردو میں اس پایہ کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تصنیف "اقبال اور مغربی مُفکرین" کا موضوع بھی یہی ہے۔ لیکن یہ کتاب بڑی حد تک بشیر احمد کی کتاب کا پَرتو یا چربہ ہے۔ آزاد صاحب نے مذکور الصدر کتاب کا حوالہ دیے بغیر کہیں اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اور کہیں اُردو داں حضرات کی محدود فہم و ادراک کو مدّ نظر رکھتے ہوئے محض اس کی تلخیص پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن جہاں تک موضوع سے انصاف کا تعلق ہے۔ آزاد صاحب کی کتاب کو ڈار صاحب کی کتاب سے دُور کی بھی مناسبت نہیں۔ چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک۔ ڈار صاحب کی کتاب میں نیشٹے پر جو مضمون ہے آزاد صاحب نے اسے پورے کا پورا ترجمہ کر کے سرقہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مستند اقبال شناس نے مفصل مضمون ماہنامہ شاعر بمبئی کو اشاعت کے لیے بھجوایا۔ مگر شاعر کے مدیران نے اس مضمون کی اشاعت سے معذرت چاہی کہ ہم ایسی باتوں میں پڑ کر شاعر کو اس بحث کی آماجگاہ نہیں بنا سکتے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آزاد صاحب نے مدیران شاعر کو یہ سبز باغ دکھایا کہ ان کے والدِ محترم مرحوم اعجاز صدیقی پر "شاعر" کا ایک خاص نمبر شائع کرانا چاہتے ہیں ـــــ جیسا کہ آزاد صاحب نے اس سلسلے میں اپنا مکتوب شائع کرایا ہے۔ شاعر ایسے مشہور اور اچھے اُردو ماہنامہ کو ذاتی مفاد کی خاطر اس خالص ادبی چوری کا افشا کرنے سے احتراز کرنا زیب نہیں دیتا ـــــ یہ مضمون دفترِ شانِ ہند میں اشاعت کے لیے آچکا ہے۔ ہم جلد آزاد صاحب کے اس ادبی سرقہ یا استفادہ کو شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ ہند و پاک کے مسلمانوں کو اقبال کے اس سب سے بڑے نقاد کی اصلیت کا پتہ چل سکے۔ داد دیجیے اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے اُن حضرات کو جو کتابوں پر انعام کا فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ اس چوری کی کتاب پر اس اکاڈمی نے انعام دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس اکاڈمی کے وہ حضرات جو کتابوں پر انعام دینے کا فیصلہ کرتے ہیں یا تو وہ جاہل مُطلق ہیں اور یا وہ آزاد صاحب کی اقبال مدّاحی سے اس قدر مرعوب ہیں کہ انھوں نے آزاد صاحب کی اس ادبی نوسلمی پر یہ انعام عطا فرمایا ہے۔ اگر آزاد صاحب نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں ڈار صاحب کی کتاب کا اظہار کر دیا ہوتا تو اس سے یقیناً ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا مگر انھوں نے

تو یہ سوچا کہ پاکستان سے کتابوں اور رسائل کا آنا بند ہے۔ کون بشیر احمد در کی کتاب کو یہاں پڑھے گا اور کس کو اُن کی چوری کا پتہ چل سکے گا۔

شاعر کو نضمون بھجوانے والے صاحب لکھتے ہیں کہ آزاد صاحب کی تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین" میں زبان و بیان کی اکثر غلطیاں دیکھ کر اُن کا بلڈ پریشر اور بھی بڑھ گیا۔ مثال کے طور پر چند غلطیاں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

صفحہ نمبر ۱۲ سطر نمبر ۱۹ یونانی فلسفہ کی تاریخ کی جو مایہ الامتیاز مقام سُقراط کو حاصل ہے، یہاں مایہ الامتیاز مقام کی جگہ امتیازی مقام ہونا چاہیے یا صرف امتیاز ہونا چاہیے۔

صفحہ نمبر ۳۷ سطر ۱۳ "اب اس ضمن میں ایک نظر آردشیر رتن جی وادیا کے خیالات ملاحظہ فرمائیے: لکھنا چاہیے تھا ــــ اب اس ضمن میں ایک نظر ــــ ڈالیے یا اب اس ضمن میں ذرا آردشیر رتن جی وادیا کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔

صفحہ نمبر ۶۵ سطر ۱۸ "لفظ اسلام بذات خود مستقل بالذات ہے"، کہنا چاہیے تھا اسلام بذات خود ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

صفحہ نمبر ۶۷ سطر نمبر ۸ "اقبال کی جادُو بھری شاعری اپنے بے پایاں کیف و تاثر کے ساتھ قاری کو بہا لے جاتی ہے" یہاں کیف و تا ــ بجائے کیف و اثر لکھنا چاہیے تھا۔

صفحہ نمبر ۳۷ سطر نمبر ۱۴ "اس کے لحاظ سے مادی نقطہ نظر کی ترقی، تحقق ذات کی ایک صورت ہے یہاں تحقق ات ترجمہ کیا گیا ہے۔ Self realisation کا اقبال کا فلسفہ کو مدِ نظر رکھ کر یہاں اس لفظ کا ترجمہ تکمیل خودی کرنا چاہیے تھا۔

”جب تک میرے ہاتھوں میں قلم رہے گا میرا ضمیر مجھے سچ بولنے پر مجبور کرتا رہے گا — میں تقدیروں پر تقدیریں کھا رہا ہوں اور تن تنہا طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہوں۔“

— رضوان احمد

بحوالہ آپ بیتی نمبر
فن و شخصیت، بمبئی

ٹوٹی ہوئی سیٹی

جگر مُرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، نخشب جارچوی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، مفتی کفایت اللہ، سید سلیمان ندوی، شعری بھوپالی، اور نہ معلوم کتنے مشہور ادیبوں، شاعروں اور لیڈروں کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کو میں نے پہلی بار کتب خانہ عزیزیہ میں دیکھا۔

کتب خانہ عزیزیہ کے مالک مولانا سمیع اللہ مرحوم اپنے وقت کی ایک ایسی ہشت پہلو ہستی تھے کہ جنھوں نے اپنی نیازمندی، روایتی مہمان نوازی، خوش گفتاری، سادگی اور سچائی کے باعث اپنے کتب خانہ کو ایک ایسا ادبی پنچایتی گھر بنا لیا تھا کہ ملک کا ہر ادیب، شاعر اور لیڈر نیز کتب فروش اپنی دہلی یاترا کو تب تک مکمل نہیں سمجھتا تھا جب تک کہ وہ کتب خانہ عزیزیہ میں نہ آئے۔

ایک دن اردو بازار سے میں گزر رہا تھا کہ مولانا سمیع اللہ صاحب نماز ادا کرنے مسجد کی طرف جاتے ہوئے ملے۔ فرمانے لگے . . . سرور صاحب میں دس منٹ بعد نماز پڑھ کر واپس آ رہا ہوں، آپ بھی اردو بازار کا کام ختم کر کے دس منٹ تک دوکان پر آ جائیے گا۔ آج ایک ایسی ہستی سے ملاقات کراؤں گا کہ جس کی آپ نے کئی مرتبہ فرمائش کی ہے . . .

ان دنوں 'شانِ ہند' محبوب المطابع میں چھپتا تھا اور گاماں دفتری کے ہاں اس کی بائنڈنگ ہوتی تھی۔ لہٰذا میں محبوب المطابع کے مالک مرزا صاحب سے رسالہ جلد از جلد چھاپ کر گاماں دفتری کے ہاں دینے کی تاکید کرنے اور گاماں دفتری سے رسالے کے فرمے پریس سے اٹھوانے کی ہدایت دے کر کتب خانہ عزیزیہ پر حاضر ہوا تو مولانا سمیع اللہ صاحب فرمانے لگے . . . جوتے کھول کر اندر تشریف لے آئیے . . . حکم کی تعمیل کی گئی تو فرمانے لگے . . . لیجئے پہلے چائے پیجئے اور فخر کیجیے کہ آپ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ چائے پی رہے ہیں۔

میرے ذہن میں مولانا حسرت موہانی کا جو خیالی تصور تھا وہ پاس بیٹھے ہوئے منحنی سی شخصیت سے قطعاً مختلف تھا —— تاہم میں نے چائے کی پیالی کو ایک طرف رکھتے ہوئے مولانا حسرت موہانی کے قدم چھوئے تو انھوں نے انتہائی شفقت سے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے مولانا سمیع اللہ سے کہا کہ آپ نے ان کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔

سمیع اللہ صاحب فرمانے لگے . . . ان کا نام تو وہ دیا پرکاش ہے مگر عوام انھیں سرور تونسوی کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ تونسہ شریف (پاکستان) کے رہنے والے ہیں۔ شرنارتھی ہونے کے باوجود مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے۔ ماہنامہ 'شانِ ہند' کے ایڈیٹر اور مالک ہیں۔ کتابوں کا کام بھی کرتے ہیں، پہلے ملتان میں کاروبار تھا

اب یہاں آگئے ہیں اور چاندنی محل رہتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی فرمانے لگے۔۔۔ ملتان تو ایک بار میں بھی ہو آیا ہوں۔۔۔ عرض کیا کہ میں نے ملتان میں آپ کی تشریف آوری کے بارے میں کبھی نہیں سنا ——— فرمانے لگے۔۔۔ ہمیں خود معلوم نہیں تھا کہ ہم ملتان میں ہیں، تو پھر آپ کو یا کسی دوسرے کو کیسے پتہ چل سکتا تھا۔۔۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

۱۹۴۲ء کی ہول سیل پکڑ دھکڑ میں مجھے بھی ملتان سنٹرل جیل میں لے جایا گیا تھا اور ہمیں جیل کے اندر جا کر پتہ چلا تھا کہ یہ ملتان سنٹرل جیل ہے ——— عرض کیا کہ آپ پرانی سنٹرل جیل میں تھے یا نئی میں۔ چسکی لیتے ہوئے کہنے لگے۔۔۔ ہم پرانے وقت کے لوگوں کو پرانی سنٹرل جیل میں ہی رکھنا مناسب سمجھا گیا تھا۔۔۔ میں نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ’ریاست‘ بھی تو آپ کے ساتھ ہی اسی جیل میں تھے ——— کہنے لگے۔۔۔ میاں ایک مفتون ہی کیا نہ معلوم وہاں کون کون بند تھا اور ایک کو دوسرے سے ایسے الگ تھلگ رکھا گیا تھا کہ کسی کو کسی کی خبر ہی نہ لگ سکتی تھی ——— چند دنوں بعد کسی دوسری جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

ان دنوں مولانا حسرت موہانی ممبر پارلیمنٹ تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ آپ اپنا فلیٹ نمبر وغیرہ بتا دیں تا کہ آپ جب پارلیمنٹ کے اجلاس کے دنوں میں دہلی تشریف لایا کریں تو میں قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کی غرض سے حاضرِ خدمت ہو سکوں ——— فرمانے لگے۔۔۔ پارلیمنٹ کے سامنے ہی مسجد ہے نا جس دن ملنا چاہو کسی بھی نماز کے وقت آجایا کرو۔۔۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ممبر پارلیمنٹ ہیں، آپ کو تو سرکاری رہائش گاہ الاٹ ہوئی ہوگی ——— فرمانے لگے۔۔۔ میاں خدا کے گھر سے بڑھ کر اور اچھی رہائش گاہ کون سی ہوگی۔ میرا وقت پارلیمنٹ کے اجلاس کے بعد اکثر و بیشتر اسی مسجد میں ہی گزرتا ہے اس لیے جسے مجھ سے ملنا ہوتا ہے وہیں آجاتا ہے۔

میں نے نہایت عاجزانہ انداز میں التماس کیا کہ حضور ملک کو آزادی دلانے میں آپ نے اپنا سب کچھ تباہ کر دیا۔ گاندھی جی آپ کو ملک کو آزادی دلانے والوں کی صفِ اوّل میں اعلیٰ مقام دیتے تھے، تو پھر آپ کانگریس سے برگشتہ خاطر کیوں ہیں۔۔۔؟ ذرا سی تلخ نوائی سے فرمانے لگے۔۔۔ آپ کو معلوم نہیں کہ گاندھی جی نے کہا تھا، آزادی ملنے کے بعد کانگریس کو ختم کر دینا چاہیے۔ اب کانگریس وہ نہیں رہی، جو گاندھی جی کی کانگریس تھی۔ اب کانگریس حکمرانوں کی جماعت کا نام ہے۔ انگریزی حکومت کی لاٹھیاں کھانے والوں اور جیلوں میں زندگیاں گزارنے والوں کی کانگریس اور تھی اور اب جو کانگریس ہے وہ حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کی ہے۔ سرور صاحب اسے مت بھولیے کہ:

جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو، یوں قطع رہِ مراد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت، وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر

کلامِ حسرت بہ زبانِ حسرت سننے کی خواہش کا اظہار کرنے کی میں جسارت ہی نہ کر سکا تھا کہ نذر۔۔۔

لیکن تو چیزے دِیگری

نے میری مدد کی اور مولانا نے از خود ہی جوش میں آکر یہ نعمتِ غیر مترقبہ عطا فرمائی تو میں نے داد اس انداز سے دی جو تحسین و آفریں کی بجائے آہ و واہ کی صدا تھی تو مولانا نے ازراہِ کرم میرا بھرم رکھتے ہوئے کہا کہ داد اور بے داد کا فرق سمجھتے ہو ——— اس پر مولانا سمیع اللہ صاحب فرمانے لگے کہ . . . سرور صاحب نے لال قلعہ کے اور دوسرے کئی مشاعروں کا جو آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے اگر کبھی وقت ملے تو اُسے ضرور پڑھیے۔ اس پر مولانا حسرت صاحب نے حکم دیا کہ 'شانِ ہند' کے چند شمارے ان کی خدمت میں حاضر کروں جس کی تعمیل دوسرے ہی دن کی گئی۔ دوسری ملاقات میں ارشاد فرمایا کہ 'شانِ ہند' کان پور کے پتے پر بھجواتے رہیے۔ تمھاری تحریر میں پنجابیت کے باوجود دل کشی اور دل چسپی کے ساتھ ساتھ سچائی صاف جھلکتی ہے۔

مولانا کا قلمی خاکہ شاید میں اُس دل پذیر انداز میں پیش نہ کر سکوں جس انداز میں کہ جناب سجاد ظہیر صاحب نے لکھا ہے۔ ترقی پسندوں کی کسی کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی کو بھی مدعو کیا گیا تھا جس کا ذکر سجاد ظہیر صاحب نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کی ادبی سرگزشت 'یادیں' بیں کرتے ہوئے مولانا سے متعلق ان کی خصوصیات کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے ان کے خدوخال کا بھی بہت اچھا نقشہ کھینچا ہے۔

"... عام دستور تو یہ ہے کہ شاعروں کو جب مدعو کیا جاتا ہے، تو پہلے وہ اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہیں، پھر لوگ ان سے جا کر ملتے ہیں اور شرکت کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس کا آنے جانے کا کرایہ اور اس کے علاوہ زادِ سفر دیا جاتا ہے، اسٹیشن پر استقبال کیا جاتا ہے۔ ضیافتیں اور مہمان داریاں ہوتی ہیں اور پھر جائے قیام سے موٹر میں بٹھا کر شاعر کو محفل میں لایا جاتا ہے۔ یہ دستور ایسا بُرا بھی نہیں کیوں کہ ان موقعوں کے علاوہ شاعر اور ادیب کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا اور عام طور سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی زندگی تنگ دستی بلکہ فاقہ کشی کی ہوتی ہے اور اگر ایسا ہے تو عام لوگوں کا اس میں کیا قصور؟ عام لوگوں کی زندگی بھی تو آخر ایسے ہی بسر ہوتی ہے۔

لیکن ہمارے مُلک میں اگر کوئی ایسی ہستی تھی جسے ہر قسم کے تکلف، بناوٹ، مصنوعی، اور رسمی آداب سے سخت نفرت تھی اور جو اس بات کی پروا کیے بغیر کہ لوگ اس کی بات پر بُرا مانیں گے یا ناراض ہو جائیں گے، سچی بات کہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے کبھی نہیں جھجکتی تھی، تو وہ حسرت موہانی کی ہستی تھی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ جو بات کہتے تھے وہ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتی تھی مگر جب سیاست یا ثقافتی اور معاشرتی امور میں وہ کوئی پوزیشن اختیار کرتے تھے تو اس کی صحت اور سچائی پر انھیں پورا اعتماد ہوتا تھا اور پھر دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے اور اس کی وجہ سے ان پر مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں، وہ اپنی جگہ پر اٹل رہتے تھے۔

مولانا کا قد چھوٹا تھا اور وہ جی بھر کے بدصورت تھے۔ جسم گدبدا تھا جس پر وہ ایک کافی لمبی، میلی سی، کلی پڑی ہوئی گہرے سلیٹی رنگ کی کھدر کی شیروانی پہنتے تھے۔ اُن کی

لہ سجاد ظہیر صاحب کی یہ تحریر ہفت روزہ 'آئینہ' نئی دہلی ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۸ سے نقل کی جارہی ہے۔

تصویریں سب نے دیکھی ہیں، ان کی صورت سے سب آشنا ہیں۔ چیچک رُو، ڈھلکتا ہُوا رنگ اور سارا چہرہ ایک بڑی گھنی گول سی داڑھی سے ڈھکا ہُوا تھا جو شاید چھ انچ سے بھی کچھ لمبی ہی ہوگی اور جس کے بال کھچڑی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس داڑھی کو شاید وہ کبھی نہ کترتے تھے اور نہ اس میں کنگھی کرتے تھے اس لیے کہ وہ چاروں طرف اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر پر وہ ہمیشہ شوخ سُرخ رنگ کی چھوٹی سی فیلٹ کی تُرکی ٹوپی پہنتے تھے، جس میں پُھندنا نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں پر عینک لگاتے جس کا فریم لوہے کا تھا اور جس کے شیشے پُرانی وضع کے چھوٹے چھوٹے اور بیضاوی تھے لیکن ان کے پیچھے سے بھی ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک اور ان کا پُھرتیلا پن چھلکتا رہتا تھا۔ ان کے انداز میں شوخی اور لطافت تھی، وہ تیزی سے اور مسکرا کر بات کرتے تھے۔ اور اس عُمر اور بُزرگی کے باوجود ان کے جسم میں ایک چلبلاہٹ اور پُھرتی سی تھی۔ ان کی آواز پتلی تھی اور جب وہ جوش میں آ کر بڑے انہماک سے بولتے تھے جیسا کہ اکثر ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی بچّے کی ٹوٹی ہوئی سیٹی ہو جسے زور دے کر پھونکا جا رہا ہے لیکن جو پھر بھی مشکل سے بجتی ہے۔۔۔"

"میری خواہش یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ
میں بیشتر اپنی زندگی کے حالات بیان کروں بلکہ
چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی کچھ داستان سناؤں جن سے
گزشتہ ساٹھ سال میں مجھے سابقہ پڑا ہے جن کی
صحبت سے میں نے فیض اٹھایا ہے جن میں سے
بعض کی زندگی میں میں نے ان قدروں کا جلوہ دیکھا
ہے جن کی بدولت انسان کبھی کبھی اپنی ابتدائی زندگی
کے کیچڑ سے نکل کر آسمان کی رفعت تک جا پہنچتا
ہے۔"

——— خواجہ غلام السیدین

"مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں"

طَلَاقٌ!
طَلَاقٌ!
طَلَاقٌ!

طلاق ! ——— طلاق ! ——— طلاق !

پتی پتنی دونوں کی زبان پر بس یہی ایک رٹ تھی ۔ دونوں کا ارادہ اس سلسلہ میں مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کرسچین جوڑے کی شادی تین برس پہلے ہوئی تھی ۔ ان کا دو سال کا ایک پیارا سا بیٹا تھا۔ مگر نہ جانے کس وجہ سے ان میں ناچاقی پیدا ہو گئی تھی ۔ ان کے نزدیک اس ناچاقی کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا ——— طلاق ——— !

طرفین کے وکیل اس بات کی جی جان سے کوشش کر رہے تھے کہ انھیں جلد از جلد طلاق مل جائے ۔

اُس روز عدالت میں کیس کی سماعت پوری سنجیدگی سے ہو رہی تھی ۔ جیسا کہ طلاق کے مقدموں میں ہوتا ہے ۔ عدالت میں بھیڑ بھاڑ بالکل نہیں تھی ۔ پتی اس کا وکیل ، پتنی اس کا وکیل اور دو ایک رشتہ دار جو شاید گواہ بھی تھے ۔ ان کا اکلوتا بچہ ماں باپ کے من مٹاؤ اور عدالت کی کارروائی سے بے خبر ماں کی گود میں سکھ کی نیند سو رہا تھا ۔ پھر پتہ نہیں بچے کی نیند پوری ہو چکی تھی یا کسی اور وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی ، ماں کو دیکھ کر وہ مسکرایا . . . اجنبی جگہ اور اجنبی لوگوں کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ ختم ہو گئی اور اس نے معاملہ سمجھنے کے لیے غور سے چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ دوسری طرف ایک کرسی پر پتا کو بیٹھا دیکھ کر ایک بار اس کے ہونٹ پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی ۔ باپ بیٹے کی آنکھیں ملیں تو ان دونوں کی آنکھوں میں چمک اور مسکراہٹ بڑھ گئی ۔ بچے نے پتا کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے ——— پتا نے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا ۔

پتا کی گود میں آ کر بچے نے کہا . . . " پاپا کس می . . . " پتا نے پورے جذبات کے ساتھ اس کا منہ چوم لیا ۔ جواب میں بچے نے بھی پتا کا منہ چوم لیا اور ماں کی طرف دیکھا ۔ ایک دو سیکنڈ ماں کی طرف دیکھ کر وہ بولا . . . " پاپا کس ممی . . . "

عدالت کی سنجیدہ فضا میں جیسے کوئی دھماکہ ہو گیا ہو ، بچے کی بات سن کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے ——— عدالت کی کارروائی رک گئی ——— بچے نے اپنی بات پھر دہرائی اس نے سوچا کہ شاید پتا نے اس کی بات سنی نہیں مگر پھر وہی خاموشی ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بچے کی بات دو بار کہنے کے باوجود پوری نہیں ہوئی تھی ۔ اب تک اس کے منہ سے جو بات نکلتی تھی ، ماں باپ دونوں اسے پورا کرتے تھے ۔ تیسری بار اس نے قریب قریب چیخ کر اپنی بات دہرائی ۔ اور اس کے بعد رونا

شروع کر دیا۔ وہ بار بار اپنی بات دُوہرا تا تھا . . . "پاپا! کِس ممّی!"

عدالت کے قاعدے قانون اُس بال ہٹ کے سامنے دھرے رہ گئے۔ پھر پتا نے پتنی کی گیلی آنکھوں میں خاموش دعوت کو پڑھ لیا یا بچّے کی ضد نے اس میں ہمّت بھر دی۔ ایک ایک قدم بڑھاتا ہُوا وہ دوسری طرف بیٹھی ہوئی پتنی کی طرف گیا اور اسے چُوم لیا —— بات پوری ہو جانے پر بچّے نے رونا بند کر دیا اور تالیاں بجانی شروع کر دیں . . . اس کے بعد کہانی مختصر ہے، پتنی نے سر جھکا لیا اور شرمیلی دُلہن کی طرح پتی کے ساتھ عدالت کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ جج، وکیل اور دوسرے لوگ انہونی کو پہلے دیکھتے رہ گئے پھر مُسکرا دیے —— ایک معصوم بچّے نے ایک پھُولتے پھلتے پریوار کو اُجڑنے سے بچا لیا۔

دلّی کے ایک سیشن جج نے اس سلسلہ میں کچھ دلچسپ قصّے سُنائے —— انھوں نے اپنا نام شائع کرانے کی ممانعت کر دی۔ آپ نے کہا کہ بھلے ہی طلاق قانون کو آسان بنا دیا گیا ہے، مگر عدالت کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا پوتر بندھن ٹوٹے نہیں، عدالت ان میں صلح صفائی کرانے کی ہر طرح سے کوشش کرتی ہے۔ پھر بھی اگر وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہیں تو طلاق منظور کر لی جاتی ہے۔

ایک نوجوان جوڑا شادی کے دو سال بعد ہی طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت میں پہنچ گیا۔ پتی پتنی دونوں پڑھے لکھے بھلے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے ہنس مکھ اور ملنسار مگر آپس میں کھٹ پٹ ہوئی تو بڑھتی چلی گئی —— کسی کی بھی عادت خراب نہیں، کوئی خاص شکایت نہیں، پھر بھی ذہنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں —— کیس پر غور کرنے کے بعد اور ان دونوں کی شکایتیں سننے اور ان کے گھر والوں سے بات چیت اور تبادلۂ خیال کرنے کے بعد عدالت نے انھیں حکم دیا کہ وہ کم از کم پندرہ دن کے لیے دلّی سے باہر کسی خوبصورت جگہ پر ایک ساتھ رہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں دونوں میں سے کسی کا بھی رشتہ دار نہ ہو، اور انھیں تین ماہ بعد آنے کو کہا۔

تقریباً دو ماہ بعد ہمارے فاضل جج اپنے کمرے میں بیٹھے تھے تو وہ جوڑا وہاں پہنچ گیا۔ پتی نے جج صاحب سے پہلی بات یہی کہی . . . "انکل! کل آپ ہمارے گھر کھانے پر آئیے۔ یہ اپنے ہاتھ کا بنا بھوجن آپ کو کھلانا چاہتی ہیں . . ." جج صاحب نے دونوں کی طرف دیکھا تو لگا جیسے نیا جوڑا ہنی مون منا کر لوٹا ہو۔ ان کے سر سے طلاق حاصل کرنے کا بھوت اُتر چکا تھا —— پتی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا . . "انکل کل آپ کو ایک خوشخبری اور بھی سُنائیں گے . . ." تبھی پتنی نے ہُش کہہ کر اس کی بات روک دی۔ مگر جج صاحب سمجھ چکے تھے کہ پتی کون سی خوشی کی بات بتانا چاہتا ہے۔

دوسرا قصّہ ایسے پتی پتنی کا تھا، جن کی شادی کو پندرہ سال ہو گئے تھے۔ اُن کے اسکول میں پڑھنے والے دو بچّے تھے جو دیکھنے میں خوبصورت، باتوں میں سمجھ دار اور ذہین معلوم ہوتے ہوئے بھی اُداس معلوم ہوتے —— پتہ لگا کہ وہ پڑھائی میں مَن نہیں لگاتے اور امتحان میں فیل ہو چکے ہیں۔ اس کا ذمّہ دار پتی پتنی کو اور پتنی پتی کو بتا رہی تھی۔ دونوں کا خیال تھا کہ بچّوں کا مستقبل روشن کرنے

کے لیے انھیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہونا ہوگا۔ جج صاحب نے کیس پر غور کیا اور دونوں سے الگ الگ بات کی۔ پھر بچوں کو بلایا، پتی پتنی دونوں کے سامنے بچوں سے بات کی۔ انھیں پہلے آئس کریم کھانے کو دی۔ پیار دُلار سے اپنے پاس بٹھایا، ان کی تعریف کی اس کے بعد جو سوال پوچھے تو پتہ لگا کہ ماں باپ پہلے مل کر دُنیا بھر کی نکتہ چینی کرتے تھے، اب ایک دوسرے کی کرتے ہیں اور روزانہ کسی نہ کسی بات پر آپس میں جھگڑا کرتے ہیں۔ کئی بار گھر میں کھانا تک نہیں بنتا۔ ادھر اسکول کی کتابوں، ڈریس وغیرہ کے لیے ماں یا باپ سے کہیے تو پھر سے مہابھارت شروع ہوجاتا، اکثر انھیں مار یا ڈانٹ کھانی پڑتی۔ گھر میں بھی اسکول میں بھی۔ گھر کی لڑائی کا بھی ان کے من پر گہرا اثر پڑتا۔

بچوں نے بتایا کہ کئی بار وہ گھر سے بھاگ نکلنے کی سوچ چکے ہیں، مگر ہمت نہیں کر سکے . . . بچوں کی یہ باتیں سُن کر پتی پتنی ایک دوسرے کو ذمّہ دار ٹھہرانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر عدالت نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا ——— بچوں کو وہاں سے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد پتی پتنی کو طرح طرح سے اونچ نیچ سمجھائی گئی۔ پھر انھیں ایل۔ ٹی۔ سی لے کر کسی تیرتھ استھان یا دوسری جگہ جانے کو کہا۔ چھ ماہ بعد یہ پریوار عدالت میں حاضر ہوا تو معاملہ بدلا ہُوا تھا ——— مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ جج صاحب نے کہا اس عمر میں طلاق ٹالنا آسان نہیں ہوتا کیوں کہ اس عمر میں عادتیں بدلنی مشکل ہوجاتی ہیں۔ بچوں کی بغاوت اور ان کے پیار نے ماں باپ کو اپنی غلطی کا احساس کرا دیا تھا۔

اس سے پہلے کیس کے بارے میں جج صاحب نے کہا کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ معاملہ نفسیاتی اور جنسی ہے وہ جوڑا مشترکہ پریوار میں رہتا تھا اس لیے پتی پتنی کو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ بڑے پریوار میں وہ پتی پتنی کے فرائض تو انجام دیتے تھے مگر ازدواجی زندگی جسے کہتے ہیں اس کا لطف نہیں اُٹھا سکے تھے . . . پندرہ دن بعد سب باتوں سے دُور رہ کر انھوں نے ایک دوسرے کو سمجھا اس کے بعد مشترکہ پریوار میں رہ کر بھی انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

ان سب سے زیادہ دلچسپ قصّہ دِلّی سے باہر کے ایک جوڑے کا ہے۔ شادی کے ایک برس بعد ان کے یہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ دونوں خوش تھے ——— ان کی بیٹی سال بھر کی ہوئی تھی کہ کسی بیماری سے اس کی موت ہوگئی۔ بیٹی ماں باپ دونوں کا کھلونا تھی، اس کی موت کے بعد گھر کی ساری خوشیاں ختم ہوگئیں پتہ نہیں کس طرح پتی پتنی میں من مٹاؤ پیدا ہوگیا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ عدالت کی ہر کوشش کے باوجود وہ ایک ساتھ رہنے کو تیار نہ ہوئے اور انھیں طلاق مل گئی۔

پتنی نے عدالت میں فہرست پیش کی کہ اسے پتی کے گھر سے یہ چیزیں لینی ہیں، جو اس کی اپنی ہیں اور ماں باپ کے گھر سے ملی ہیں ——— پتی نے فہرست پر ایک نگاہ ڈالی اور کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اگلے روز پتنی اپنے وکیل اور عدالت کے نمائندے کے ساتھ پتی کے گھر پہنچی۔ دستک دینے پر دروازہ کھُل گیا اور پتی وہاں موجود تھا۔ اب پتنی کا جوش و خروش ختم ہوگیا اسے اُمید تھی کہ پتی گھر میں نہیں ملے گا۔

اس کی نگاہ میز پر گئی، اس پر وہ سارا سامان فہرست کی ترتیب سے سجا کر رکھ گیا تھا، جو اس نے مانگا تھا ——— پتنی کے من کو لگا پتی ایک منٹ کے لیے بھی اس کا زیادہ وہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتا۔ اس نے

پتی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جس پر رنج یا خوشی کسی قسم کا کوئی بھاؤ نہیں تھا۔ . . ایک عورت کے ناطے تپنی کو یہ بات چبھی اور من میں اُتھل پتھل شروع ہو گئی ——— شادی کے بعد کی ساری گھٹنائیں فلم کی طرح اُس کے دماغ میں گھوم گئیں . . . تبھی اُس کی نگاہ کمرہ میں دیوار پر لگی ہوئی بیٹی کی تصویر پر گئی وہ سب کچھ بھول کر اسے دیکھنے لگی اور کافی دیر تک بت بنی ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اُس کا وکیل اور عدالت کا نمائندہ اُس کے ساتھ ہے اور اس کا پتی کے ساتھ طلاق ہو گیا ہے۔ اب اس گھر سے اس کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رہا ——— اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں . . . مجھے یہ تصویر بھی چاہیئے . . . پتی کو اُس کے احساسات کا پتہ لگ چکا تھا ——— کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے جواب دیا . . . بے بی تو اس گھر میں آئی، یہاں رہی، اور یہیں سے چلی گئی۔ اُسے اسی گھر میں پایا جا سکتا ہے . . . تپنی نے بے ساختہ وکیل اور عدالتی نمائندہ سے کہا کہ آپ جائیے، اب میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی ——— بے بی کی تصویر نے وہ کر دکھایا جو عدالت یا دوسرے لوگ نہیں کر سکے۔

"ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر ڈیڑھ برس دوسال صرف کر کے نو سو صفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا اور تین ہفتہ میں اس کی کتابت بھی مکمل کرا لی مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ اس مسودہ کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے جو صبح کو بیدار ہو کر رات کے خواب کو اس خوف سے جلدی جلدی لکھتا ہے کہ وہ کہیں ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔"

—— جوش ملیح آبادی

یادوں کی برات

کاتِک کی کُتیا

اوّلیں جشنِ جمہوریت ۱۹۵۰ء میں لال قلعہ میں تین دن تک منایا گیا۔ یہ جشن اپنی نوعیت کا ایک یادگاری جشن تھا۔ اِس جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ میں مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو، ان کی ہمشیرۂ محترمہ مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز پنڈت کی بھانجی ریٹا پنڈت بھی تشریف لائے تھے۔ اس جشن کی مفصّل رُوداد راقم الحروف نے لکھی جو اُس وقت کے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے اُردو صحافت میں اپنا انفرادی مقام رکھنے والے ہفت روزہ 'ریاست' کی تین مُسلسل اشاعتوں میں شائع ہوئی۔ 'ریاست' کے مدیر سردار دیوان سنگھ مفتون مرحوم اُن دنوں سرشنکر لال آف دہلی کلاتھ ملز (مرحوم) اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ناخوش تھے۔ سردار صاحب کی سرشت میں یہ خاصیت تھی کہ وہ اپنے کسی بھی اصلی یا مفروضہ دشمن کے دوستوں کو بھی اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ لہٰذا مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ جشنِ جمہوریت کی رُوداد میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ چنانچہ یہ رُوداد اس انداز سے لکھی گئی کہ رُوداد نگاری میں نئے باب کا اضافہ ہُوا۔

مجھ پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے احسانات تھے۔ اور کرنا خُدا کا یہ ہُوا کہ اس جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ کی رُوداد میں کنور صاحب، سرشنکر لال صاحب اور ساحر ہوشیارپوری صاحب اور دیگر کئی سرکردہ حضرات کے بارے میں ایسے ایسے ریمارکس تھے کہ جسے یار لوگوں نے مزے لے لے کر پڑھا۔ سردار صاحب نے میری گزارش پر یہ کرم ضرور فرمایا کہ یہ رُوداد میرے نام سے شائع نہیں کی مگر جب کہ انھیں مُلک کے ہر حصّے سے اس رُوداد کی پسندیدگی کے بارے میں سینکڑوں خطوط موصول ہوئے تو انھوں نے 'ریاست' میں اعلان فرمادیا کہ یہ رُوداد سَرور تونسوی ایڈیٹر 'شانِ ہند' دہلی کی لکھی ہوئی ہے۔ سردار صاحب نے یہ تمام تعریفی خطوط میرے پاس بھجوادیے جنھیں پڑھتے ہوئے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے ساتھ ہی سیروں خون خشک ہو رہا تھا کہ کیسے کیسے لوگ سَرور تونسوی کے دشمن ہو چکے تھے۔ اُن دنوں اس آفتِ جاں شاعرہ اور جناب ساحر ہوشیارپوری کے تعلقات بادی النظر میں شکوک کی حدوں سے بھی آگے سمجھے جاتے تھے۔ ویسے شعرائے کرام ایسی باتوں میں غلط قافیے ملانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ تاہم ساحر ہوشیارپوری اور ان صاحبہ کے جو تکلّفانہ تعلّقات تھے، اُن سے ہر صاحبِ نظر یہی اندازہ لگانے میں حق بجانب تھا جو عام طور پر مشہور تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد ساحر صاحب کاروباری سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے۔ دو سال کے بعد ان کا مکتوب گرامی ایڈیٹر شانِ ہند کو ملا کہ سَرور تونسوی مشاعروں کی رُوداد لکھتے وقت دیوان سنگھی سیاست کا شکار ہو چکا ہے۔ لہٰذا جب تک مَیں آپ سے ملاقات نہ کرلوں یہ سلسلۂ رُوداد نگاری ملتوی رکھا جائے ——— ساحر صاحب سے اُس وقت یونہی واجبی سے

حضرت سید محمود الحسن صولتؒ نجیب الطرفین عرب تھے۔ ان کے والد عرب سے ٹونک تشریف لائے اور شاہی سندات جن میں یہ تحریر تھا کہ یہ جہاں بھی جائیں ان کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ ریاست ٹونک کے نواب نے انھیں ٹونک میں قیام فرمانے کے لیے گزارش کی اور ان کی گزر اوقات کے لیے عرب جاگیر عنوان سے اس زمانے کے مطابق سرکاری طور پر جاگیر عطا فرمائی۔ حضرت صولتؒ ابھی شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور جب یہ پیدا ہوئے تو ان کی پرورش کی تمام ذمہ داری ان کی والدہ محترمہ پر تھی۔ لہٰذا یہ کلّو میاں عربی والے مشہور ہوئے۔ کیونکہ رنگت سیاہی مائل تھی۔ اس لیے ریاست ٹونک کی روایات کے مطابق عرفی نام کلّو میاں مشہور ہوگیا۔

داغ کے شاگرد عاشق ٹونکی فرماتے تھے کہ عرب صاحب روحانی طور پر اپنا جواب آپ تھے۔ عرب صاحب کا فرمان تھا کہ دنیا اڑھائی آدمیوں کے سہارے پر باقی ہے اور ان اڑھائی آدمیوں میں سے ایک میں ہوں۔ مگر قبلہ صولتؒ ابھی شکم مادر میں ہی تھے کہ ان کے والد صاحب کو قدرت نے اس جہانِ فانی سے اٹھا لیا کیونکہ پیدا ہونے والا بیٹا روحانیت میں اپنے والد صاحب سے بھی زیادہ جلالی تھا۔ قبلہ صولت صاحب نے ایک کتاب میں جناب عاشق ٹونکی کا نوشتہ یہ واقعہ پڑھا یا جس میں عاشق ٹونکی فرماتے ہیں:

. . . میں لگاتار ایک ہفتہ تک شام کو عرب صاحب (صولت صاحب کے والد صاحب) کے ہاں جاتا اور اُن کے پاؤں دباتا۔ اگر وہ چارپائی پر لیٹے ہوتے تو ٹانگیں دباتا۔ آٹھویں دن عرب صاحب نے پوچھا . . . عاشق میاں کیا بات ہے کچھ کہنا ہو تو کہو۔

عاشق ٹونکی فرماتے ہیں:

. . . پہلے تو میں نے یہی کہا کہ حضور کوئی بات نہیں ہے۔ مگر عرب صاحب کا کہنا تھا کہ نہیں کوئی بات ضرور ہے جسے تم کہتے ہوئے شرما رہے ہو۔ تم جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔

عاشق صاحب لکھتے ہیں:

. . . میں نے بڑے حوصلے کے بعد گزارش کی کہ حضور سرکار (نواب ٹونک) کے ہمراہ کلکتہ گیا تھا وہاں گوہر جان (یہ وہی گوہر جان ہیں جن کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی نے فرمایا تھا: سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا) کا گانا سُنا تھا۔ بس یہ خواہش ہے کہ ایک بار گوہر جان کا گانا پھر سنوں لہٰذا دُعا فرمادیجیے کہ سرکار پھر کلکتہ جائیں اور مجھے ہمراہ لے جائیں تاکہ گوہر

جان کا گانا سُن سکوں۔

اس کے بعد عاشق صاحب رقم طراز ہیں :

. . . عرب صاحب نے بڑی لمبی ہُوں کی اور دو چار منٹ میں ہی اُن پر غنُودگی چھا گئی۔ مَیں سمجھا کہ وہ سو گئے ہیں مگر مَیں اُن کی ٹانگیں دابتا رہا۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد عرب صاحب فرمانے لگے . . . عاشق میاں اندر جا کر شیروانی کی جیب سے بٹوا تو نکال لاؤ۔ پان کھانے کو دل چاہ رہا ہے . . .

عاشق صاحب لکھتے ہیں :

. . . مَیں تعمیلِ حکم کے لیے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہُوں کہ سامنے کلکتہ والی گوہر جان بیٹھی ہیں۔ وہی سازندے، وہی گاؤ تکیے، وہی جگ مگ جگ مگ کرتی روشنی، وہی کمرہ۔ اور مجھے دیکھتے ہی گوہر جان نے وہی غزل شروع کی جو سرکار کے ساتھ سُنی تھی . . .

عاشق صاحب لکھتے ہیں :

. . . مَیں مبہوت بیٹھا گانا سُنتا رہا۔ نصف گھنٹے کے بعد عرب صاحب کی آواز سُنائی دی۔ عاشق میاں بڑی دیر لگا دی بھئی پان کھانے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔ بٹوا جلدی لاؤ۔

عاشق صاحب کا بیان ہے :

. . . وہ فوراً شیروانی سے بٹوا نکال کر باہر گئے اور عرب صاحب کو دے کر اُلٹے پاؤں واپس کمرے میں آئے تو وہاں سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا۔

عاشق صاحب کی یہ تحریر پڑھنے کے بعد مَیں نے صولت صاحب سے گزارش کی کہ آپ کے والدِ محترم تو اڑھائی ہستیوں میں سے ایک تھے۔ آپ اس سلسلے میں اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ بڑے غصّے سے کہنے لگے وہ تو اڑھائی میں سے ایک تھے مَیں تو پورا اڑھائی کا اڑھائی ہوں۔

۱۹۵۲ء میں راجستھان اُردو کانفرنس مُسلم مسافر خانہ جے پور میں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک طرحی مشاعرہ بھی تھا۔ ایک نوعمر لڑکے نے یہ شعر سنایا :

دُور رہتے ہیں تو رہتے ہیں خیالوں سے بھی دُور
پاس رہتے ہیں تو رہتے ہیں، رگِ جاں ہو کر

دوسرے مصرعے پر آہ و واہ کی ایک ایسی عجیب و غریب آواز بلند ہوئی جس نے ہزارہا سامعین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ دیکھا تو ایک منحنی سے بزرگ اس مصرع پر بے حال ہو رہے تھے۔ مَیں نے نداقاً کہا، بڑے میاں یہ شاعر آپ کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی بے اعتنائی سے فرمانے لگے، لعنت اس پر اور اس کے اُستاد پر۔ مَیں تو شعر کی داد دے رہا ہوں۔ اس نے کہا ہوگا اس کے اُستاد نے۔ میرے پاس ہی مرحوم ساغر اجمیری تشریف فرما تھے، مَیں نے اُن سے پوچھا، یہ بزرگ کون ہیں؟ ساغر کہنے لگے کیا آپ انھیں نہیں جانتے۔ یہ اُستادِ صولت ہیں۔ بڑے میاں نے بڑے دھیان سے مجھے دیکھا اور اُن کا یہ دیکھنا ہی تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا اور میرا ایک جان دو قالب والا معاملہ ہو گیا۔ اور ان کے انتقال فرمانے تک وہ مجھے اپنا بیٹا ہی

سمجھتے رہے جو ٹونک سے باہر جانا کسی حالت میں بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ میرے ساتھ کلکتہ، بمبئی اور دوسرے کئی مقامات پر تشریف لے گئے۔

قبلہ صولت صاحب اپنی رُوحانی صلاحیتوں کو چھپائے رکھتے تھے، مگر تحصیل دار عیاض الدین صاحب ان کی ولی صفت رُوحانیت سے کسی طور واقف ہو چکے تھے۔ مرحوم نواب اسماعیل علی خاں تاج تخت کے وارث نہ بن سکتے تھے مگر تاج صاحب کی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ (موجودہ بیگم نواب مالیر کوٹلہ) نے صولت صاحب سے منت سماجت کر کے گزارش کی کہ تاج صاحب کو گدی مل جائے۔ اس معاملہ کی تفصیل میں جانا اس وقت مناسب نہ ہوگا۔ مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ تاج صاحب نے عیاض الدین صاحب تحصیل دار کو سورۂ یٰسین پر لکھ کر دیا کہ اگر میں رئیس ٹونک ہو گیا تو چار لاکھ روپیہ دوں گا۔ قرآن اور پھر سورۂ یٰسین پر تاج صاحب کا لکھا ہوا دیکھ کر صولت ایسا ایمان دار و نیز قرآن اور رسول کے نام پر زندگی قربان کر دینے والا فقیر منش انسان کیسے یقین نہ کرتا ——— لہٰذا اسی وقت صولت صاحب نے حکم لگا دیا کہ خدا کے فضل سے فلاں تاریخ کو یہ لڑکا نواب بن جائے گا۔ اس مقررہ تاریخ سے چند روز پیشتر سردار پٹیل نے نواب ٹونک صاحب غالباً فاروق علی خاں یا ان کے بعد والے نواب صاحب کو نئی دہلی بُلایا اور نواب صاحب سوائی مادھوپور سے اپنے اسپیشل ڈبے میں سوار ہوئے۔ جب گاڑی ریواڑی پہنچی تو نواب صاحب کا ڈبہ میں ہی ہارٹ فیل ہو گیا۔ اور ڈبہ کاٹ کر واپس سوائی مادھوپور لے جایا گیا۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ تاج صاحب جائز وارث قرار دیے جائیں گے۔ مگر جب رزیڈنٹ راجپوتانہ نے بھرے دربار میں اعلان کیا تو وہ نواب اسماعیل خاں تاج کے نام نامی کا ہی تھا۔

نواب اسماعیل خاں کو صولت صاحب نے اپنے ہاتھوں سے تخت نشیں کیا۔ مگر بدقسمتی سے نواب صاحب نے اپنا وعدہ ایفا نہ کیا۔ بلکہ ایسے مواقع بھی آئے کہ صولت صاحب کو تنازع للبقا کے لیے ٹونک سے باہر جانا پڑا۔ نواب صاحب نے کبھی تین صد اور کبھی ایک صد پنشن مقرر کر کے بار بار یہ مدد بھی بند کر دی اور یہ وعدہ خلافی نواب اسماعیل خاں کو کتنی گراں رہی اس کا اندازہ انھوں نے کبھی لگایا ہی نہ تھا۔ کیونکہ شراب نوشی اور حواریوں کے بے جا خوشامد نے انھیں اس کا خیال کبھی آنے ہی نہ دیا کہ وہ ایک ولی صفت فقیر منش سے سورہ یٰسین پر لکھا ہوا وعدہ یاد فرماتے۔

نواب صاحب مرحوم سے صولت صاحب کے طفیل ہی میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ میں جب بھی ٹونک جاتا نواب صاحب اپنے محل میں مجھے نوازتے۔ میرے اعزاز میں شعری نشستیں رکھتے، دعوتیں دیتے شراب نوشی میں مجھے شریک رکھتے۔ میں ان کی توجہ اس طرف بار بار مبذول کراتا رہتا کہ وہ صولت صاحب کا خیال فرمائیں۔ وہ وعدہ بھی فرماتے، مگر کثرتِ شراب نوشی اور یارانِ طریقت نے انھیں ہر طرح غارِ جہنم میں جھونکے رکھا۔ (سورۂ یٰسین پر نواب صاحب کا لکھا ہوا فوٹو اسٹیٹ چربہ میرے پاس موجود ہے)

لالہ بھاگ مل کلاتھ مرچنٹ (چاندنی چوک کٹڑہ نواب) کی نوجوان بیوی کا دماغی توازن خراب ہو گیا اور وہ اپنے لباس کو تار تار کر کے بالکل برہنہ گلیوں میں بھاگتی پھرتی ایک نوجوان حسین عورت کا اس طرح برہنہ گلیوں میں بھاگتے پھرنا گھر والوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ہر ممکن علاج کرایا گیا۔ آخر کار جونہی اس عورت کو پاگل پن کا دورہ پڑتا تو اسے رسّے سے باندھ کر کمرہ میں بند کر دیا جاتا اور کئی کئی دن تک یہ

صورت حال رہتی۔ حکیم جرنجیت لال سیتارام بازار، دہلی ایک دن بھاگ مل کو میرے ہاں لائے اور سارا واقعہ بیان کر کے کہنے لگے کہ کسی طرح صولت صاحب کو بلا دو۔ وہی ان کی بیوی کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ بھاگ مل نے فوراً صولت صاحب کو بلانے کے لیے زادِ راہ دیا جو اسی روز صولت صاحب کو بھجوایا گیا۔ اور ساری تفصیل بھی لکھ دی گئی۔ مگر نہ تو صولت صاحب نے روپیہ (زادِ راہ) وصول کرنے کے بعد کوئی اطلاع دی اور نہ ہی وہ تشریف لائے۔ اور بھاگ مل ہر چوتھے پانچویں دن آتے اور صولت صاحب کے بارے میں دریافت کر کے مایوس واپس چلے جاتے۔ صولت صاحب کو کئی خطوط لکھے گئے مگر جواب تک نہیں آتا تھا۔ تین چار ماہ گزرنے کے بعد جب میں بھی مایوس ہو گیا تو میں نے انھیں ایک خط لکھا جس میں ان کے اس رویّہ پر اظہارِ ناراضی تھا۔ چوتھے ہی دن کیا دیکھتا ہوں کہ ریور ہوٹل کی تیسری منزل پر دفتر شانِ ہند میں صولت صاحب شدّت کی دھوپ میں ہانپتے کانپتے آئے اور بدحواسی کے عالم میں کہنے لگے۔ . . میاں دو گھنٹوں سے رکشا پر مارے مارے پھر رہا ہوں۔ تمھارے بھاگ مل کا گھر ہی نہیں ملتا۔ عرض کیا گیا کہ حضور جب آپ نے بھاگ مل کا گھر دیکھا ہی نہیں تو آپ کو ملے گا کیسے؟ اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگے ارے ہاں بیٹا اس کا تو گھر میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ چلو جلدی کرو۔ میں نے منت سماجت کی کہ ذرا بیٹھئے پانی پی لیجیے، کچھ کھا لیجیے پھر چلیں گے۔ اس دوپہر میں جانا کیا ضروری ہے شام کو چلیں گے۔ غصّے سے کہنے لگے، رکشا نیچے کھڑا ہے چلنا ہے تو چلو نہیں تو اس کے گھر کا پتہ رکشا والے کو سمجھا دو۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا . . . میری کیا مجال تھی کہ تعمیلِ حکم نہ کرتا۔ اسی وقت ان کے ساتھ ہو لیا اور اسی رکشا پر بھاگ مل کے مکان واقع سیتارام بازار میں لے گیا۔ اتوار تھا اس لیے بھاگ مل بھی گھر پر موجود تھے۔ بھاگ مل کی بیوی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور کڑک کر بھاگ مل سے کہنے لگی . . . تم روز کسی نہ کسی کو بلا لیتے ہو —— اور یہ کہہ کر گھونگھٹ نکال کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

صولت صاحب نے چائے کی پیالی پی اور بھاگ مل سے کہا کہ ایک بوتل پانی بھر کر لاؤ۔ وہ نل سے ایک بوتل پانی بھر کر لے آیا۔ فرمانے لگے سامنے میز پر رکھ دو۔ صولت صاحب نے قریباً پانچ منٹ ٹکٹکی لگا کر بوتل کو دیکھا اور کہا کہ یہ پانی اپنی بیوی کو پلا دو جب تک زندہ رہے گی پاگل پن کا دورہ نہ پڑے گا۔ شام کو بھاگ مل میرے ہاں آیا اور صولت صاحب سے کہنے لگا کہ میری بیوی بوتل کا پانی پینا تو درکنار چھوتی بھی نہیں . . . تو صولت صاحب کی حالت اس وقت دیکھنے والی تھی۔ نہ معلوم کس مخصوص لہجے میں گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگے . . . مٹکے میں بوتل کا پانی ڈال دو۔ جس ہینڈ پمپ سے پانی بھرتے ہو اس میں یہ پانی ڈال دو۔ یا جس کنوئیں کا پانی پیتے ہو اس کنوئیں میں ڈال دو اور اگر میونسپلٹی کے نل کا پانی پیتے ہو تو جب مٹکے بھرو اس نل کے پانی کے ساتھ ساتھ اسے بھی تھوڑا سا ڈال دو۔ اس پانی کی ایک بوند بھی تمھاری بیوی کے حلق سے نیچے اتر جائے گی تو پھر عمر بھر کے لیے وہ ٹھیک رہے گی۔ دوسرے دن بھاگ مل آئے پھلوں کے دو لفافے ساتھ تھے اور ان کی بیوی بھی ساتھ میں تھیں جو نیا جوڑا پہنے زیورات سے لدی بالکل یوں لگ رہی تھی جیسے نئی دُلہن ہو —— وہ دن ہے اور آج کا دن، بھاگ مل کی بیوی کو پھر پاگل پن کا دورہ نہیں پڑا۔ اور اس کے بعد اب تک اسے پانچ چھ بچے بھی پیدا ہوئے۔

اسی بھاگ مل کی بڑی لڑکی پھولاں جو اس وقت میٹرک میں پڑھ رہی تھی اسے انتڑیوں کا ٹی بی تھا

سینکڑوں انجکشن لگوائے جا چکے تھے اور دلّی کے بہترین ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے تھے۔ مگر یہ مرض جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

ایک دن صولت صاحب مجھے کہنے لگے کہ سرور پھولاں کی شادی اگر تمھارے لڑکے ہربنس لال سے ہو جائے تو بہت اچھا رہے گا۔

مَیں نے عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ لڑکی کو انتڑیوں کا ٹی بی ہے۔ میرے خیال میں میرا لڑکا یہ رشتہ منظور نہیں کرے گا۔ اور ایسا ہی ہُوا ــــــــ

ایک دن جامع مسجد پر صولت صاحب فرمانے لگے . . . سرور صاحب "شمامتہ العنبر" اصغر علی محمد علی لکھنؤ والوں کا درکار ہے۔ گزارش کی گئی کہ چلیے ابھی چتلی قبر سے لے لیتے ہیں۔ کیونکہ چتلی قبر پر ہی عطاروں کی دُوکانیں ہیں۔ چتلی قبر پر عطر کی شیشی خریدتے وقت پاس والی دوکان پر صولت صاحب کی نظر پودینہ کی ٹکیوں پر گئی، کہنے لگے . . . سرور بیٹا دو آنے کی یہ ٹکیہ بھی لے لو۔ حکم کی تعمیل کی گئی تو فرمانے لگے رکشا لو اور بھاگ مل کے گھر چلو۔ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ پودینہ کی ٹکیاں بھاگ مل کی بیٹی پھولاں کو دیتے ہوئے صولت صاحب فرمانے لگے، بیٹی ان کو کھالینا اور کل ڈاکٹر کے یہاں جا کر پوچھنا کہ انتڑیوں کا ٹی بی باقی ہے یا نہیں۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ دوسرے دن علاج کرنے والے ڈاکٹر نے بتایا کہ بھاگ مل جی مبارک ہو، دیکھیے ہماری دوائی آخر کار کامیاب ثابت ہوئی نہ۔ اب بیٹی پھولاں بالکل ٹھیک ہے۔ مگر ڈاکٹر کو کیا معلوم کہ بیٹی پھولاں کو کس طرح آرام آیا ہے۔

ایک دن قبلہ صولت صاحب ان کے صاحبزادے پیارے میاں، بھاگ مل اور مَیں دریا گنج گولچہ سینما کے پاس کھڑے تھے کہ ایک اسکوٹر سے ایک مرد اور ایک عورت اُترے اور انھوں نے بھاگ مل سے نمسکار کیا۔ اور سینما دیکھنے ہال میں چلے گئے۔ پیارے میاں آنکھیں سُرخ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ سرور بھائی یہ عورت تو کاتک کی کتیا تھی چونکہ مَیں اس اصطلاح سے ناواقف تھا۔ اس وقت تو مَیں خاموش رہا۔ رات کو مَیں نے صولت صاحب سے پوچھا . . . قبلہ شام کو پیارے میاں نے اُس عورت کے بارے میں کہا تھا یہ تو کاتک کی کُتیا ہے۔ یہ کاتک کی کُتیا کیا ہوتی ہے ــــــــ صولت صاحب پہلے تو ہنسے پھر فرمانے لگے: کیا تمھیں واقعی یہ معلوم نہیں کہ کاتک کی کُتیا کیا ہوتی ہے ــــــــ؟ عرض کیا کہ واقعی معلوم نہیں تو فرمانے لگے کہ کاتک کے ماہ میں کُتیا میں قدرتی طور پر افزائش نسل کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس خواہش کی خوشبُو پاکر کئی کئی کتے ایک ایک کُتیا کے پیچھے گھومنے لگتے ہیں۔ اس تشریح کی روشنی میں بھاگ مل سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ عورت اپنے دلال کے ساتھ تھی اور بھاگ مل بھی اس کی زلفوں کے اسیر تھے مَیں نے صولت صاحب سے بعد میں دریافت کیا کہ قبلہ وہ عورت بالکل سادہ گھریلو لباس میں تھی اُس کی حرکات بھی ایسی نہ تھیں کہ جن سے کسی قسم کا شک ہو سکتا۔ تو پھر پیارے میاں صاحب نے پہلی نظر میں ہی یہ کیسے کہہ دیا کہ یہ کاتک کی کُتیا ہے۔ فرمانے لگے . . . سرور بیٹا ہماری تو تاب ہمارا باپ بھی نہ لا سکا اور ہمارے آنے سے پہلے ہی چل بسا۔ اب یہ ہمارے صاحب زادے ہم سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش میں ہیں۔ ان کو روکتا ہوں کہ وہ ایسے حکم نہ لگایا کریں مگر نادانستہ طور پر اس کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔

بوتل میں جن

مرحوم نواب ٹونک اسماعیل علی خاں تاجؔ قبلہ صولتؔ صاحب کو ہر ماہ تین صد روپیہ وظیفہ دیا کرتے تھے (یہ وظیفہ اُن چار لاکھ روپیوں کی عدم ادائیگی کے سلسلہ میں اشک شوئی کے طور پر دیا جاتا تھا جو سورۂ یٰسین پر لکھ کر دیا گیا تھا) چونکہ ریاستوں کے سابقہ والیان کو حکومتِ ہند سے ہر تین مہینوں کے بعد مقرّرہ وظیفہ کی رقم ملتی تھی چنانچہ جن اہل کاروں یا پنشن خواروں کو نواب صاحب نے تنخواہ یا پنشن وغیرہ دینی ہوتی تھی اُنھیں بھی وظیفہ ملنے پر ہی ادائیگی کی جاتی تھی۔ لہٰذا اہل کار اور دیگر متعلقہ لوگ بنیے سے قرض سود لے کر تین ماہ گزر کرتے تھے اور جب نواب صاحب انھیں ادائیگی کرتے تو یہ بیچارے بنیے کا قرض ادا کرتے۔ تب انھیں اگلی سہ ماہی تک سود اسلف اُدھار ملتا رہتا۔ اور قرض کا یہ چکر گردش کرتا رہتا تھا۔ ایک سہ ماہی پر نواب صاحب نے اپنی ضروریات کے پیشِ نظر ملازمین اور دیگر متعلقہ لوگوں کو ادائیگی نہ فرمائی تو بنیئے نے سب کو سود اسلف دینا بند کر دیا۔ صولتؔ صاحب نواب صاحب کے ہاں گئے اور اُن سے اپنی ضروریات جتا کر روپیہ کا مُطالبہ فرمایا نواب صاحب نے کہا کہ کل صبح روپیہ لے جانا۔ صولتؔ صاحب انتہائی طور پر دل کے صاف تھے اور وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے تھے چنانچہ وہ نواب صاحب کے وعدہ پر یقین کرتے ہوئے ندر باغ سے باہر آنے لگے تو عیش ٹونکی جو نواب صاحب کے ہاں چوبداری پر متعیّن تھے قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگے بس کلّو میاں آگئے سرکار کے جھانسے میں۔ وہ تو کل صبح چار بجے شکار پر مایر کوٹلہ روانہ ہو رہے ہیں۔ کلّو میاں صولتؔ صاحب پھر نواب صاحب کے پاس گئے اور کہنے لگے سرکار آپ تو کل صبح چار بجے شکار کے لیے مایر کوٹلہ جا رہے ہیں۔ اور مجھے نو بجے بُلایا ہے نواب صاحب نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ کلّو میاں آپ سے مَیں جھوٹا وعدہ کیسے کر سکتا ہوں تم تو کل صبح نو بجے آنا اور روپیہ لے جانا۔ صولتؔ صاحب نواب صاحب کی اس یقین دہانی پر اپنے گھر چلے گئے اور دوسرے دن صبح کو نو بجے جب وہ ندر باغ (نواب صاحب کا محل) پہنچے تو چوبدار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ نواب صاحب تو دہلی پہنچ گئے ہوں گے وہ تو صبح چار بجے ہی بذریعہ کار روانہ ہو گئے۔ صولتؔ صاحب کا یہ سُننا تھا کہ سکتے میں آ گئے اور فرمانے لگے کہ آج تو موٹر ہی اُلٹے گی یہ کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ دس دن گئے بیس دن گزر گئے۔ مہینہ ہو گیا۔ نواب صاحب اور اُن کے ساتھی مایر کوٹلہ سے شکار کھیلنے کے بعد واپس نہ آئے تو پتہ چلا کہ راجندرا ہسپتال میں سب کے سب داخل ہیں۔ جب شکاریوں کا یہ قافلہ واپس آیا تو پتہ چلا کہ اُس روز عین صبح کے نو بجے نواب صاحب کی بیوک کار (جو بعد میں حضرت جوش ملیح آبادی نے ہتھیالی تھی) دہلی سے کچھ فاصلہ پر

مالیر کوٹلہ کے لیے رواں دواں جارہی تھی کہ یکایک بھینس بھاگتی ہوئی کار کے سامنے آئی اور نواب صاحب جو خود ڈرائیوری کر رہے تھے اپنا توازن کھو بیٹھے بھینس تو صحیح سلامت رہی مگر نواب صاحب اور ان کے ساتھیوں میں سے کسی کی ٹانگ سلامت نہیں تھی تو کسی کا ہاتھ۔ نواب صاحب نے صولت صاحب کو بلا کر ان کا بقیہ ادا کیا اور اپنی وعدہ خلافی کے لیے معافی چاہی۔

وعدہ خلافی نواب صاحب کی عادت بن چکی تھی چنانچہ انھوں نے پھر ایک موقع پر صولت صاحب سے وظیفہ کی ادائیگی کے لیے وعدہ فرمایا اور غچہ دے کر شکار پر روانہ ہو گئے اور ادھر صولت صاحب اپنے گھر کے ٹھنڈے چولھے میں آگ جلانے کی امید لیے نواب صاحب کے محل میں تشریف لے گئے تو پتہ چلا کہ نواب صاحب مرغابی کے شکار کے لیے چلے گئے ہیں۔ غصہ میں زبان سے نکلا کہ آج یہ ٹونک واپس نہیں آئے گا۔ اور ادھر نواب صاحب نے ایک اڑتی ہوئی مرغابی کو بندوق کا نشانہ بنایا تو مرغابی تالاب میں گری اور نواب صاحب اپنی نشانہ بازی کی داد چاہنے کے لیے خود ہی تالاب میں مرغابی کو نکالنے کے لیے چلے گئے۔ نہ معلوم تالاب میں انھیں کیا ہوا۔ جونہی وہ مرغابی کو لیے تالاب سے باہر نکلے تو درد سے کراہنے لگے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ فوراً جے پور سوائی مادھو سنگھ ہسپتال لے چلو۔ چنانچہ آناً فاناً موٹر پر کچھ ساتھی نواب صاحب کو لے کر جے پور روانہ ہو گئے اور باقی کے ساتھی ٹونک واپس آگئے جن کی زبانی اہل ٹونک کو یہ خبر ملی کہ نواب صاحب کو کچھ ہو گیا ہے اور انھیں جے پور سوائی مادھو سنگھ ہسپتال لے جایا گیا ہے نواب صاحب کے عزیز و اقارب احباب اور شہر کے معزز حضرات نواب صاحب کی مزاج پرسی کے لیے جے پور جاتے اور واپس آکر بتاتے کہ نواب صاحب کے پیٹ سے کافی وزنی رسولی نکالی گئی ہے۔ اور وہ سخت تکلیف میں ہیں۔ ٹونک کے معززین نے صولت صاحب سے کہا کہ آپ بھی نواب صاحب کو دیکھ آئیے۔ مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار نواب صاحب کی والدہ صاحبہ نے انھیں پیغام بھجوایا کہ جے پور آئیے۔ بھابھو صاحبہ (صولت صاحب کی اہلیہ محترمہ) نے زور دے کر صولت صاحب کو جے پور روانہ کیا۔ نواب صاحب کی والدہ صاحبہ نے انھیں لانے کے لیے جے پور سے موٹر بھجوادی تھی۔ اس وقت نواب صاحب ہسپتال سے پولو وکٹری سینما کی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں آگئے تھے اور ڈاکٹر انھیں یہیں دیکھنے آتے تھے اور ڈریسنگ وغیرہ کر جاتے تھے۔ صولت صاحب اس فلیٹ میں آئے تو نواب صاحب کی والدہ صاحبہ نے صولت صاحب کو نذر پیش کی جو انھوں نے قبول فرمالی (یہ مسلمہ امر تھا کہ جس کی نذر صولت صاحب قبول کر لیتے اس کا کام اللہ میاں کر دیتے تھے اور جس کی نذر قبول نہیں کرتے تھے اس کا کام نہیں ہوتا تھا) اور بسم اللہ کہتے ہوئے نواب صاحب کے پائینتی بیٹھ گئے کرسی پیش کی گئی کہنے لگے نہیں میں نیچے قالین پر ہی بیٹھوں گا۔
نواب صاحب نے روتے ہوئے اپنی حالت بیان کی اور کہا کہ کلو میاں دعا کر دو اللہ تعالیٰ مجھے شفا دیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ابھی زخم بھرنے میں ایک ماہ سے زائد عرصہ لگے گا اور مجھے جس طرح سے ٹانگ رکھا ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں اس حالت میں میرا ایک ایک لمحہ گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ نواب صاحب اپنی کہہ چکے تو نواب صاحب کی والدہ صاحبہ اور ان کی بیگم صاحبہ نے صولت صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور دعا کی طالب ہوئیں بس پھر کیا تھا صولت صاحب جلال میں آگئے اور فرمانے لگے سرکار یہ تم ہی ہو جو وعدہ کر کے بھول جاتے ہو ہمارے سرکار ایسا ہرگز نہیں کرتے جاؤ خدا اور ہمارے سرکار رسول ؐ کے حکم سے کل گھر

چلوگے اور یہ زخم وغیرہ ایک مہینہ تو کیا دو دن میں بھر جائے گا۔ نرس یہ سب کچھ سن رہی تھی اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا کہ یہ بوڑھا بیوقوفوں کی جنّت میں رہتا ہے۔ یہ زخم دو دن تو کیا اگر ایک ماہ میں بھر جائے تو غنیمت ہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ صولت صاحب ساری رات نواب صاحب کی پائنتی بیٹھے رہے اور صبح کو جب ڈاکٹر آیا اور اُس نے پٹی کھولی تو خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہنے لگا نواب صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں آپ کا زخم تو بالکل ٹھیک ہے بس اب ایک دو دن صرف مرہم لگا کر ڈریسنگ کرنی ہوگی جو آپ ٹونک میں ہی ہسپتال کے کسی کمپاؤنڈر کو بلوا کر کرا سکتے ہیں لہٰذا آپ چاہیں تو بخوشی ٹونک چلے جائیے۔ نواب صاحب اُن کی والدہ اور بیگم صاحبہ خدا کے احسان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے کہ صولت صاحب نے خود ہی نواب صاحب کے ملازمین کو حکم دیا کہ ٹونک چلنے کی تیاری کریں کار میں گدّے لگا دیئے گئے اور نواب صاحب کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر ایک طرف اُن کی والدہ صاحبہ اور دوسری طرف بیگم صاحبہ تشریف فرما ہوئیں اور صولت صاحب ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ پر جلوہ افروز ہوئے (صولت صاحب موٹر میں ہمیشہ اگلی سیٹ پر ہی بیٹھتے تھے اور وہ اِسے امتیازی شان سمجھتے تھے) اور یہ قافلہ ٹونک پہنچا تو اہلِ ٹونک کی حیرت کی حد نہ رہی۔ صولت صاحب کو وظیفہ باقاعدگی سے ملنے لگا۔ مگر حالات نے پلٹا کھایا اور اُن کا وظیفہ ایک سو روپیہ کر دیا گیا۔ صبر اور قناعت کے زندہ جاوید نمونے میں نے اپنی عمر میں جیسے صولت صاحب اور اُن کے اہل وعیال کو دیکھا کسی اور کو نہیں دیکھا چنانچہ اسی سو روپیہ وظیفہ پر ہی قناعت کر لی گئی۔ مگر ابھی دو چار ماہ ہی گزرے تھے کہ صولت صاحب ایک دن عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر تشریف لائے تو نواب کے ہرکارے نے انھیں نواب صاحب کا ایک حکم نامہ دیا جس میں درج تھا کہ آپ کی پنشن آج سے بند کر دی گئی ہے۔ یہ حکم نامہ پڑھتے ہی صولت صاحب کے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور ٹونک کے مشہور خوشنویس عتیق اللہ جو صولت صاحب کے ہم عصر تھے کو ساتھ لے کر دلّی میرے پاس چلے آئے میں اسی فلیٹ ۸۰ انصاری مارکٹ دفتر شانِ ہند میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دیکھا تو تین بجے کے قریب پسینے میں شرابور قبلہ صولت صاحب میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے فوراً قدم بوسی کی اور کرسی پر بٹھا کر مزاج پُرسی کی اور فوراً ٹیلیفون سے دکاندار سے کہا کہ بہترین چائے بھجوائے اور شکر الگ ساتھ بھجوائے۔ پانی کا گلاس بھر کر صولت صاحب کو پیش کیا مگر وہ اس قدر بدحواسی میں تھے کہ پانی تک نہ پیا اور فرمانے لگے سرور بیٹا میرے ساتھ نواب صاحب نے یہ کیا ہے۔ اب کیا ہوگا میں نے آہستگی سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے عرض کیا۔ قبلہ ہم تو آپ سے اپنی مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دُعا کے طالب ہوتے ہیں اور آپ ہیں کہ مجھ ناچیز جسے آپ اپنا بیٹا کہتے ہیں سے ایسا کہہ رہے ہیں کیا آپ کو اپنے خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان نہیں رہا۔ یہ سُننا تھا کہ میاں (صولت صاحب) قہقہے لگانے لگے اور شیطان کو ایسے ایسے الفاظ سے یاد کرنے لگے کہ لغات بھی پناہ مانگنے لگے اور چٹائی بچھا کر خدا کو سجدہ کیا۔........

دیکھا تو صولت صاحب کے چہرے کی حالت ہی بدل گئی تھی اور اُن میں پہلے والی ظرافت اور لطافت لوٹ آئی تھی۔ چائے آئی ہم تینوں نے پی۔ منشی عتیق اللہ تو اپنی جائے قیام پر چلے گئے۔ اور صولت صاحب میرے ساتھ سویٹو الان میرے غریب خانہ پر فروکش ہوئے میرے ہاں روپیہ کی ریل پیل ہوگئی ٹونک صولت صاحب کے اہل وعیال کو ضرورت سے زیادہ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھجوایا جانے لگا۔ اور صولت صاحب میرے ساتھ

کلکتہ اور کئی مقامات پر گئے۔ تین چار ماہ کے بعد ایک دن نواب صاحب ٹونک کا فون ایمبیسیڈر ہوٹل نئی دہلی سے آیا کہ شام کو کلومیاں کو لے کر اُن سے ہوٹل میں ملوں، میں نے صولت صاحب سے گزارش کی کہ نواب صاحب نے بُلوایا ہے بڑی بے اعتنائی سے کہنے لگے کہ وہ سرکار ہوں گے اپنے گھر کے ہم سرکارِ مدینہ کے نام لیوا ہیں اور اُن کی ۲۳ ویں پُشت سے ہیں جس کسی کو آنا ہو ہمارے یہاں آئے ہم کسی کے یہاں کیوں جائیں۔ میں شام کو نواب صاحب کی خدمت میں ایمبیسیڈر ہوٹل حاضر ہوا اور رات کے بارہ بجے تک ہم نوالہ وہم پیالہ رہا اور میں نے باتوں باتوں میں نواب صاحب سے گزارش کی کہ آپ نے صولت صاحب سے زیادتی کی ہے۔ میری گزارش پر دوسرے دن نواب صاحب نے دفتر شانِ ہند تشریف لانا منظور کر لیا میں نے دہلی کے کچھ اچھے شعراء کو بھی مدعو کر لیا اور جب نواب صاحب تشریف لائے تو اُن کے بہنوئی نواب مالیر کوٹلہ اور اُن کے سالے رفیع اللہ بیگ سابق چیرمین ٹونک میونسپل بورڈ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ شعری نشست بہت کامیاب رہی قبلہ صولت صاحب نے نواب صاحب کی شان میں فی البدیہہ قصیدہ سنایا۔ قصیدہ کیا تھا ایک ایک لفظ موتیوں سے جڑا ہوا تھا یہ نشست ختم ہوئی تو نواب صاحب صولت صاحب مجھے اور دو چار شعراء حضرات کو اپنے ساتھ ہی ایمبیسیڈر ہوٹل لے گئے وہاں رات کے دو بجے تک محفل جمی۔ نواب صاحب کی گاڑی صولت صاحب اور مجھے سوئی والان چھوڑنے آئی۔ گھر پہنچے تو میں نے صولت صاحب سے دریافت کیا کہ یا تو نواب صاحب سے اتنے خفا تھے اور یا ان کی شان میں قصیدہ ارشاد فرمایا۔ فرمانے لگے سرور بیٹا یہ ٹونک کی عزت کا سوال تھا۔ اُن کے ساتھ ایک دوسرا نواب بھی تھا۔ دہلی کے معزز شعراء تھے۔ میں اپنے نواب کی عزت نہیں کرتا تو دوسرے کیسے کرتے۔ تاویل معقول تھی میں تو سو گیا اور صولت صاحب وضو کر کے مصلے پر بیٹھ گئے۔

قبلہ صولت صاحب ٹونکی۔ حضرت بسمل سعیدی ٹونکی۔ منشی عتیق اللہ خاں خوش نویس۔ رضا اللہ خاں (جو پاکستان چلے گئے تھے) یہ سب قریب قریب ہم عمر اور رفیقانِ خاص تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا کہ منشی عتیق اللہ خاں خوش نویس نے ایک لڑکی کا اغوا کر لیا۔ لڑکی کے ورثا نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ نوابی دورِ حکومت تھا۔ چنانچہ معاملہ نواب صاحب تک پہنچا۔ لڑکی کے ورثا اور منشی عتیق اللہ خاں کی دربار میں پیشی ہوئی۔ لڑکی کے ورثا جب اپنی شکایت نواب صاحب کی خدمت میں زبانی طور پر عرض کر چکے تو نواب صاحب نے منشی عتیق اللہ خاں کی طرف نگاہِ قہر آلود سے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی صفائی میں جو کہنا ہو کہو۔ اتنے میں صولت صاحب یکایک اپنی جگہ سے اُٹھے اور نواب صاحب سے مخاطب ہو کر عرض پرداز ہوئے کہ سرکار لڑکی کا اغوا منشی عتیق اللہ خاں نے نہیں کیا بلکہ میں نے کیا ہے۔ منشی عتیق اللہ بے قصور ہے اور لڑکی کے ورثا کسی خاندانی دشمنی کے باعث اُس کا نام لے رہے ہیں۔ دربار میں بیٹھے ہوئے رؤسا اور امرار اہلِ کار اور خود نواب صاحب صولت صاحب کا یہ بیان سن کر دم بخود رہ گئے مگر ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ صولت صاحب اپنے دوست کو بچانے کے لیے اس قسم کا گھناؤنا الزام اپنے سر لے رہے ہیں۔ دربار برخواست کر دیا گیا۔ نواب صاحب نے بعد میں صولت صاحب کو بلایا اور تمام واقعہ دریافت کیا۔ نواب صاحب بھی سمجھ گئے کہ صولت صاحب اپنے دوست کو بچانے کے لیے قبولِ جرم کر رہے ہیں۔ آخر کار نواب صاحب نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے لڑکی کے ورثا کو لڑکی واپس دلا دی اور صولت صاحب کے اقبالِ جرم کے

پچیس

تعلقات تھے۔ مگر انھوں نے جس ہمدردانہ انداز میں خط لکھا تھا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل میں سَرور تونسوی کے لیے واقعی دوستانہ بلکہ برادرانہ جذبہ رکھتے ہیں —— چنانچہ ساحر صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی —— دو ماہ بعد ساحر صاحب کا فون آیا کہ وہ دہلی تشریف لے آئے ہیں اور کراؤن ہوٹل فتحپوری میں قیام پذیر ہیں۔ لہٰذا شام کے چھ بجے کراؤن ہوٹل میں پہنچ جاؤں۔ رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھانا ہوگا۔

اُن دنوں ساحر ہوشیارپوری صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا ڈنر شراب کے بغیر بے مزہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کراؤن ہوٹل میں پہنچتے ہی بیئر سے معاملہ شروع ہوا اور اس کے بعد وہسکی —— ہندوستان کی اُردو صحافت —— اُردو شاعری اور مشاعروں کی رُوداد پر جی بھر کر تبادلۂ خیال ہوا۔

ساحر ہوشیارپوری، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے متعلق ایڈیٹر شانِ ہند کو تفصیل سے بتا رہے تھے کہ دوستی، فراخدلی، ہر مشکل کے وقت کام آنا، ایسی خوبیوں کا دُوسرا نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہے کہ اتنے میں یکایک کمرے کا دروازہ اس انداز سے کھلا کہ جیسے آندھی کے زوردار جھونکے نے اپنی پوری طاقت سے دروازے کے پٹ چوپٹ کر دیے ہوں —— دیکھا تو سامنے حسن و شباب کا ایک مجسمہ اپنی پوری دلربانہ رعنائیوں کو اپنے جلو میں لیے متقویِ حسن مسکراہٹ کے ساتھ دعوتِ نشاط دیتا ہوا نظر پڑا۔ شراب کے نشے میں مرد کی جمالیاتی حس باقی تمام حواسِ خمسہ پر غالب رہتی ہے۔ اور اس عالم میں عورت خواہ مٹی کی ہی کیوں نہ ہو رونا لیلیٰ نظر آتی ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ راقم الحروف نے ان بیگم صاحبہ کو اُس وقت سے پہلے اور پھر اس کے بعد اتنے حسین اور دل کش سراپے میں کبھی نہیں دیکھا۔ جوانی کے دنوں میں ساحر ہوشیارپوری کی مسکراہٹ بھی اپنا ایک ایسا ساحرانہ زاویہ رکھتی تھی کہ اکثر و بیشتر حسنِ سرکش نے اپنا سب کچھ اس مسکراہٹ کی نذر کر دیا۔ لہٰذا ساحر صاحب اپنی اسی ساحرانہ مسکراہٹ سے اس آفتِ جاں کا استقبال کر رہے تھے اور راقم الحروف کے کانوں میں کسی فلمی گانے کے اس گھٹیا مصرع ؎

یوں تو ہم نے لاکھ حسیں دیکھے ہیں تم سا نہیں دیکھا

کی آواز دُور سے سُنائی دیتی ہوئی ایسے معلوم ہوئی جیسے اس گھٹیا مصرع کے خالق نے سَرور تونسوی کی طرف سے اس مجسمۂ حسن کی تشریف آوری پر نذرِ عقیدت کا گلدستہ پیش کر دیا ہو۔

ساحر صاحب ساحرانہ انداز سے اُٹھے، عشق نے نذرانہ عقیدت پیش کیا اور دُنیا کی تمام مسکراہٹوں کا یہ مرکز ادائے تاملانہ کے ساتھ ایک کرسی پر تشریف فرما ہوا۔ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو شراب کے نشے کے سُرور کو اور بھی خوشگوار بنا رہی تھی۔ ساحر صاحب نے بڑے اہتمام سے پیگ بنا کر حسن کے حضور . . . پیش کرتے ہوئے کہا . . . انھیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی —— فرمانے لگیں . . . نہیں —— پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ ان سے واقف ہیں . . . عرض کیا کہ واقف تو نہیں البتہ ایک دو مشاعروں میں دیکھا ہے . . . کچھ تو یہ آفتِ جاں پہلے ہی عالمِ رویا میں تھیں۔ دو چار پیگ اور نوش فرما چکیں تو نہایت متانت سے فرمانے لگیں . . . سَرور صاحب میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ مشاعروں کی رُودادوں میں میرے بارے میں جو کچھ لکھتے رہے ہیں وہ بھی حرف بہ حرف مجھے یاد ہے۔ مجھے کوئی موقع میسّر ہی نہیں آتا تھا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکتی۔ آج ساحر صاحب سے دن میں ملاقات ہوئی تو یہ پروگرام بنایا گیا کہ ساحر صاحب آپ کو بلائیں اور آپ کو معلوم نہ ہونے دیا جائے کہ میں بھی یہاں آ رہی ہوں کیونکہ انُس کا خدشہ

پردے میں منشی عتیق اللہ کی جان بچی۔ ریاست ٹونک کے آخری تاج دار نواب اسماعیل علی خاں کی وعدہ خلافیوں سے ناراض ہو کر قبلہ صولت صاحب نے کچھ ایسی رُباعیات نواب صاحب کی ہجو میں کہیں کہ جو فنِ شعر میں اپنا جواب آپ تھیں اور ان رُباعیات میں ایسی ایسی بد دُعائیں تھیں کہ سننے والے کا کلیجہ شق ہو جائے۔ صولت صاحب یہ رُباعیات بلا کھٹکے اقبال ہوٹل اور دوسری جگہوں پر سُناتے۔ ریاستی دورِ حکومت میں شہر کا ہر باشندہ اپنے نواب یا راجہ کا سی۔ آئی۔ ڈی ہوتا تھا۔ چنانچہ آنِ واحد میں یہ رباعیات نواب صاحب تک پہنچا دی گئیں۔ صولت صاحب اس صورتِ حال سے بخوبی واقف تھے۔ مگر کسی انسان سے ڈرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا لہٰذا اُن کی رُباعیات میں دن دن اضافہ ہونے لگا۔ سُننے والے داد جھولیاں بھر بھر دیتے اور دوسرے ہی لمحہ نواب صاحب تک رُباعیات کی نقل پہنچا آتے۔ کچھ دنوں تک تو نواب صاحب کے یہاں کھچڑی پکتی رہی۔ نواب صاحب کے ایک بہنوئی تھے غالباً اُن کا عرفی نام اچھّو میاں تھا۔ شراب کے وہ بھی رسیا تھے۔ ایک رات کو نواب صاحب کے ہاں محفل جمی ہوئی تھی جب اچھّو میاں شراب کے نشے میں مستانہ وار داد نواب صاحب کے اشعار پر نذر باغ میں دوسرے حواریوں کے ساتھ دے رہے تھے تو کسی ہوا خواہ نے صولت صاحب کی رُباعیات کی یاد دلادی۔ اچھّو میاں آپے سے باہر ہو گئے اور سب حواریوں کو ہمراہ لیے اقبال ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تاکہ صولت صاحب کو ان رُباعیات کا مزہ چکھایا جا سکے۔ اُن دنوں ٹونک میں بجلی بھی غالباً نہیں آئی تھی، نذر باغ سے اچھّو میاں اپنے حواریوں کا قافلہ لے کر اقبال ہوٹل کی طرف آرہے تھے اور اُدھر اقبال ہوٹل سے اُٹھ کر صولت صاحب اپنے گھر موتی باغ جا رہے تھے کہ اقبال ہوٹل اور بڑے کنوئیں کے درمیانی راستہ میں اچھّو میاں اور صولت صاحب کی مڈبھیڑ ہو گئی اور اچھّو میاں نے چھڑی اُٹھاتے ہوئے کہا کلو میاں اور ادھر صولت صاحب نے چھڑی اُٹھاتے کہا اچھّو میاں۔ اچھّو میاں کے حواری سب کے سب صولت صاحب کو بھی جانتے بلکہ مانتے تھے۔ ان حواریوں میں سے کچھ نے اچھّو میاں کو اور کچھ نے صولت صاحب کو پکڑ کر الگ الگ کر دیا مگر اس دَوران میں اچھّو میاں نے شراب خانہ خراب کے نشہ کے باعث بد اخلاقی اور بدزبانی سے نواب صاحب کے خلاف کہی گئی رُباعیات کے بارے میں اظہارِ ناراضی کیا۔ جسے صولت صاحب سُن کر نہایت خاموشی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے گھر آگئے۔ بھابھو (صولت صاحب کی اہلیہ محترمہ) کا فرمان ہے کہ بیٹا سَر درا نھوں نے اپنی زندگی میں صولت صاحب کا ایسا غصّہ نہیں دیکھا تھا۔ صولت صاحب تو اپنے گھر چلے گئے اور ادھر اچھّو میاں بے ہوش ہو کر گر پڑے اور جنھیں بے ہوشی کی حالت میں ہی ان کے حواریوں نے اُٹھا کر اُن کے گھر پہنچایا۔ اچھّو میاں کی والدہ محترمہ نے جب تمام واقعہ سُنا تو انھوں نے آنِ واحد میں بیل گاڑی جتوائی اور رات کے گیارہ بجے صولت صاحب کے گھر پہنچیں اور جاتے ہی صولت صاحب کے قدموں پر سر رکھ دیا کہ میرے بیٹے کو بخش دو۔ صولت صاحب نے غصّہ سے کانپتی ہوئی آواز سے کہا کہ اب کیا کرنے آگئی ہو اُس کا فیصلہ تو وہیں پر ہی ہو گیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اچھّو میاں کی والدہ صاحبہ نے ہزار منت سماجت کی مگر صولت صاحب کا غصّہ ٹھنڈا نہ ہُوا۔ آخر کار وہ بے نیلِ مرام اپنے گھر واپس آگئیں اور اچھّو میاں چوتھے دن بے ہوشی کی حالت میں ہی اس جہانِ فانی سے چل بسے۔

صولت صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اُس وقت کے نواب صاحب کی والدہ محترمہ نے انھیں

اپنا بیٹا بنا لیا۔ چوں کہ صولت صاحب حضور رسول اکرمؐ کی ۲۳ ویں پُشت سے تھے اس لیے یہ بیگم صاحبہ اپنے منہ بولے بیٹے صولت صاحب پر اپنی جان تک قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ صولت صاحب فرماتے تھے کہ بیٹا سرور میری یہ ماں میرا پسینہ چاٹتی تھیں صولت صاحب ان بیگم صاحبہ (غالباً اس کا نام زمانی بیگم تھا) کا ذکر فرماتے تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں ان بیگم صاحبہ نے اپنے بیٹوں کی طرح جائیداد کا پورا حصہ صولت صاحب کو بھی دیا جو سات مکانوں (جن میں سے ایک مکان اب بھی محلہ رجبن میں موجود ہے) اور چار لاکھ روپیہ کل دار، ازدیں تول کران کے حصّے میں آیا صولت صاحب ایسے فقیر منش کو دولت سے کیا واسطہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار لاکھ روپیہ کل دار اور ساتوں مکانات ختم ہو گئے۔ یعنی دوستوں کو چٹوا دیے۔

گوٹ (پکنک) میں مرغوں کی کلیجی کی دعوت دی جا رہی ہے جس کا دل چاہے صولت صاحب کے خرچ پر کوکین کے پان کھائے۔ دعوتوں میں طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں جن کی خوشبو دُور دُور تک جنگلی (مقام گوٹ) کو مہکا رہی ہوتی اور صولت صاحب ہیں کہ خشک روٹی لیے ایک گوشے میں کھا رہے ہیں دعوتی احباب حیرانی سے پوچھتے میاں یہ کیا۔ ارے بھوک لگی تھی یہ روٹی ہاتھ لگی اور کھا رہا ہوں یعنی طرح طرح کے بہترین سے بہترین کھانوں کو خود چکھتے بھی نہ تھے جو دوسروں کو کھلاتے مگر خود خشک روٹی ہی کھاتے۔

صولت صاحب نئی شیروانی پہن کر اقبال ہوٹل پر آئے۔ کسی صاحب نے تعریف کر دی کہ واہ واہ کیا شیروانی ہے اور صولت صاحب نے وہ شیروانی آتار مع سونے کے بٹنوں کے اسے دیدی۔ غرضیکہ تمام روپیہ اور ساتوں مکانات ایک دو سال کے قلیل عرصہ میں ختم کر دیئے گئے۔

میری رہائش چاندنی محل میں تھی کہ صولت صاحب تشریف لائے اور تقریباً دو ماہ تک قیام فرمایا۔ ایک دن فرمانے لگے کہ بیٹا سرور مولانا عبدالقدیر صاحب کون بزرگ ہیں۔ سُنا ہے "شمع" کے مالک حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی انھیں بہت مانتے ہیں اور اُن کی کوٹھی کی بُنیاد رکھتے وقت بھی مولانا عبدالقدیر صاحب نے ہی بسم اللہ فرمائی تھی۔ مَیں نے عرض کیا کہ میرے غریب خانہ سے چند قدموں پر ہی ان کا مکان ہے جس دن بھی آپ فرمائیں گے اُن کے ہاں لے چلوں گا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ایک دن مَیں نے صولت صاحب سے بضد ہو کر کہا کہ مجھے جن دکھائیے۔ مُسکرائے پھر قہقہے لگاتے رہے۔ اور کئی دن تک مجھے مذاقاً فرماتے رہے کہ اچھا آپ جن دیکھیں گے میں بدستور ضد کے ساتھ مُطالبہ کرتا رہا کہ مجھے جن دکھائیے۔ ایک دن فرمانے لگے سرور تم جن کو دیکھو گے تو اتنے خوف زدہ ہو جاؤ گے کہ شاید تمھارا دماغی توازن ٹھیک نہ رہے۔ اچھا کبھی موقع ملا تو تمھیں انسانی شکل میں جن دکھا دوں گا۔ کچھ دنوں بعد یکایک صبح سویرے ہی کہنے لگے کہ آج مولانا عبدالقدیر صاحب کے ہاں ضرور لے چلنا۔ دیکھنا بھُولنا نہیں۔ شام کو چار بجے دریا گنج دفتر بند کر کے ہم چاندنی محل گھر پہنچے، چائے پی اور مَیں نے عرض کیا کہ چلیے آپ کو مولانا عبدالقدیر صاحب کے ہاں لے چلوں۔ میرے غریب خانے سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو منٹ کا وقت مولانا صاحب کے مکان تک پہنچنے میں لگتا تھا۔ چنانچہ سوئیوالان میں مولانا صاحب کے مکان پر آواز دے کر ہم اوپر چلے گئے۔ وہاں دو تین اصحاب تشریف فرما تھے ـــــ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مولانا صاحب بیمار ہیں۔ گزارش کی گئی کہ اُن سے دریافت کر لیا جائے اگر وہ اجازت دیں تو ایک منٹ کے لیے حاضری کا موقع دیں ہاں اُن سے کہہ دیجیے کہ ٹونک (راجستھان) سے سیّد صولت صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ مولانا صاحب نے بُلا لیا۔ صولت صاحب نے اُن سے مصافحہ کیا اور سلام دعا کے بعد ہم چلے آئے۔ سیڑھیوں میں فرمانے لگے جاؤ اُوپر جا کر اچھی طرح سے اس

آدمی کو دیکھ آؤ۔ جو لمبی لمبی بھوؤں والا خوبصورت نوجوان ایک طرف کو خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ وہی ملتانی صاحب ہیں (صولت صاحب جنوں کو ملتانی کے نام سے ہی پکارتے تھے) میں بڑے اشتیاق سے اُلٹے پاؤں اُدھر گیا۔ اُس شخص نے بڑی محبت اور شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا میں نے سلام کیا وہ صاحب مسکرائے اور ہاتھ سے سلام کا جواب دے کر پھر نظریں نیچی کر لیں ——— سوئیوالان سے میرے غریب خانے تک آتے آتے فرمانے لگے مولانا واقعی تعریف کے قابل ہیں۔ شمع والوں نے دیکھ بھال کر اُن کا سکہ مانا ہے۔ میں نے گھر آکر پھر گزارش کی کہ میاں یہ کوئی جن کا دکھانا تھا۔ قہقہے لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ اسی لیے تو تمھیں آج مولانا قدیر کے یہاں چلنے کو کہا تھا کہ مجھے رات کو سوتے میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہاں انسانی شکل میں کوئی جن آیا ہوا ہے۔ مگر میری تسلی نہ ہوئی اور میرا یہ مطالبہ بدستور رہا کہ حضور جن کو ایسی صورت میں دکھایئے کہ مجھے ڈر بھی نہ لگے اور مجھے یقین بھی ہو جائے کہ ہاں میں نے واقعی جن دیکھا ہے۔ فرمانے لگے اچھا وقت آنے دو ایسا بھی ہو جائے گا۔

میں چاہ بوہڑ والا ملتان چھاؤنی (پاکستان) میں جناب بھیم سین ظفر ادیب کے کرایہ دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھا کہ ایک دن میری والدہ محترمہ (جو بفضلِ خدا حیات ہیں[1]) میری چھوٹی بہن ستیا کو ہمراہ لیے اچانک تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ تونسہ شریف اور آس پاس کے سب حکیموں کو دکھایا ہے اُسے آرام ہی نہیں آتا۔ اس لیے اُسے تمہارے پاس لائی ہوں۔ ملتان بہت بڑا شہر ہے یہاں بڑے بڑے ہسپتال ہیں اور اچھے حکیم بھی اسے دکھاؤ ورنہ مر جائے گی۔

یہ ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت میری بہن کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ مجھے اور میری بیوی کو اس کی حالت دیکھ کر کافی تشویش ہوئی۔ ان دنوں ملتان کے "لقمان" جناب حکیم چیلا رام کا حکمت کی دنیا میں طوطی بولتا تھا اور اُن سے میرے مراسم نیازمندانہ تھے۔ دوسرے دن وہ میری درخواست پر میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میری بہن کو انھوں نے بغور دیکھا۔ متعدد سوالات کرتے رہے جن کے جواب میری بہن یا میری والدہ صاحبہ دیتی رہیں۔ حکیم صاحب نے فرمایا تمہاری بہن کو کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے اس پر میں نے ڈرتے ڈرتے گزارش کی کہ ہمارے گاؤں کی کچھ عورتوں کا کہنا ہے کہ اسے اوپری اثر ہے۔ اِس پر حکیم چیلا رام صاحب مسکرائے کیوں کہ وہ بھی میری طرح اوپری اثر پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ملتان کا سول ہسپتال جو آج کل نشتر ہسپتال کے نام سے مشہور ہے۔ اُس کے بڑے ڈاکٹر میرے جاننے والے تھے میں ستیا کو انھیں دکھانے لے گیا۔ انھوں نے خون۔ تھوک۔ پیشاب۔ ٹٹی وغیرہ کا معائنہ کرایا۔ مگر کچھ بھی تو نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے تمہاری بہن بالکل ٹھیک ہے اور اُسے کوئی بھی جسمانی تکلیف نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ میری بہن نے خون کی اُلٹی اُن کے سامنے ہی کر دی۔ ڈاکٹر صاحب حیران اُسی وقت ایکسرے سیکشن میں بھجوایا دوسرے دن ایکسرے کی رپورٹ ملی تو وہ بھی بالکل ٹھیک تھی۔ یہ ڈاکٹر مسلمان تھے۔ اور ایک اعلیٰ پایہ کے ڈاکٹر ہونے کے باوجود اوپری سائے پر کسی حد تک یقین رکھتے تھے۔ فرمانے لگے میرا خیال بھی یہی ہے کہ اِس لڑکی کو اوپری سایہ ہے آپ کچھ دن اور دیکھئے اگر حالت ایسی رہی تو پھر کسی بزرگ وغیرہ سے

---

[1] اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔

مشورہ کیجیے گا۔

مُلتان چھاؤنی گجرکھڈہ میں ایک لیڈی ڈاکٹر مس سالومن کی اُن دنوں بڑی شہرت تھی۔ اس وقت اس لیڈی ڈاکٹر کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ میرے ان سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ (انجیل انھوں نے ہی مجھے ذہن نشین کرائی) میں نے مس سالومن سے اپنی بہن کا ذکر کیا تو کہنے لگیں کہ کل جمعرات ہے اسے میرے پاس لانا۔

گرمی کا موسم تھا شام کے چھ سات بجے ہم دونوں بہن بھائی مس سالومن کی کوٹھی پر گئے تو وہ بھنگ گھوٹ رہی تھیں گرمی کے موسم میں یہ ہر روز بھنگ۔ بادام چاروں مغز اور دودھ پیتی تھیں۔ مس سالومن نے اپنے خواجہ سرا ملازم سے کہا کہ وہ ایک اُپلے پر دہکتے ہوئے کوئلے لائے۔ پندرہ بیس منٹ میں ملازم اُپلے کے ٹکڑے پر دو دہکتے ہوئے کوئلے رکھ لایا۔ تو سالومن صاحبہ نے پسی ہوئی لال مرچوں کی ایک چٹکی ان کوئلوں پر ڈال کر میری بہن کے ناک کے پاس لے جا کر مرچوں کی دھونی دی۔ ہم سب کا کھانسی سے بُرا حال تھا۔ یہاں تک کہ ہم سب کمرے سے باہر آ گئے۔ مگر سالومن صاحبہ اپنے ناک پر کپڑا رکھے یہ عمل کرتی رہیں اور میری بہن کو ایک چھینک تک بھی نہ آئی جب نصف پون گھنٹے کے بعد کمرے اور کوٹھی کے صحن سے مرچوں کی ناقابلِ برداشت دھونی کا اثر ختم ہُوا تو مس سالومن فرمانے لگیں بھائی صاحب آپ کی بہن کو سو فیصدی اوپری اثر ہے۔ لہٰذا اس کا ڈاکٹری علاج نہ کرائیے بلکہ کسی بزرگ سے رجوع کیجیے۔ مس سالومن کے اس فتویٰ سے مجھے فکر ہوئی اور گھر آ کر میں نے ماں سے کہا کہ آپ بیشک تونسہ شریف لوٹ جائیں۔ معاملہ وہی ہے جس کا شک تھا میں مناسب معالج مل جانے پر اس کا علاج کراؤں گا۔ دوسرے دن میری والدہ تونسہ شریف روانہ ہو گئیں اور میں اپنے کام کاج میں لگ گیا۔

میں نے اپنے احباب سے اس سلسلے میں تاکید کر دی کہ اگر اُن کو کسی ایسے معالج کا پتہ معلوم ہو سکے تو مجھے مطلع کریں۔ میری بہن کو دَورے زیادہ تعداد میں پڑنے شروع ہو گئے۔ کبھی کبھی تو دن میں کئی کئی بار ایسا ہوتا ورنہ دن بھر میں ایک بار ضرور ایسا ہوتا اور خصوصاً جمعرات کو دَوروں کی تعداد زائد رہتی۔ بیٹھے بٹھائے یا جیسی بھی حالت میں وہ ہوتی یہ دَورے پڑ سکتے تھے۔ ہاتھ کی مٹھیاں اتنی مضبوط بھنچ جاتی تھیں کہ کوئی طاقت انھیں کھول نہیں سکتی تھی۔ بے ہوشی مکمل طور پر چھا جاتی اور دس پندرہ منٹ کبھی آدھ پون گھنٹے اور کبھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں بے ہوشی کا یہ دَورہ اپنے آپ ختم ہو جاتا اور جب مٹھیاں کھلتیں تو چھوٹی الائچی کبھی دو کبھی تین اور کبھی چار کی تعداد میں اُن میں سے برآمد ہوتیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم نے ایسی لمبی اور بہترین الائچی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی دیکھنے والوں نے بتایا کہ یہ الائچی ہانگ کانگ میں ہوتی ہے۔ ہم ڈر کے مارے ان الائچیوں کا استعمال نہیں کرتے تھے مگر ایک دن میری بہن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ بھابھی وغیرہ تو مجھ سے ڈرتی ہیں کیا تم بھائی ہو کر بھی ڈرتے ہو۔ میرا ذمہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ یہ الائچیاں تم کھا لیا کرو۔ میں نے اندر سے ڈرتے ڈرتے مگر ظاہری طور پر اپنی بہن کی بات رکھتے ہوئے اور اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں تم سے یا ان الائچیوں سے ہرگز نہیں ڈرتا اُس کے سامنے ہی ایک الائچی منہ میں ڈال لی اور اُس کے بعد یہ عالم رہا کہ جب بھی یہ الائچیاں مٹھی میں سے برآمد ہوتیں میں بے تابی سے انھیں کھا جاتا۔ دو تین مُلّا مولوی آئے کچھ نے آیات پڑھیں اور کچھ نے آسیب نکالنے کے لیے ثابت ماش بکرے کی کلیجی سالم۔ مرغی کا دھاگہ وغیرہ سے کچھ ٹونے ٹوٹکے کیے۔ مگر جو مولوی قرآن کی آیات پڑھتے وہ تو خیریت سے

چلے جاتے مگر جن ملّاؤں نے ڈھونگ رچائے ان کی میری بہن کافی بے عزتی کرتی اور وہ ایسی ڈراؤنی شکل بناکر اُن کو بُرا بھلا کہتی کہ ہمیں خود بُرا لگتا۔ مگر وہ ملّا مولوی پھر تشریف نہ لاتے۔

۱۹۴۷ء آگیا اور مُلک کی تقسیم کی مُصیبت نازل ہوئی۔ شروع اگست میں نواب عاشق حسین کو لاہور میں ایک پولیس مین نے گولی ماردی تو سارے مُلتان میں خوف و ہراس چھاگیا۔ پاکستان بننے کا اعلان ہوچکا تھا۔ جس کی وجہ سے مُلتان میں آتش زنی وغیرہ کے واقعات ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر بھلا ہو ریڈیو والوں کا کہ بہت جلد قاتل کے نام کا اعلان کردیا گیا اور مُلتان کے غیر مُسلموں نے سُکھ کا سانس لیا۔ اُسی روز میری بہن کو بڑا طویل دَورہ پڑا اور مَیں پاک دروازہ سے ایک مولوی صاحب کو بُلانے کے لیے جانا چاہتا تھا مگر شہر میں جو خوف و ہراس پھیلا ہُوا تھا اس کے پیشِ نظر میری بیوی نہیں چاہتی تھی کہ مَیں گھر سے باہر جاؤں مگر مَیں اپنی بہن کی غیر حالت دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا اور بیوی کے منع کرنے پر بھی گھر سے نکل گیا۔ ابھی میں چاہ بوہڑ والا کی مین سڑک پر بھی نہیں گیا تھا کہ میری بیوی بھاگتی ہوئی اور ہانپتی ہوئی مجھے آوازیں دیتی ہوئی دکھائی دی معلوم کرنے پر اس نے بتایا کہ ستیا کی بے ہوشی جاتی رہی ہے اور اُس نے کہا ہے کہ بھائی کو بُلا لو پاک دروازہ پر ابھی ابھی دو آدمیوں کا قتل ہوا ہے۔ مَیں واپس آگیا اور شام کو معلوم ہوا کہ واقعی پاک دروازہ پر اسی وقت دو غیر مسلم دوکاندار قتل کردیے گئے تھے۔ اب ہم نے بھی پاکستان سے ہندوستان آنے کی تیاریاں شروع کردیں کہ میرا لڑکا پریم ساگر جو مُلتان چھاؤنی کے کنٹونمنٹ بورڈ میں پڑھتا تھا اور اس کی عمر اس وقت چھ سات سال ہوگی سکول سے گھر آرہا تھا کہ ملٹری ٹرک نے اُسے ٹکر ماری اور اس کی بائیں ٹانگ کی ہڈی توڑ دی۔ ملٹری والے اسے ٹرک میں ڈال کر ملٹری ہسپتال لے گئے۔ جوں ہی ہمیں معلوم ہوا مَیں اور میری بیوی دیوانہ وار ملٹری ہسپتال ٹانگے پر پہنچے۔ مگر وہاں جانے پر پتہ چلا کہ ہسپتال والوں نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد بچے کو سول ہسپتال مُلتان بھیجوا دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے تانگے والے سے سول ہسپتال جانے کو کہا تو اُس نے کہا کہ راستہ میں ہندو محلّے پڑتے ہیں مَیں نہیں جاؤں گا۔ مَیں مُسلمان ہوں کوئی مجھے مار دے گا۔ بڑی مشکل سے اسے اس بات پر راضی کیا گیا کہ اچھا ہمیں وہاں تک چھوڑ دے جہاں تک تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہو اس نے بوہڑ دروازہ پر لاکر چھوڑ دیا وہاں سے ہم پیدل ہی سول ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال کے انچارج مُسلمان ڈاکٹر میرے واقف کار تھے۔ اُن سے ملا تو پتہ چلا کہ جو کچھ وہ کرسکتے تھے انھوں نے کردیا ہے اور لڑکا جنرل وارڈ میں بستر پر ہے اور اُس کی ٹانگ کو ویٹ باندھ کر لٹکا دیا گیا ہے۔ اب ہماری پاکستان سے بھاگنے کی سب تیاریاں ماند پڑ گئیں اور ۲۱ دن تک ہسپتال میں بچّے کی دیکھ بھال کے لیے رہنا پڑا۔ قدرت نے یہ کرم ضرور کیا کہ ان دنوں میں میری بہن کو کوئی دَورہ نہیں پڑا۔ اور وہ روٹی وغیرہ پکا رکھتی۔ اور گھر کا سارا کام کاج کر رکھتی ان دنوں میں ہم اپنی پریشانی کے باعث اس کی طرف کوئی دھیان نہ دے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی علاج کرایا مگر یہ بالکل ٹھیک رہی جس سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر اس کا علاج نہ کرایا جائے تو یہ اچھی رہتی ہے اور اگر علاج کرایا جاتا ہے تو اسے دورے وغیرہ زیادہ پڑتے ہیں۔

میرا چھوٹا بھائی اُن دنوں مُلتان میں ہی محکمہ پولیس میں تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اہل و عیال کو لے کر ہندوستان چلا جاؤں وہ والدہ صاحبہ اور والد صاحب کو تونسہ شریف کیمپ سے لے کر ہندوستان آجائے گا۔ چنانچہ مَیں اپنے اہل و عیال کے ساتھ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی آگیا۔ اور ایک سال بعد میری بہن کی شادی شری لوک ناتھ بٹوارہ سے کردی گئی۔ کیونکہ کچھ ڈاکٹروں نے ہمیں یہ صلاح دی کہ اگر اس لڑکی کی شادی

کردی جائے تو ہو سکتا ہے یہ دَورے وغیرہ پڑنے ختم ہو جائیں۔ مگر ہؤا یہ کہ شادی کرنے کی دیر تھی کہ میری بہن کی حالت ایسی بگڑی کہ وہ گھنٹوں ہوش میں نہ آتی۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد خون کی اُلٹی۔ بہرکیف اب یہ اپنے خاوند کے ساتھ کشمیری گیٹ حسن بلڈنگ والے سرکاری کوارٹرز میں رہنے لگی۔ مگر اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے دو سال بعد لڑکا پیدا ہؤا۔ اگر وہ کسی کام کے لیے مکان کو تالا لگا کر باہر جائے تو جب تالا کھولے تو کمرہ میں جوت جل رہی ہوتی۔ آٹے کا دِیا ایسا خوبصورت ڈیزائن سے بنایا ہوتا جیسے کسی انجینئر نے بنایا ہو اور اُس میں اصلی گھی ہوتا اور جوت جل رہی ہوتی۔ یہ بیچارے ڈالڈہ گھی کھاتے تھے ان کے گھر میں اصلی گھی ہوتا ہی نہیں تھا۔ اگر کوئی مہمان آجائے تو رسوئی میں خود بخود پکا پکایا کھانا آجائے۔ عجیب و غریب واقعات ہونے لگے چھوٹی بچّی گم ہو گئی۔ تھانے میں رپورٹ لکھوائی گئی مگر چار دنوں کے بعد دیکھا کہ لڑکی اپنے آپ گھر کے آنگن میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اُس کے پاس بڑے اچھے کپڑے بسکٹ مٹھائی وغیرہ کا بندھا ہؤا پیکٹ رکھا ہے لڑکی سے پوچھا گیا کہ تو کہاں گئی تھی کہنے لگی کہ ایک بابا تھا وہ کہیں لے گیا تھا۔ خوب مٹھائی دیتا تھا۔ ٹافیوں کا ڈبّہ دیا ہے اور کہتا تھا کہ تو رو نہیں اور نہ ڈر میں تجھے تمہارے ماں باپ کے پاس چھوڑ آؤں گا۔ جب بھی میں روتی تو فوراً نیند آجاتی تھی۔ تھانے پر اطلاع دی گئی کہ لڑکی آگئی ہے اور وہ یہ بیان دیتی ہے۔ پولیس والوں نے کپڑے مٹھائی وغیرہ دیکھی اور چپ ہو رہے۔ پھر یہ معمول ہو گیا کہ پندرہ بیس دنوں کے بعد لڑکی گم ہو جاتی اور ایک یا دو تین دن کے بعد آجاتی اور سامان سے لدی پھندی ہوتی۔

جب میں اپنی بہن کے ہاں جاتا تو لازمی طور پر کوئی نہ کوئی چیز دھڑام سے گرتی۔ کبھی لمبے لمبے چھوہارے ہوتے کبھی چھوٹی الائچیاں وہی جو مُلتان میں آتی تھیں۔ کبھی سردیوں میں آم۔ کبھی کوئی ایسا پھل جس کا نہ ہمیں نام معلوم ہوتا اور نہ اس کے کھانے کا ہمیں کبھی تجربہ ہوا ہوتا میرا بھائی ان سب باتوں کو ڈھونگ سمجھتا تھا میرے بھائی شری دھرم پال سب انسپکٹر سی آئی ڈی فیروز جھر کا ضلع گوڑگاؤں ایک دن میرے ساتھ ستّیا کے مکان پر گئے تو ستّیا نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا کہ آج تو میرے بھائی کو تنخواہ ملی ہے۔ اور پانچ پانچ روپے کے نئے نئے نوٹ ملے ہیں۔ میری بہن کہنے لگی لو ان میں سے یہ ایک نوٹ ہے اپنے نوٹ گن لو یہی نوٹ کم ہو گا۔ میرے بھائی نے سرکاری وردی پہن رکھی تھی جیب کا بٹن کھول کر نوٹ نکالے تو واقعی وہ سب پانچ پانچ کے تھے اور بالکل نئے اور سلسلہ وار نمبر کے تھے۔ دیکھا تو واقعی اس نمبر کا نوٹ جیب میں نہ تھا جو میری بہن نے واپس کیا۔ ابھی ہمیں بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ دھڑام سے ایک پیکٹ گرا۔ میری بہن نے کھولا تو اُس میں بہترین قسم کے بسکٹ تھے۔ چائے میری بہن نے بنائی اور ہم دونوں بھائیوں نے یہ بسکٹ مزے سے چائے کے ساتھ کھائے جب چلنے لگے تو ستّیا کہنے لگی بھائی دھرم پال جی آپ ان باتوں کو ڈھونگ کہتے اور سمجھتے ہو ذرا موری گیٹ کی فلاں دوکان پر جاؤ اور دریافت کرنا کہ یہ بسکٹ کون لے گیا تھا۔ ہم دونوں بھائی اُس دوکان پر پہنچے تو سامنے ہی شیشے کی مرتبان میں وہی بسکٹ موجود تھے۔ ہم نے دوکاندار سے پوچھا کہ ابھی آدھ پون گھنٹے پہلے یہ بسکٹ کون لے گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا اور سوا روپیہ کے پاؤ بھر لے گیا تھا (ان دنوں کلوگرام کا سلسلہ نہیں تھا)

ہم دیہاتی علاقے کے رہنے والے ہیں ایک دفعہ میں اپنی بہن کے ہاں کافی رات تک بیٹھا رہا اور باتیں

ہوتی رہیں کہ رات کے دس بجے کے قریب کوئی چودہ پندرہ آدمی بہادر پور ضلع گورگاؤں سے آگئے۔ جو میرے بہنوئی کے رشتہ دار تھے۔ اخلاقاً میرے بہنوئی نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے ابھی کھانا تو کھایا نہیں ہوگا انھوں نے کہا کہ کھانا تو ہم کھائیں گے۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ میری بہن کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور وہ نہایت غصے کے عالم میں رسوئی میں گئی اور اپنے خاوند کو بُلا کر کچھ کہا۔ دو منٹ بعد میرے بہنوئی نے ان مہمانوں سے کہا کہ کھانا تیار ہے کھانے کے لیے ہاتھ دھو لیجیے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تنوری روٹیاں، ثابت ماش کی دال۔ آلو گوبھی کی سبزی۔ بیگن کا بھرتہ۔ چاول وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ ان دیہاتی مہمانوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور میں حیران کہ کیا اس برات کے لیے پہلے ہی سے میرے بہنوئی نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے رسوئی میں جا کر بہن سے اشارے سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے تو وہ مسکرائی اور کہنے لگی کہ بے وقت آنے والے اُجڈ مہمانوں کے لیے اپنے آپ ہی کھانا آگیا ہے۔

ہم دونوں بھائی کسی کام سے اپنی بہن کے گھر گئے۔ میرے بہنوئی کی قمیض کوئی کیل وغیرہ لگ جانے کے باعث پیچھے سے تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی۔ میرے بھائی نے ازراہِ مذاق کہا لوک ناتھ جی آپ کو کیا پرواہ ہے پھٹی ہوئی قمیض کیوں پہن رکھی ہے۔ ستیا سے کیوں نہیں کہتے کہ جو اُس کے سر پر ہیں اُن سے آپ کو قمیض منگوا دے۔ ابھی یہ بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ زور سے ایک بنڈل گرا۔ کھولا تو اُس میں دو قمیضیں تھیں اور اُن پر ہانگ کانگ کے کسی دوکان کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ اب میرے بھائی کی پولیسیانہ دلیل جواب دے چکی تھی اور اُس نے بھی اس معاملہ کو سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس کا کیا علاج ہو۔

مجھے جناب بشیر احمد صاحب سابق وزیر اعظم ریاست مالیر کوٹلہ (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے) نے لکھا کہ مالیر کوٹلہ میں ایک صاحب ہیں جو آسیب وغیرہ اُتارنے کا کام کرتے ہیں اس علاقہ میں مشہور ہیں اگر آپ مناسب خیال کریں تو اُن سے بات کر دیکھیے۔ میں خط ملتے ہی مالیر کوٹلہ گیا جناب بشیر صاحب اور مبجز فرحت صاحب (مرحوم) نے دو دن مجھے اپنا مہمان رکھا۔ شام کو ہم بازار میں جا رہے تھے کہ اُن ملاّ جی کو ایک دوکان پر کھڑے دیکھا۔ ایک لالہ جی اُن سے کہہ رہے تھے کہ مولوی صاحب اگر آپ یہ گرم گرم دودھ کی کڑھائی جو کہ حلوائی کی دوکان پر بھٹی پر رکھی ہوئی تھی ساری پی جاؤ تو سارے دودھ کی قیمت ..... بھی میں دوں گا اور بیس روپے انعام بھی دوں گا۔ ملاّ جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا کمبل سا جو انھوں نے اوڑھ رکھا تھا اسے اُتارا اور بھٹی کے قریب ہی بیٹھ کر اس کمبل کو اپنے مُنہ اور سر کے علاوہ کڑھائی پر اس طرح ڈال لیا کہ کڑھائی نظر نہ آئے اور نہ ہی مولوی صاحب کا منہ نظر آئے۔ اور بسم اللہ کی آواز سنائی دی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ملاجی یا اللہ کہتے ہوئے اُٹھے تو دیکھا کہ گرم گرم دودھ کی کڑھائی جس میں کم از کم ۲۰ سیر دُودھ یقیناً ہوگا بالکل خالی تھی کڑھائی کے نیچے دہکتے ہوئے کوئلے بدستور موجود تھے اور خالی کڑھائی سے دھواں اٹھ رہا تھا ہم سب حیران رہ گئے۔ شرط لگانے والے لالہ جی نے بیس روپیہ ملاّ جی کو دیئے اور حلوائی کو دودھ کی قیمت ادا کی۔

اِس واقعہ سے میرے دل نے گواہی دی کہ یہ صاحب واقعی میری بہن کا علاج کر سکیں گے اور میں اُن مولوی صاحب کو دہلی اپنے ساتھ لے آیا۔ ہم مالیر کوٹلہ سے رات کو سوار ہوئے اور صبح دہلی آگئے۔ دریا گنج والے فلیٹ میں میں نے اور ملاجی نے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور دس بجے کے قریب میں اُن کو لے کر کشمیری گیٹ اپنی بہن کے ہاں پہنچا۔ میری بہن اپنے کوارٹر کے باہر ہی صحن میں کھڑی تھی ہمیں دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

اور شکل بگڑ گئی۔ میری بہن کسی بھی عالم میں ہوتی میرا احترام وہ ضرور کرتی مگر آج اُس کا لب و لہجہ بہت حد تک بدلا ہوا تھا اور پنجابی زبان میں ہذیانی کیفیت کے عالم میں کہنے لگی کہ تو روز روز کسی نہ کسی کو میرے علاج کے لیے لے آتا ہے۔ بس یہ کہنا تھا کہ میری بہن نے بھاری بھرکم مولوی صاحب کو اُٹھا کر صحن میں پٹخ دیا۔ مولوی صاحب کی پگڑی اور کلاہ ادھر ادھر گر گئے اور مولوی صاحب پگڑی اور کلاہ اُٹھا کر یہ جا اور وہ جا اور میں اُن کو بھاگتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب میری بہن کا غصّہ کچھ کم ہوا تو مجھے کمرہ میں لے جا کر چارپائی پر بٹھا دیا (یہ بھی یاد رہے کہ میری بہن میرے علاوہ کسی کو بھی کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتی تھی) اور نہ کسی کو چارپائی پر بٹھاتی تھی۔ پانی کا گلاس لا کر مجھے دیا۔ کہنے لگی گنگا جل ہے ابھی ابھی ہردوار سے آیا ہے پی لو میں نے چسکی لیتے ہوئے کہا کہ اِس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ گنگا جل ہے۔ یہ سُنتے ہی اُس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور تُرشی کے لہجہ میں کہنے لگی ہم لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ اور اتنے میں ایک ہردواری لوٹا گنگا جل سے لبالب سامنے اپنے آپ میز پر آ گیا اور میری بہن کہنے لگی کہ اس کی پہچان یہ ہے کہ نلکے کے پانی میں کلورین کی بُو ہوتی ہے جو اسے صاف کرنے کے لیے ڈالی جاتی ہے۔ یہ گنگا جل ہے اِس میں کلورین کی بُو نہیں ہے۔ میں نے گنگا جل کا ایک گلاس پیا ہی تھا کہ ایک تھیلا گرا جس میں ہردوار کا گرم گرم پرشاد تھا میں نے اسے بھی کھایا۔ اب میری بہن کا غصہ کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ مُسکراتے ہوئے کہنے لگی اور کیا کھاؤ گے۔ آئندہ ایسے آدمیوں کو میرے ہاں نہ لایا کرو اِس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے تم تو اپنی بہن کے علاج کے لیے خرچ کر کے علاج کرنے والوں کو لاتے ہو اور مجھے اِس سے تکلیف ہوتی ہے اِس لیے آئندہ ایسا نہ کرنا۔

مجھے مولوی صاحب کا فکر تھا۔ اس لیے میں بہن سے کہہ کر جہاں مولوی کی خبر لوں اُٹھ کر گھر آنے لگا تو میری بہن کہنے لگی کہ وہ تو مالیر کوٹلہ کی گاڑی پر سوار ہو کر بہادر گڑھ بھی پہنچ گیا ہے۔ اُس کا فکر نہ کرو اور اب کھانا یہیں کھا کر جانا۔ کہنے لگی کہ تم تو کھانا ایک بجے کھاتے ہو اب ساڑھے بارہ تو بج ہی گئے ہیں۔ اگر ابھی کھانا ہو تو ابھی کھا لو ورنہ اپنے مقررّہ وقت پر ایک بجے کھا لینا تمہارے بہنوئی بھی تیس ہزاری کچہری سے آ جائیں گے۔

کھانے میں مُرغ۔ گوشت، زردہ، تنوری پراٹھے۔ رایتہ۔ دسہری آم وغیرہ اس افراط سے تھا کہ میری بہن اِن اخراجات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ذرا سا سوچا تو بہن کہنے لگی سوچتے کیا ہو کھاؤ میں نے سب چیزیں ایسی منگائی ہیں جو تمہیں پسند ہیں۔ میں سب سمجھ چکا تھا۔ مگر کھانے میں، میں نے کوئی کمی نہ کی تین بجے دریا گنج آ گیا۔ بیوی کہنے لگی کہ کھانے میں اتنی دیر کر دی جلدی کرو مجھے بڑی بھوک لگی ہے میں نے اُسے بتایا کہ ستیا کے یہاں یہ گزری اور اُس کی ناراضگی دُور کرنے کے لیے کھانا وہیں کھا لیا آس پاس ٹیلی فون نہ ہونے کے باعث تمہیں اطلاع نہ دے سکا کہ تم میرا انتظار نہ کرو اور کھانا کھا لو۔

اب میں نے بھی خیریت اسی میں سمجھی کہ بہن کا علاج نہ کرایا جائے اس عرصے میں یہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ایک دن میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میری بہن بڑی سہمی ہوئی آ گئی اور کہنے لگی کہ فوراً میرے ساتھ چلو میری بیوی نے پوچھا کہ ستیا کیا ہوا تو کہنے لگی پوچھو مت تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ ہم دونوں میاں بیوی ستیا کے ساتھ ہو لیے بس پر کشمیری گیٹ پہنچے اور وہاں سے حسن بلڈنگ سرکاری کوارٹر تک پیدل گئے۔ میری بہن نے تالا کھولا تو دیکھا کہ دھوپ اگربتی وغیرہ کے دھوئیں سے کمرہ بھرا پڑا ہے جب دھوآں کم ہو گیا تو سارے

کمرے میں مسحور کُن خوشبو اس کثرت سے آرہی تھی جیسے کسی نے سینٹ کا کنٹر چھڑک دیا ہو۔ دیکھا تو گوبر سے کچھ جگہ لپی ہوئی ہے۔ اس پر بڑا ہی بہترین کپڑے کا ٹکڑا بچھا ہوا ہے اور اس پر گلاب اور دوسرے کئی قسم کے پھول پڑے ہوئے ہیں۔ اصلی گھی سے آٹے کے بڑے دیئے میں جوت جل رہی ہے اور آس پاس اکنی چونی اور پیسے وافر تعداد میں رکھے ہوئے ہیں میری بیوی نے میرے کان میں کہا کہ یہ سب کچھ اس نے خود کیا ہوگا اور ہمیں سچّی بننے کے لیے دکھانے آئی ہے۔ میری بیوی کا یہ کہنا تھا کہ ہماری موجودگی میں سینٹ کی پھوار ہمارے منہ پر پڑی اور پھولوں کا ایک گلدستہ دھڑام سے گرا۔ ہم دونوں خاموش رہے اور شام کو جب میرے بہنوئی اپنے دفتر سے تیس ہزاری سے اور بچے اسکول سے آگئے تو ہم دریا گنج آگئے۔

اب محلّے کی عورتوں نے میری بہن کو "پیرنی" سمجھنا شروع کر دیا اور اس سے دریافت کرنے لگیں کہ میرا یہ کام ہو جائے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ اور میری بہن نے واقعی اپنے آپ کو پیرنی سمجھنا شروع کر دیا اس کی کہی کوئی بات سچ ہو جاتی ورنہ اکثر و بیشتر جھوٹی ثابت ہوتیں۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ یہ جسے بیمار کرنا چاہتی یا اس کا مالی نقصان کرنا چاہتی وہ ہو جاتا تھا۔ لہٰذا میری بہن نے اپنے رشتہ داروں سے گن گن کر بدلے لیے اور کئی حرکات ایسی کیں جن کے اثرات اب تک موجود ہیں اور ان برائیوں کا نتیجہ خود میری بہن کو مل رہا ہے۔

قبلہ صولت صاحب جن کا پورا نام سید محمود الحسن تھا۔ عرب النسل تھے ان کے والد صاحب عرب سے ٹونک تشریف لائے تو والئ ٹونک نے جاگیر عرب عطا کی اور انھوں نے ایسے رُوحانی کمالات دکھائے کہ اہلِ ٹونک اور والئ ٹونک ان کے والہ و شیدا ہو گئے عرب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند جناب سید محمود الحسن صولت نے روحانی کمالات میں اپنے والد محترم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ شاعری تو ان کے گھر کی باندی رہی اور روحانی طور پر ان کے کمالات میں بھی ان کا ثانی مجھے کوئی نہ ملا۔ اپنی بہن کے بارے میں کئی بار سوچا کہ مفصّل حالات قبلہ صولت صاحب کی خدمتِ اقدس میں تحریر کروں مگر یہی فیصلہ کیا کہ جب اُن سے ملاقات ہوگی تو بالمشافہ گزارش کروں گا اور اب وہ گھڑی آگئی تھی۔ ایک روز شام کے چار بجے ہوں گے گرمی اپنے شباب پر تھی۔ اُن دنوں میری رہائش اور دفتر ایک ہی جگہ نہیں تھے لہٰذا میں دفتر کے دروازے بند کر کے ایک چٹائی بچھا کر دوپہر کو سو گیا۔ نیند کے خمار میں باہر کا دروازہ کھٹکھٹانے کی مسلسل آوازیں محسوس ہو رہی تھیں مگر میں ان سُنی کیے لیٹا رہا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ میرے دفتر سے ملحقہ فلیٹ کا ایک ملازم دیوار پھاند کر صحن میں آیا اور کمرے کے دروازے میں لگے شیشوں سے جھانکتے ہوئے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ طوعاً کرہاً میں اُٹھا دروازہ کھولا تو وہ صاحب کہنے لگے کہ ٹونک سے صولت صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کی سیڑھیوں والا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے مگر آپ کی آنکھ نہیں کھلی تو وہ آدھ گھنٹے سے ہمارے ہاں بیٹھے ہیں۔

میں آنکھیں ملتا ہوا اُن کے پاس گیا تو میاں حسبِ عادت مسکرا رہے تھے کہنے لگے بیٹا خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ دل نہیں مانا اور تمہیں جگوا دیا میں نے معذرت کرتے ہوئے اپنے ہاں چلنے کو کہا تو فرمانے لگے ممنور نے چائے منگائی ہے پی کر چلتے ہیں۔ تقریباً پانچ بجے ہم اپنے فلیٹ میں آئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں میں نے بڑے مایوسی کے لہجے میں کہا میاں میری بہن پر کسی روح کا سایہ ہے اور آپ کے ہوتے وہ ٹھیک نہ ہو تو میری بدقسمتی ہی ہو سکتی ہے۔ ابھی میں ساری تفصیل سُنا ہی رہا تھا کہ میری بہن معہ اپنے شوہر کے آگئیں میں نے صولت صاحب کو بتایا کہ یہ میری بہن اور بہنوئی ہیں۔ ابھی صولت صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میری بہن خاصی

ناہموار زبان میں کہنے لگی ہاں ہاں مجھے وہیں پتہ لگ گیا تھا کہ تم کسی بڑے مولوی سے میرے بارے میں بات کر رہے ہو اسی لیے تو میں خود یہاں آ گھسی ہوں اتنے میں سامنے والے چھوٹے کمرے میں کتابوں سے بھری ہوئی الماری اپنے آپ دھڑام سے گری جس کے دھماکے سے نیچے مارکیٹ والے چار پانچ دوکاندار بھاگے بھاگے اُوپر آئے کہ کیا ہو گیا ہے۔ میاں خوب قہقہے لگاتے رہے اور میری بہن مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آج پانی بھی نہیں پلاؤ گے۔ میں نے ٹیلیفون سے نیچے دوکاندار سے کہا کہ چار لیمن کی بوتلیں بھجوا دے۔ اُن دنوں گولی والی بوتل ہوتی تھی۔ دو تین منٹ بعد دوکاندار کا آدمی چار بوتلیں لیکر آیا۔ ہم سب نے ایک ایک پی تو میری بہن کہنے لگی میں اور پیوں گی۔ میں نے دوکاندار کے آدمی سے کہا کہ جلدی سے دو بوتلیں اور لے آؤ مگر میری بہن نے چیخ کر کہا کہ دو سے کیا ہو گا۔ دو درجن منگاؤ۔ دوکان کا آدمی دو بوتلیں ہی لایا۔ اور میری بہن نے ایک ہی سانس میں اُنھیں پی کر کہا کہ اور لاؤ۔ مجھے صولت صاحب نے اشارہ کیا کہ اور منگا دوں میں نے دوکاندار کے مُلازم سے کہا دس بوتلیں اور لے آؤ۔ ان بوتلوں کے ساتھ بھی میری بہن نے یہی سلوک کیا اور کہنے لگی کہ ابھی میری پیاس نہیں بجھی ایک درجن بوتلیں اور منگاؤ۔ اب صولت صاحب فرمانے لگے بس اور ایک بوند بھی نہیں ملے گی۔ ایک درجن بوتلیں تو کجا۔ اتنا سُننا تھا کہ میری بہن کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور میں یہ توقع کر ہی رہا تھا کہ اب یہ صولت صاحب سے اُلجھ جائے گی مگر کیا دیکھتا ہوں کہ صولت صاحب نے بائیں پاؤں سے بائیں کا کپڑے والا جوتا اُتارا اور زور سے کمرے کے فرش پر مارتے ہوئے کہا، خبردار کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سیّد ہیں اور حضور رسُول اللہ کی اولاد میں قبلہ کا اتنا کہنا تھا کہ میری بہن نے نظریں نیچی کر لیں سر پر دوپٹا کیا اور کرسی پر بیٹھنے لگی ہی تھی کہ صولت صاحب نے فرمایا خبردار ہمارے سامنے یہ جرأت کہ تم کرسی پر بیٹھو۔ کھڑے رہو اور اگر بیٹھنا چاہو تو نیچے بیٹھ جاؤ۔ میری بہن دو منٹ تو کھڑی رہی اور پھر نیچے بیٹھ گئی۔

صولت صاحب کا پارہ جب کچھ اُترا تو مُسکرا کر کہنے لگے بیٹا ذرا نیچے سے کسی دوکان سے تھوڑی روئی تو منگانا۔ میں نے اپنے بہنوئی ہی سے کہا کہ نیچے سندھی کے ہاں سے روئی لے کر آؤ۔ جب میرے بہنوئی روئی لیکر آئے تو صولت صاحب نے کہا کہ اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دو اور میری بہن سے کہنے لگے کہ اسے سونگھو اور بتاؤ کہ اس میں سے خوشبو آ رہی ہے یا بدبو۔ میری بہن نے روئی کو سونگھا اور مسلسل اس طرح سونگھے گئی جیسے کوئی بہترین عطر سونگھ رہی ہو۔

صولت صاحب نے پھر خفیف سی خفگی سے کہا کہ جلدی بتاؤ خوشبو ہے یا بدبو تو میری بہن نے بڑی خفیف ہلکی سی آواز میں جواب دیا خوشبو ہے۔ صولت صاحب فرمانے لگے اسے اپنے دوپٹے کے ایک کنارے میں باندھ لے اور صبح کو دیکھنا کہ یہ روئی کوئی کھول کر لے گیا ہے یا بدستور موجود ہے اس کے بعد میری بہن کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ آدھ مری ہو گئی ہو اُس سے چلا نہ گیا تو صولت صاحب نے تحکمانہ لہجہ میں کہا جاؤ دوسرے کمرے میں چٹائی پر لیٹ جاؤ۔ میں نیچے گیا۔ دوکاندار کو ہدایات دیں کہ وہ ہمارے لیے چائے عام طور پر جیسی وہ بناتا ہے ویسی ہی بنائے مگر قبلہ کے لیے شکر حد سے زیادہ ڈالے اور کڑک بنائے، پندرہ منٹ تک چائے آئی ہم سب نے چائے پی اور صولت صاحب نے میرے بہنوئی سے کہا کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ کل تو تم نوکری پر جاؤ گے۔ اسے یہاں بھیج دینا۔

تھا کہ شاید آپ میری وجہ سے آئیں ہی نہیں۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے مشاعروں کی رُوداد کو ایک الگ اور دلچسپ انداز میں لکھنے کی تعریف ایسے انداز میں فرمائی کہ شاید ہی کسی ادیب یا شاعر نے ایسی تعریف کی ہو۔ میں نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا تو بیگم صاحبہ نے چھوٹا پیگ ختم کرتے ہوئے اُن حاسدانِ کرام کی کرم فرمائیوں کی داستان سُنانا شروع کی جو ایڈیٹر شانِ ہند کے خلاف بیگم صاحبہ کے کان بھرا کرتے تھے۔ ان شعرائے کرام نے بیگم صاحبہ کے عشق میں جو دلچسپ حماقتیں کی تھیں ان کی تفصیل بیگم صاحبہ نے اس دِل کش انداز میں سُنائی کہ ہنستے ہنستے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ یہ تمام دلچسپ حقیقتیں آپ انھیں صفحات میں پڑھ سکیں گے۔

راقم نے اپنی زندگی میں دو عورتوں کو ایسا پایا کہ پوری بوتل وہسکی پی جانے پر ان کے ہوش وحواس میں اور بھی تازگی آجائے۔ اُن میں سے ایک یہ آنتِ جاں تھیں اور دُوسری کا ذکر یہاں مناسب نہیں ——— بارہ بجے تک کھانا ختم ہُوا اور یہ محفل ختم ہوئی ——— بیگم صاحبہ کا باقاعدہ تعارف اسی محفل میں ساحر صاحب کے طفیل ہُوا۔

محولہ بالا واقعات سے آپ کسی حد تک غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے یہ واقعہ بھی سُنتے جائیے کہ جناب ساحر ہوشیارپوری کی بیگم صاحبہ تشویشناک حد تک علیل ہو کر نرسنگ ہوم میں داخل ہوئیں تو یہی بیگم صاحبہ ایک تجربہ کار نرس کی طرح کئی دنوں تک بیگم ساحر کی تیمارداری میں اپنے آپ کو بھول گئیں اور یہ حقیقت ہے کہ جس اپنائیت اور نیک نیتی سے بیگم صاحبہ نے یہ تیمارداری کی اُس کی تعریف ان کے دُشمنوں نے بھی کی ——— غرض کہ ان بیگم صاحبہ کو قدرت نے کچھ ایسی خوبیاں بھی عطا کی تھیں کہ آج جب کہ وہ ان کا ہوش رُبا حُسن و شباب سفید بالوں اور جھُرّیوں میں تبدیل ہو گیا ہے اور مخمل و اطلس کے بستر پر سونے والی یہ بلبلِ ہزار داستان آج ایک آستانے کے حُجرے میں مقیم ہے، انھیں انتہائی عزّت و احترام کے ساتھ سلام کرنے کو سر جھک جاتا ہے۔

دوسو اٹھاون

دوسرے دن میری بہن جب آئی تو اُس نے آتے ہی صولت صاحب کے پاؤں چھوئے اور اُن کے قدموں کے پاس نیچے ہی بیٹھ گئی۔ صولت صاحب نے بڑے دلاسے سے اُسے کرسی پر بٹھایا اور رات کی کیفیت دریافت کی تو میری بہن روتے ہوئے کہنے لگی کہ کل جو کچھ مَیں نے کیا یا آپ کو کہا وہ میرے اختیار کی بات نہ تھی اُس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ صولت صاحب نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا کہ تو میرے بیٹے کی بہن ہے تو میری بھی لڑکی ہی ہے۔ تو گھبرا نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میری بہن نے جو حالات بتائے انھیں سُننے کے بعد صولت صاحب فرمانے لگے بیٹا کوئی اچھی رُوح ہے باقی باتیں ہم رات کو کریں گے۔

رات کو مجھے صولت صاحب نے بتایا کہ یہ ایسی رُوح ہے جو تمہاری بہن کو مالا مال بھی کر سکتی ہے۔ مگر مَیں گزشتہ حالات سے اتنا گھبرایا ہُوا تھا کہ مَیں نے قبلہ سے کہا کہ ہمیں مال وال کی ضرورت نہیں آپ اسے ٹھیک کر دیجیے۔ دوسرے دن میرے بہنوئی آئے قبلہ نے انھیں تمام حالات بتائے تو وہ ہاتھ باندھ کر کہنے لگے میاں جی اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو مَیں نوکری چھوڑ کر اپنی ٹیکسی چلانا چاہتا ہوں اور دیگر اسی قسم کی کئی باتیں اس نے صولت صاحب سے کہیں۔ جنھیں مَیں خاموشی سے سنتا رہا۔

رات کو جب میرے بہنوئی کشمیری گیٹ ..... اپنے گھر جانے لگے تو صولت صاحب نے اُن سے کہا کہ دیکھو لوک ناتھ جی روپیہ جس قدر تم کھو گے آئے گا مگر اس کے تین حصے کرتے ہوں گے۔ ایک حصہ تمہارا دوسرا میرے بیٹے سُرور کا اور تیسرا حصہ راہِ خدا میں خیرات کرنا ہو گا۔

میرے بہنوئی یہ بات سُن کر کہنے لگے اچھا میاں جی آپ کے فرمان کا مَیں کل سوچ کر جواب دوں گا۔ مَیں نے رات کو صولت صاحب سے کہا کہ آپ نے اس سلسلے میں میرا ذکر کیوں کر دیا۔ فرمانے لگے تمہیں دکھلانے کے لیے کہ تمہارا بہنوئی تمہارے حصہ پر ہی اعتراض کرے گا۔ مَیں چُپ ہو رہا دوسرے دن شام کو میرے بہنوئی اپنے دفتر تیس ہزاری سے سیدھے ہمارے ہاں تشریف لائے۔ اور صولت صاحب کو اشارے سے باہر لے گئے تقریباً رات کے ۹ بجے صولت صاحب واپس آئے مگر میرے بہنوئی ساتھ نہیں تھے۔ صولت صاحب قہقہے لگاتے ہوئے فرمانے لگے سُرور بیٹا مَیں نہ کہتا تھا کہ تمہارا بہنوئی تمہارے حصے پر مخالفت کرے گا اور وہی ہُوا۔ اُس نے کہا ہے کہ بابا جی جس قدر روپیہ آئے تیسرا حصہ ہم خدا کے نام پر دے دیا کریں گے اور باقی ہم سب رکھیں گے ہاں اگر آپ چاہیں تو دوسرا حصہ لے لیجیے مگر دوسرا حصہ سُرور صاحب کو کس بات کا دیں۔ بات رشتہ داری کے علاوہ اصول کی بھی تھی کہ آخر مجھے دوسرا حصہ کیوں دیا جائے مَیں اس معاملہ میں سنجیدہ رہا اور رات کو بات چیت میں قبلہ سے گزارش کی کہ آپ ان کا کام کر دیجیے میری فکر چھوڑیئے مگر مسٹری لوک ناتھ کے اس بیگانہ پن سے صولت صاحب اِس قدر ناخوش تھے کہ جس کا اظہار اُن کی زبان سے نادانستہ طور پر کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا تھا۔

قریباً ایک ماہ صولت صاحب میرے یہاں اس بار رہے۔ روزانہ میری بیوی انھیں بتاتی کہ بابا آج ستیا کے ہاں اتنی عورتیں آئی ہوئی تھیں، آج اتنا ہجوم تھا اور وہ سب کو بتا رہی تھی تمہارا کام ہو جائے گا، تمہارا نہیں ہو گا تم ایسا ایسا کرو۔ تم ایسا نہ کرو غرضیکہ وہ پیرنی بنی ہوئی ہے اور عورتیں، مرد جوق در جوق اُسے دیکھنے آ رہے ہیں۔ خصوصاً عورتیں تو اُسے نہ معلوم کیا سمجھتی ہیں۔ اُس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتی ہیں سجدے کرتی ہیں۔ یہ باتیں سُن کر میاں جی کی آنکھیں سُرخ ہو جاتیں اور وہ خاموش ہو جاتے۔

دو سو انسٹھ

ایک دن فرمانے لگے بیٹا کسی سے موٹر منگاؤ۔ آج قطب صاحب، حضرت نظام الدین صاحب اور دوسری درگاہوں پر چلیں گے۔ عرض کیا کہ ٹیکسی تو ہر وقت مل سکتی ہے کسی سے موٹر مانگنے کی کیا ضرورت ہے قہقہے لگا کر فرمانے لگے ارے اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں تھا میں سمجھا کر ٹونک میں بیٹھا ہوں وہاں تو نواب صاحب کا موٹر آ ہی جاتا تھا۔ طے پایا کہ شام کے چار بجے دریا گنج سے روانہ ہوں گے اور شام کے ساڑھے سات بجے تک واپس آ جائیں گے۔
ان دنوں ٹیکسی کا کرایہ آٹھ آنے فی میل تھا۔ قطب صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء امیر خسرو وغیرہ کے مزاروں پر حاضری دے کر واپس دریا گنج آ رہے تھے کہ صولت صاحب فرمانے لگے۔ ستیا کے گھر چلنا چنانچہ ٹیکسی کشمیری گیٹ حسن بلڈنگ کے پاس پہنچی ٹیکسی والے کا حساب کر کے اُسے رخصت کیا گیا اور ہم دونوں شری لوک ناتھ کے گھر گئے۔ ستیا نے چائے بنائی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ صولت صاحب نے لوک ناتھ سے کہا کہ میاں ایک بوتل تو لاؤ۔ لوک ناتھ اندر سے ایک بوتل اٹھا لائے۔ فرمایا کہ اِسے اچھی طرح دھو کر لاؤ اور وہاں رکھ دو نصف گھنٹہ تک صولت صاحب باتیں بھی کرتے رہے اور گاہے گاہے اس بوتل کی طرف بھی دیکھتے رہے۔ معاً اٹھے اور بوتل اٹھا کر اُس کے منہ میں اپنی انگلی دے کر فرمانے لگے چلو سرور صاحب گھر چلیں۔ کشمیری گیٹ تک لوک ناتھ چھوڑنے آئے وہاں سے ہم نے اسکوٹر لیا اور دریا گنج کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں فرمانے لگے سرور صاحب کہیں سے بوتل کا کاگ لاؤ میری تو انگلی درد کرنے لگی ہے۔ پٹرول پمپ پر اسکوٹر ٹھہرا کر کے پٹرول دینے والے سے بوتل کا کاگ لے کر صولت صاحب کو دیا جو انھوں نے بوتل کے منہ سے اپنی انگلی نکال کر لگا دیا۔ سو ٹیوان گھر پہنچے تو بجلی کی روشنی میں مجھے بوتل دکھا کر کہنے لگے کہ دیکھو اس میں کیا ہے۔ میں نے بوتل کو غور سے دیکھا تو اس میں دھواں سا نظر آیا۔ میں نے عرض کیا اس میں کیا ہے۔ قہقہے لگاتے ہوئے فرمانے لگے تمہاری بہن کے سر پر مُبانی تھا اُس کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔ اب تمہاری بہن کے سر پر کوئی روح وغیرہ نہیں ہے اِس بوتل کو حفاظت سے الماری میں رکھ دو۔ رات کو میں اس شریف روح سے پوچھ لوں گا۔ کہ اگر وہ تمہاری بہن کا پیچھا چھوڑ دے تو اُسے آزاد کر دیا جائے گا ورنہ اس کو زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔
بوتل کو الماری میں رکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے تو صولت صاحب فرمانے لگے۔ بیٹا میرے ہوتے ہوئے تمہیں ایسی چیزوں سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوں گا تو اگر خبیث بھی سامنے آ جائے گا تو خدا اور اس کے رسول کے حکم سے وہ بھی چپ چاپ چلا جائے گا۔ صبح ہوئی تو دیکھا میاں نماز پڑھ کے واپس نہیں آئے تھے۔ معمول سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا تو میں خود مسجد میں چلا گیا میاں وہاں موجود نہیں تھے۔ ایک گھنٹے بعد تشریف لائے تو دریافت کرنے پر فرمانے لگے جامع مسجد چلا گیا تھا وہاں سے آس پاس کے مزارات پر چلا گیا مجھے تو جاننے کی جلدی تھی کہ رات کو بوتل میں بند حضرت سے کیا فیصلہ ہوا۔ فرمانے لگے وہ اپنے آپ آ کر عرض کریں ہم ان سے کیوں پوچھیں قید وہ ہیں ہم نہیں۔ رہائی درکار ہے۔ وہ اپنی غرض سے آئیں، نہیں آتے تو نہ آئیں تم فکر مت کرو بوتل کو الماری میں پڑے رہنے دو۔ دو تین دن گزر گئے میرے دل کا کھٹکا جا نہیں رہا تھا۔ میں ہر روز میاں سے دریافت کروں کہ اُس کا کیا ہوا اور قبلہ قہقہہ لگا کر کہیں کہ ابھی کچھ نہیں ہوا۔ جمعرات کی صبح کو فرمانے لگے کہ آج رات کو اس کا فیصلہ ہو جائے گا یا تو وہ کل ہمارے ساتھ جامع مسجد نماز پڑھنے چلے گا اور یا دریا بُرد کر دیا جائے گا۔ جمعہ کی صبح کو ہی صولت صاحب مسجد سے آ کر فرمانے لگے۔ بیٹا وہ بوتل تو نکالو۔ میں نے الماری کو بوتل رکھنے کے بعد ڈر کے مارے کھولا ہی نہیں تھا۔ اب جو الماری کھولی تو وہ بوتل لڑھکی ہوئی پڑی تھی۔ اُسے ڈرتے ڈرتے اٹھایا تو وہ اتنی وزنی تھی کہ مجھ سے نہ اُٹھ سکی میں حواس باختہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا دیکھا تو میاں قہقہے لگاتے ہوئے الماری کے پاس گئے اور بوتل کو ایسے اٹھا لیا جیسے وہ خالی بوتل ہی ہو۔

مجھے دکھاتے ہوئے فرمانے لگے کہ دیکھو ابھی اس میں اسی طرح وہ دھواں موجود ہے اس نے رات درخواست کی ہے کہ اس کے لیے دُعا کی جائے کہ اسے اللہ میاں معاف کریں اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ اب یہ کسی کو نہ ستائے گا اور نہ ہی تمہاری بہن کے ہاں جائے گا۔ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے صولت صاحب بوتل اپنے ہمراہ لے گئے جب وہ دو بجے واپس آئے تو منشی عتیق اللہ ساتھ تھے فرمانے لگے بیٹا ساتھ مل گیا ہے اب ہم کل ٹونک جائیں گے ہماری تیاری کر دو، مگر بابا اس بوتل کا کیا ہُوا۔ قہقہے لگاتے ہوئے فرمانے لگے اسے ہم نے معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کر دی کہ اسے سکون ملے۔ اب بھی میری بہن اپنا بھرم رکھنے اور اپنی پیری جتانے کے لیے ڈھونگ بنائے ہوئے ہے مگر حقیقتاً اب کوئی بھی رُوح نہ تو اُس کے سر پر ہے اور نہ اُس کے قبضے میں، یہ دوسری بات ہے کہ وہ تمام رشتہ داروں کو اس ڈھونگ کے ذریعے اُلّو بنائے ہوئے ہے۔ ...

اَللّٰہ میاں

کے دو وعدے

راقم الحروف کچھ دنوں سے بسترِ علالت پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمان ہے کہ خوش رہوں —— عیدِ سعید کی مبارک تقریب اور پھر یومِ آزادی —— آئیے آپ کو بھی کچھ خوشگوار اور دل خوش کن واقعات کے قہقہوں میں شریک کروں جن کی دلفریب یاد بسترِ علالت پر بھی زیرِ لب مسکراہٹ پر مجبور کر رہی ہے۔

بائیس تئیس سال ہوئے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر گوڑگاؤں میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ڈسٹرکٹ ریلیف فنڈ کے سلسلے میں انھوں نے ہند و پاک مشاعرہ کا بڑے اہتمام سے انتظام فرمایا۔ لاہور سے جناب قتیل شفائی معہ اپنے صاحبزادے کے تشریف لائے۔ اُن دنوں گوڑگاؤں جانے کے لیے بس کا اڈہ اجمیری گیٹ پر تھا۔ دِلّی کے چند شعراء اور قتیل شفائی وغیرہ گوڑگاؤں جانے کے لیے اجمیری گیٹ بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ اُن دنوں طریقہ یہ تھا کہ بس جب 'بلیک ہول' کے روایتی دِل خراش واقعہ کی طرح ٹھُس جاتی تو ہی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوتی تھی۔ بس چلنے والی تھی کہ باہر سے ایک ریڑھی والے نے آواز لگائی . . . جل جیرا، جل جیرا . . . مٹی کے مٹکے پر سُرخ رنگ کا بھیگا ہوا کپڑا اس پر ہرے پودینے کی گٹھیاں رکھی ہوئی تھیں اور بار بار ریڑھی والا دِل خوش کن انداز میں آواز لگاتا . . . 'جل جیرا، ہاضمے والا، مصالحے والا جل جیرا' . . . اس پر قتیل شفائی کے فرزندِ ارجمند کہنے لگے —— 'ابّو جل جیرا کیا ہوتا ہے۔ بس چل پڑی تھی۔ مرحوم پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے . . . بیٹے میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جل جیرا کیا ہوتا ہے۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مرحوم اختر صاحب فرمانے لگے کہ . . . لاہور میں کسی ہندو رئیس کے ہاں شادی کی دعوت میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبد المجید سالک بھی مدعو تھے۔ خالص ہندوانہ کھانے کے بعد میزبان کی طرف سے بڑے خوبصورت گلاس میں جل جیرا بھی پیش کیا گیا تو مولانا مہر اور سالک کے ساتھ گئے ہوئے ایک بچّے نے پوچھا: ابّو جل جیرا کیا ہوتا ہے، تو مولانا سالک فرمانے لگے . . . پی لے پی لے اے ہندوواں دا سوڈا واٹر اے . . . اب قتیل زادہ بھی جل جیرا کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ اور ہم سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

بس ابھی نئی دہلی اسٹیشن کے پُل پر ہی پہنچی تھی کہ ایک ایسے شاعرِ نامدار کا ذکر آگیا جو اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو پر اپنے آپ کو پوری طرح مسلّط سمجھتا تھا۔ پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے۔ صاحب کس جاہلِ مطلق کا نام لے رہے ہو۔ گلزار دہلوی کہنے لگے . . . پنڈت جی اُنھیں جاہلِ مطلق کہہ رہے ہیں آپ —— اس پر پنڈت جی نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا . . . میاں اب اگر اللہ میاں بھی

چاہیں تو ایسا جاہلِ مطلق پیدا نہیں کر سکتے۔ اس پر شعراء کا ٹولا خاص طور پر پنڈت جی کی طرف متوجہ ہُوا اور اکثر نے یک زبان ہو کر کہا کہ پنڈت جی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ میاں بھی ایسا جاہل پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ تو قادرِ مطلق ہے جو چاہے کر سکتا ہے ـــــــ پنڈت جی نے سنجیدہ ہو کر فرمایا کہ ۔ ۔ ۔ اللہ میاں آپ کی طرح تھوڑے ہیں جو وعدہ کر کے مُکر جائیں گے۔ مُضطر صاحب فرمانے لگے ۔ ۔ ۔ پنڈت جی آپ کیا فرما رہے ہیں ـــــــ پنڈت جی بے ساختہ فرمانے لگے ۔ ۔ ۔ اوئے اللہ میاں نے پہلا وعدہ ایہہ کیتا ہویا اے کہ محمدؐ کے بعد نبی نہیں پیدا کروں گا اور دوسرا وعدہ ایہہ کیتا ہو یا اے کہ اس ۔ ۔ ۔ کے بعد جاہل پیدا نہیں کروں گا ـــــــ بس پھر کیا تھا قہقہے تھے کہ ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ ع۔ بز وارثی، مضطر صاحب، گلزار صاحب، قتیل شفائی اور دوسرے حضرات ہنستے ہنستے اپنی سیٹوں پر لڑھکنے لگے۔ اور تو اور بس کا ڈرائیور سٹرینگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ پنڈت جی نے جب ڈرائیور کی اس بے داد کو دیکھا تو کہنے لگے ۔ ۔ ۔ سردار جی گڈی ال خیال کر و کدے اللہ میاں نوں تو ہاڈے لئی بھی تیسرا وعدہ نہ کرنا پوے ۔ ۔ ۔ پھر قہقہوں کا ایک سیلاب تھا کہ دھولا کنواں پر جا کر تھما ـــــــ

پاکستانی دانشوروں کا ایک وفد نئی دہلی آیا تو اس میں مولانا عبدالمجید سالک بھی تھے۔ سالک صاحب کا قیام کارونیشن ہوٹل فتحپوری چاندنی چوک میں تھا۔ راقم الحروف، جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی اور پنڈت ہری چند اختر مولانا سالک کے ہاں ہوٹل میں حاضر ہوئے تو ہوٹل کے ملازم سے خوشتر گرامی نے دریافت فرمایا کہ تمھارے یہاں گوشت جھٹکے کا پکتا ہے یا حلال کا۔ ملازم نے چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ان کے یہاں حلال گوشت ہی پکتا ہے اور فلاں مسلمان قصائی کے یہاں سے آتا ہے وغیرہ وغیرہ ـــــــ اس پر پنڈت ہری چند بڑی سادگی سے فرمانے لگے ۔ ۔ ۔ ہاں بھائی ہاں یہ پتہ چل گیا کہ تم سب "حلال خور" ہو۔ "حلال خور" کے اس برمحل استعمال سے مولانا سالک اور وہ حضرات جو اس لطیف چوٹ کا مطلب سمجھتے تھے، نے خوب خوب مزہ لیا اور جو حضرات "حلال خور" کے معنی سے ہی ناواقف تھے وہ ہمارے قہقہوں پر حیران تھے۔

محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ جنرل سکریٹری ترقی اُردو (دہلی) کے ہاں علی منزل میں ایک شعری نشست میں مرحوم حضرت نوح ناروی غزل سُنا رہے تھے۔ ردیف تھی "کیا کیا"، نوح صاحب نے اپنی مخصوص تحت اللفظ طرزِ ادا میں جب یہ مصرع پڑھا:

یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجہ

تو پنڈت ہری چند اختر بے ساختہ کہہ اُٹھے:

قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا

سامعین تو کیا خود حضرتِ نوح کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ حالانکہ ہنسی اور حضرتِ نوح میں اینٹ اور کتے والا بیر تھا۔

چیمسفورڈ کلب، نئی دہلی میں مشاعرہ تھا۔ شعراء کا طائفہ شراب نوشی میں مصروف تھا کہ قریب سے جناب دیویندر ستیارتھی (جو اُن دنوں ہندی "آجکل" کے ایڈیٹر تھے) گزرے تو ان کی

ہیبت کذائی دیکھتے ہوئے جناب شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر فرمانے لگے . . . سرور صاحب ان کا منہ کس طرف ہے، شنکر پرشاد صاحب کے اس فرمان پر شعراء نے ایسے قہقہے لگائے کہ ان کا نشہ دوگنا ہوگیا (یاد رہے کہ دیویندر ستیارتھی کی جٹائیں اور دراز ریش اس قدر بے ترتیبی سے ان کے سر، گردن اور منہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں کہ واقعی ان کے منہ کو تلاش کرنا کارے دارد والا معاملہ تھا)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ ان کی عدالت میں ایک چوری کا ایک ایسا مقدمہ آیا جس میں ایک شاعر فکر ندوی (اُن دنوں ان کا یہی تخلص تھا) ماخوذ تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایسا شاعروں کا عاشق یہ کیسے گوارہ کر سکتا تھا کہ ایک شاعر چوری کے جرم میں سزایاب ہو۔ سحر صاحب پولیس انسپکٹر سے کہنے لگے کہ . . . دیکھیے صاحب میں یہ تو مان سکتا ہوں کہ کوئی شاعر دوسرے کسی شاعر کے اشعار چرا کر اپنے نام سے پڑھتا پھرے، مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ شاعر واقعی چوری کر سکتا ہے، اس لیے اس مجرم کی ہتھکڑی کھول دو اور ہم اس کا امتحان لیتے ہیں، اگر واقعی اس نے طرح مصرع پر شعر کہہ دیے تو یہ بے قصور ہے ورنہ اس پر باقاعدہ مقدمہ چلے گا ——— فکر ندوی صاحب کی ہتھکڑی کھول دی گئی اور کنور صاحب نے ایک مصرع دیا کہ اس پر شعر کہو۔ فکر صاحب کی قسمت یاوری کر گئی اور انھوں نے جلدی جلدی دو چار اشعار کہہ کر عدالت کے سامنے رکھ دیے۔ کنور صاحب نے اشعار پڑھے اور فرمانے لگے . . . چپراسی انھیں ریٹائرنگ روم میں بٹھاؤ اور چائے پیش کرو۔ اور پولیس انسپکٹر بیچارا کہتا رہا کہ جرم ثابت ہے۔ گواہ موجود ہیں۔ مال مسروقہ برآمد ہے۔ مگر کنور صاحب فرمانے لگے، مجسٹریٹ ہم ہیں آپ نہیں۔ ہم انھیں بری کرتے ہیں۔

احمد آباد میں مشاعرہ ہو رہا تھا، ڈائس پر شعرائے کرام جلوہ افروز تھے۔ آنجہانی سردار بیگم اختر انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں، گلے میں جڑاؤ ہار اور کانوں میں ہیرے کے ٹاپس پہنے کسی جیولرز کی دوکان کا مجسم اشتہار بنی پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ بمبئی کی شاعرہ بینا رانی ناز کی آنکھوں اور چہرے پر خلافِ توقع منقوی حسن جھلک نظر آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد اناؤنسر نے بڑے زوروں سے سردار بیگم اختر صاحبہ کا تعارف کرانے کے بعد ان سے کلامِ بلاغت نظام فصاحت التیام (حالانکہ یہ کلام مانگے کا اُجالا ہی ہوتا تھا) سنانے کی گزارش کی۔ اختر صاحبہ بڑے طمطراق سے اور اندازِ معشوقانہ سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر مائیک کی طرف جانے لگیں تو بینا رانی ناز نے سردار بیگم اختر کی ساڑھے تین فٹ لمبی چوٹی پر دانستہ طور پر (مگر بظاہر نادانستہ) پاؤں رکھ دیا۔ اختر صاحبہ خدا کے فضل سے کافی جسیم تھیں۔ جھٹکے سے جو اٹھیں تو یہ ساڑھے تین فٹ لمبی مگر معطر نقلی چوٹی بینا ناز کے پاؤں تلے دبی رہ گئی اور اختر صاحبہ بغیر چوٹی کے مائیک پر گئیں تو ڈائس پر بیٹھے شعرا اور سامعین کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا اور بیچاری اختر صاحبہ بجلی کی سی تیزی سے نقلی چوٹی اُٹھائے اسٹیج کے پیچھے پردے کے اوٹ چلی گئیں۔ ہنسی کا یہ عالم تھا کہ سامعین کو مشاعرہ سننے کے موڈ میں لانے کے لیے بے چارے اناؤنسر کو نصف گھنٹہ تک لگ گیا۔

ے جمال بھارتی۔

مولانا انور صابری کی عادت ہے کہ یہ جب کسی مشاعرہ میں تشریف فرما ہوتے ہیں تو سامعین میں سے کسی ایسی معزز ہستی کو نظروں ہی نظروں میں انتخاب کر لیتے ہیں جو مقبولِ عام ہو اور ان کا سیاسی کیریکٹر بھی ہو۔ پھر یہ اشعار سُناتے اس ہستی سے فرمانے لگتے ہیں۔ ہائے بھائی . . . جب ہم آپ انگریز کی جیل میں تھے اور جو اذیتیں ہم آپ نے برداشت کی ہیں۔ یہ لوگ کیا جانیں۔ حالانکہ نہ تو مولانا انور صابری کبھی سیاسی طور پر جیل گئے اور نہ ہی عام طور پر ان کے مخاطب اس اعزاز سے سرفرازی حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر عوام پر یہ تصور قائم کر دیتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جیل یاترا بھی کی ہے اور ان کا مخاطب مُفت میں ملے اس اعزاز پر خاموش رہنا ہی پسند کرتا ہے۔

جناب عالم فتحپوری نے آگرے میں ایک بہت اچھا کُل ہند مشاعرہ کرایا۔ مرحوم بخشی غلام محمد چیف منسٹر کشمیر مشاعرہ کے صدر تھے۔ انور صابری نے حسبِ عادت بخشی صاحب کو اپنا نشانہ بناتے ہوئے فرمایا: ہائے بخشی صاحب وہ زمانہ تو آپ کو یاد ہو گا جب جنگِ آزادی میں مَیں اور آپ جیل میں تھے۔ بخشی غلام محمد بڑے زیرک اور حاضر جواب تھے فوراً فرمانے لگے . . . حضرات یہ تو ممکن ہے کہ میں اور مولانا انور صاحب دونوں جیل میں رہے ہوں مگر یہ ملحوظ رکھیے کہ ہمارے جرائم کی نوعیت میں فرق تھا۔ جرائم کی نوعیت میں فرق نے مولانا کے 'خوش ذوق' ہونے پر جو چوٹ کی اس سے ہزارہا سامعین نے جو لطف اُٹھایا، اس کی نشاندہی قہقہوں کا مسلسل سیلاب کر رہا تھا۔

"لکھنا مشکل کام ہو یا نہ ہو لیکن اپنے بارے میں۔ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے کم سے کم میرے لیے تو ہے۔ سچ لکھوں گا تو میری ساری برائیاں آپ کو پتا چل جائیں گی اور اپنی تعریف لکھوں تو جھوٹ پکڑا جائے گا۔ کیا کروں، کیا نہ کروں —— سمجھ میں نہیں آتا لیکن لکھنا تو پڑے گا ہی۔"

—— جاوید اختر

بحوالہ "آپ بیتی نمبر"
فن و شخصیت، بمبئی

یا اللہ خیر

اے روشنیِ طبع

تو برمن بلا شدی

گزشتہ پچپن سالوں میں مطالعہ کے دوران اکثر دلچسپ اور دل و دماغ کو جھنجھوڑنے والی تحریریں نظر سے گزریں۔ ان "حاصلِ مطالعہ" شہ پاروں میں سے چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

——— سرور تونسوی

عزت کی روٹی

ایک فلم ساز اپنے دو نائبوں کے ساتھ اُس بازار کے ایک کوٹھے پر جا نکلا۔ تین بہنیں تھیں۔ تین نقش تیکھے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ فلم ساز نے بائیوں کے والد سے کہا:

"مجھے اپنی نئی فلم کے لیے ایک ہیروئن اور دو سائڈ ہیروئن کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں بہنیں اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ بہترین اداکارہ بن سکیں۔ انھیں کل صبح اسٹوڈیو میں لے آیئے۔ اتنے ہزار روپے میں کنٹریکٹ ہو جائے گا۔"

بڈھے کنجر نے پہلے فلم ساز کا جائزہ لیا، پھر اس کے ساتھیوں پر پھیلتی ہوئی نظر ڈالی۔ آخر میں اپنی بیٹیوں کے چہرے سے کچھ سمیٹتے ہوئے کہا۔۔۔ "شیخ صاحب، آپ کا شکریہ۔ اس کنجر خانے میں کیا پڑا ہے۔ اللہ ہمیں عزت کی روٹی دے رہا ہے۔ بڑے آرام سے گزر بسر ہو رہی ہے۔۔۔"

قیامت کی نشانیاں

ٹیڈی بوائز دو دہیل گائے کی طرح آہستہ خرام بلکہ مخرام کے انداز میں شاہی محلہ (لاہور کا کنجر بازار) کی پیچ و خم کھاتی ہوئی گلیوں کو لتاڑتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ ایک مکیائی نے دوسری مکیائی سے کہا:

"ان کے ہوتے ہوئے گامک کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ اب تو دن دن مندا ہی رہے گا۔"

دوسری نے پہلی سے کہا:
"تو پھر ہمیں یہ ڈربے خالی کر دینے چاہئیں۔ پانچ روپیہ روز کرایہ ہے، یہ کہاں سے نکلے گا . . .
کھائیں کہاں سے اور پہنیں کیا؟"
"قیامت کی یہی نشانیاں ہیں۔"

مولانا نہیں بائی

یاد نہیں آرہا کلکتہ کا واقعہ ہے یا دہلی کا یا حیدرآباد کا۔ مولانا حالی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے ہاں تشریف لے گئے ——— سلیم وہ مکان چھوڑ چکے تھے، اور اب وہاں ایک مغنیہ طوائف رہ رہی تھی۔ حالی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو بڑی طویل دستک کے بعد اندر سے ایک فربہ تن و توش کی کالی کلوٹی نائکہ نکلی، دیکھا کہ بہ ایں ریش دراز حضرت مولانا ہیں۔ کہنے لگی . . . کیا چاہتے ہو؟ مولانا حالی نے کہا . . . مولانا وحیدالدین سے ملنا ہے . . .!"
نائکہ نے کریہہ ہنسی کے ساتھ کواڑ بند کر لیے اور کہا . . . "جائیے یہاں کوئی مولانا اولانا نہیں رہتے، یہ منی جان کا مکان ہے۔ آپ کہاں صبح سویرے چلے آئے۔ اللہ خیر کرے۔ دن چڑھے کیا شکل نظر پڑی ہے۔

اوپن ائیر میں

اوپن ایئر تھیٹر میں اس بازار کی تین نامور رحمان صاحبائیں، ایک سابقہ وزیر کی داشتہ، دوسری ریلوے کے بہت بڑے ریٹائرڈ آفیسر کی رکھیل، اور تیسری ایک سیاسی لیڈر کی ممنوعہ، موسیقی کی ایک رات کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ اخبار نویس اور موخرالذکر میں جو گفتگو ہوئی مندرج ذیل ہے:

اخبار نویس : السلام علیکم
رحمان صاحبہ : وعلیکم السلام
اخبار نویس : آپ بھی اس تماشے کو دیکھنے آئی ہیں؟
رحمان صاحبہ : جی ہاں! تماشہ دیکھنے ہی کی چیز ہوتی ہے
اخبار نویس : کہیئے آپ کا کیا خیال ہے؟
رحمان صاحبہ : کس بارے میں؟
اخبار نویس : اس تماشے کے بارے میں۔
رحمان صاحبہ : یہاں ہو رہا ہے اور خوب ہے۔
اخبار نویس : مطلب؟
رحمان صاحبہ : (مسکرا کر) مطلب وطلب کچھ نہیں۔ ہمارے یہاں یہی چیز عیاشی سمجھی جاتی ہے اور گناہ

کہلاتی ہے۔ اب چونکہ یہاں ہے لہٰذا آرٹ ہے "فن ہے" عورت یہ بھی ہے مگر یہاں بیٹی ہے اور ہمارے یہاں "بائی" بن جاتی ہے۔

اخبار نویس : جی ہاں، یہ شریف زادیوں کا رقص ہے۔
رقاصہ : شریف زادیوں؟ (طنز کے ساتھ) اور ہم کنچن زادیاں ہیں؟
اخبار نویس : افسوس ہے کہ ع
کتنا غلط یہ حرف تھا مشہور ہو گیا
رقاصہ : جی کنچن کوئی ذات نہیں؟ بہ قولِ وارث شاہ : کنجرا وہ جو غیر توں باہر ہووے (ترجمہ: جو غیرت سے خالی ہو وہ کنچن ہوتا ہے)
اخبار نویس : بالکل ٹھیک۔
رقاصہ : ہم تو بالاخانوں کے کواڑ بند کر کے ناچتی ہیں، لیکن یہ تو "اوپن ایئر" میں کولھے مٹکاتی، بھاؤ بتاتی اور بول اُٹھاتی ہیں اور فن کارہ ہیں۔

دوزخ و جنّت

ایک بائی اپنے آشنا اور اس کے دوستوں کی محفل میں زاویئے بدل بدل کر ناچ رہی تھی، معاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا آشنا توجہ نہیں کر رہا بلکہ کسی اور خیال میں گم ہے۔ بائی نے مخاطب ہو کر کہا:
"کس خیال میں گم ہیں آپ؟"
"یوں ہی سوچ رہا ہوں۔"
"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"
"سوچ یہ رہا ہوں کہ تم ایسی پیکرِ حسن و جمال کو محض آواز و جسم کی فروخت کے جرم میں قیامت کے روز دوزخ میں ڈالا جائے گا۔"
"آپ فکر نہ کریں . . ." بائی نے اپنے آشنا سے مخاطب ہو کر کہا جو قرآن مجید کا بہت بڑا پبلشر تھا، اگر قرآن فروش جنّت میں چلے جائیں گے، تو ——— جسم یا آواز فروش بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ انشاء اللہ ——— آپ سے دوزخ یا جنّت دونوں جگہ ملاقات ہوگی۔"

غرورِ نسب

ایک بائی کے ہاں چند نوجوان کسی قومی مقصد کے لیے چندہ لینے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ بائی نے نوجوانوں کی بات سن کر پچاس روپے لکھوا دیے۔ نوجوان نے رسید کاٹ کر حوالے کی۔ بائی نے کہا . . . صبح آکر روپے لے جائیے گا۔ نوجوان مُنہ تکنے لگا۔ بائی نے کہا، گھبرائیے نہیں، یہ رقم آپ کو مل جائے گی۔ ہم خاندانی کنجر ہیں، بازاری لوفر نہیں، وعدہ کیا اور مُکر گئے۔

یا اللہ خیر

بوڑھے اُستاد نے بائی کی بیٹھک پر نظر دوڑائی۔ چاندنی کا فرش بچھا ہُوا تھا۔ گلدان طاق پر رکھے تھے۔ گاؤ تکیے دیوانوں سے آنکھ مچولی کر رہے تھے اور پیک دان بائی کی آمد کا منتظر تھا . . .
اُستاد نے طبلہ پر تھاپ کا رُخ سنوارتے ہوئے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے اور دُعا کی : یا الٰہ العالمین!
کسی نیک کے ماتھے لگانا اور نیک سے رزق دلوانا ——— یا اللہ خیر!

میں اس سلسلے میں ہمیشہ محتاط رہتا
ہوں کہ لکھتے وقت رعایت کرنا گناہ ہے
اور زبانی طور پر جاہل مطلق کی بھی دل شکنی
نہیں کرتا۔

—— سرور تونسوی
(اسی کتاب میں سے)

جناب دھرم پال گپتا وفا ایڈیٹر ہفت روزہ تیج، ان بیگم صاحبہ کے ہاں آنے والوں میں حاضر باش قسم کے ذہنی طور پر عشقیہ مریضوں میں سے تھے۔ وفا صاحب اپنے جلو میں فتح چند نسیم اور اسی قسم کے دو چار دیگر حواری ٹائپ کے جی حضوریوں کو بھی لیے رہتے تھے تاکہ بیگم صاحبہ کے ہاں کچھ دیر شعر و شاعری کی آڑ میں اپنے ذوقِ جمال کو دہلوی شرافت کے دائرہ میں تسکین پہنچا سکیں۔ جناب گوپال متل نے اپنی مشہور تصنیف 'لاہور کا جو ذکر کیا' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ۔ ۔ ۔ لاہور کی ایک گانے والی طوائف نے اپنے ہاں آنے والے حضرات میں سے ایک مشہور، متین اور شریف شاعر کے بارے میں کہا تھا کہ یہ صاحب تحریک کا جذبہ تو ہمارے ہاں سے لیتے ہیں اور اس پر عمل گھر جا کر کرتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت جنابِ وفا کی تھی۔

بیگم صاحبہ اب ایک، دو سے محلے میں مکان تبدیل کر آئی تھیں اور اس محلے کے مسلمان پرانی دہلوی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے۔ اس زمانے میں متوسط درجے کی مسلمان عورتوں میں ساڑھی باندھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب جو اس محلے والوں نے ایک مسلمان نوجوان اور اس پر آفتِ جان چلتی پھرتی قیامت کو بغیر برقعہ کے ساڑھی میں ملبوس آتے جاتے دیکھا اور اس پر طرّہ یہ کہ اکثر و بیشتر شوائے کرام کوئی گاندھی ٹوپی سر پر رکھے، کوئی شیروانی میں بنا سنورا، کوئی نفیس سوٹ پہنے تو کوئی شرعی پاجامہ کے باعث ٹخنے دکھاتا اس نو وارد خاتون کے مکان پر تانتا باندھ کر آنے لگے تو محلے والوں نے ان صاحبہ کے بارے میں اِدھر اُدھر سے دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اتفاقاً راقم الحروف کا مکان بھی اسی محلے میں تھا۔ ایک دو بار مجھے ان محترمہ کے ہاں آتے جاتے دیکھ کر محلے کے کچھ بڑے بوڑھوں (جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے) نے ان صاحبہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھیں سمجھایا گیا۔ آپ ایک مشہور شاعرہ ہیں، الیکشن کے جلسوں میں اچھی تقریریں کر سکتی ہیں۔ اس لیے برقعہ وغیرہ سے بے نیاز ہیں اور ان کے ہاں آنے والے حضرات سے آپ قطعاً مطمئن رہیے وہ محلے کی بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ پہلے ہی اپنی ذہنی غلط کاریوں کے باعث محض شعر کہنے تک ہی کی الٹی سیدھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرے سمجھانے پر محلے کے مسلمانوں کی بے چینی کسی حد تک کم ہو گئی۔ مگر یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ اور باغ چھ ماہ تک ان صاحبہ سے میری ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ ۱۹۵۴ء کی ایک دوپہر کو میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ فلاں بیگم صاحبہ نے آپ کو دریا گنج کے تھانہ میں بلایا ہے۔ کچھ کریدنے پر پتہ چلا کہ محلے کے باشندگان نے بیگم صاحبہ کے بارے میں افسرانِ اعلیٰ کو شکایت کی ہے کہ یہ مسلمان ہو کر ایک خالص مسلمان محلے میں بغیر پردہ کے رہتی ہیں جس سے ہماری بہو بیٹیوں میں برقعہ سے نجات حاصل کرنے کے جراثیم پھیل رہے ہیں اور ان صاحبہ کے ہاں

آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دراصل ان صاحبہ کے مالک مکان مرحوم سردار پٹیل کی وزارت میں انڈر سیکریٹری تھے اور وہ ان سے مکان خالی کرانا چاہتے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے محلے والوں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہا تھا کیونکہ یہ مالک مکان ہوم منسٹری میں تھے اس لیے پولیس کی مدد بھی انھیں آسانی سے حاصل ہونے کی راہیں موجود تھیں۔ لہٰذا ان کی ایجنٹ پر محلے والوں کی درخواست پر افسرانِ اعلیٰ نے ایک ڈی ایس پی کو یہ معاملہ سپرد کر دیا کہ وہ تحقیقات کے اصل معاملے کا پتہ لگائے۔ لہٰذا یہ ڈی، ایس، پی تھانہ دریا گنج میں تحقیقات کے لیے آئے ہوئے تھے۔

معاملے کی نوعیت کا اچھی طرح سے پتہ چلنے کے بعد میں تھانہ دریا گنج پر پہنچا تو میرے محلے کے سب ہندو مسلمان بڑے بوڑھے لمبی لمبی داڑھیوں سمیت خاصی تعداد میں موجود تھے اور ایک کرسی پر یہ محترمہ تشریف فرما تھیں۔ جس پر تعجب ہوا بقول :

مرے ساتھ جو ڈوبنا چاہتے تھے
کنارے سے ہی کر گئے وہ کنارا

لیکن ان صاحبہ کے سینکڑوں مفروضہ اور ذہنی عاشقوں اور ہمدردوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈی، ایس، پی صاحب سے میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ کہنے لگے کہ یہ سب حضرات ان صاحبہ کے خلاف دی گئی درخواست کے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ صاحبہ کہتی ہیں کہ میں اس محلے میں صرف ایک ہی شخص کو جانتی ہوں اور وہ ہیں آپ۔ لہٰذا آپ ہی ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ ڈی، ایس، پی کی گفتگو خلافِ توقع پولیس کی مخصوص زبان کی بجائے قدرے ادیبانہ بلکہ شاعرانہ قسم کی محسوس ہوئی تو میں نے اپنے محلے والوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ جب اُن میں بابو عیوض علی (مرحوم) اور دیناجاٹ چودھری کو دیکھا تو احتراماً اُن سے علیک سلیک کے بعد میں نے ڈی ایس پی صاحب سے کہا کہ میں اس سلسلے میں طرفین کی غیر موجودگی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس پر اُنھوں نے سب حضرات سے کہا کہ آپ لوگ باہر چلے جائیں۔ جب کمرہ خالی ہوا تو میں نے ڈی، ایس پی کو بتایا کہ اس عورت کا صرف تصور یہ ہے کہ ؎

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

یہ عورت وطن پرست ہے۔ خوش مزاج اور خوش ذوق ہے۔ سوشل تعلقات بہت زیادہ رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے شاعرہ ہے اور شاعروں، ادیبوں نیز صحافیوں کی خاصی تعداد محض مفت کی چائے پینے اور اس کی خوبصورتی سے آنکھیں سینکنے کے لیے اس کے ہاں آتی جاتی ہے جیسے محلے والے جو قدامت پسند ہیں ان باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور مالک مکان محض اس وجہ سے کہ وہ سردار پٹیل کی ہوم منسٹری میں ایک انڈر سیکریٹری ہیں۔ اس لیے انھوں نے محلے والوں کو بہکا کر اس قسم کی درخواستیں دلوائی ہیں۔ کیونکہ اُسے یہ یقین ہے کہ ہوم منسٹری میں ہونے کے باعث مقامی پولیس اس کی ناجائز طور پر مدد کرے گی۔

ڈی، ایس، پی انگریزی حکومت کا بنایا ہوا ڈی، ایس، پی تھا۔ اس لیے وہ سارے معاملے کو میرے ان چند الفاظ کو سننے کے بعد سمجھ گیا اور انھوں نے محلے والوں سے کہا کہ آپ صاحبان چلیے میں ابھی موقع دیکھنے آ رہا ہوں۔ اصل معاملہ ڈی، ایس، پی جان ہی چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے افسرانِ بالا کو اصل حالات سے آگاہ کر دیا اور یہ معاملہ ختم ہونے کے بعد ذہنی مریضوں کی آمد و رفت پھر شروع ہو گئی۔

بہ کوئے یار

بہ اندازِ محرمانہ گزر

ودیا پرکاش سرور رتونسوی

"مضمون لکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ وہ اتنا سچا
ہو کہ پڑھنے والا اسے جھوٹ ہی جھوٹ جانے!
ایک انداز وہ ہے کہ وہ اتنا جھوٹا ہو کہ پڑھنے والا
اُسے پڑھ ہی نہ سمجھے!
میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میں نہ ایسا سچ
بول سکتا ہوں اور نہ ایسا جھوٹ!"

محمد طفیل

جمالو دور کھڑی

یادش بخیر جناب گوپال متّل صاحب مُدیر ماہنامہ "تحریک" انتہائی سلیقہ مند، اچھے شاعر۔ قابلِ قدر صحافی۔ اُدور کلیور اور امریکن نواز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بامذاق، خوش طبع۔ حاضر جواب اور کسی حد تک "آگ لگا کر جمالو دُور کھڑی" کی صفات کے مالک ہیں۔

جب گوپال متّل صاحب روزنامہ "تیج" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام کرتے تھے تو اُن دنوں آپ کا بیگم صاحبہ کے ہاں آنا جانا تھا۔ گوپال متّل صاحب میں بظاہر کوئی ایسی کشش نہیں کہ کوئی عورت اور پھر بیگم صاحبہ ایسی سیماب صفت خاتون اُن سے عشق کر سکے۔ آج کل تو خدا کی نظرِ کرم اور امریکن نواز ہونے کے باعث گوپال متّل صاحب کی مالی حالت صحافی حلقوں میں قابلِ رشک حد تک ہے مگر اُن دنوں آپ محض زندگی کی گاڑی چلانے تک ہی کما پاتے تھے۔ اور یہ ناممکنات میں سے تھا کہ بیگم صاحبہ ایسی فراخ دل اور فضول خرچ خاتون پر اُن کی مالی آسودگی اثر انداز ہو سکتی کیونکہ اُن کی مہینہ بھر کی تنخواہ کے برابر تو بیگم صاحبہ کے ہاں ایک روز میں ہی اُٹھ جاتا تھا۔ مگر گوپال متّل بھی اہلِ دِل ہیں۔ انھیں بھی کسی سے عشق کرنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ ون وے ٹریفک کے مصداق ہی کیوں نہ ہو۔

گوپال متّل صاحب نے ایک دو ملاقاتوں میں ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ بیگم صاحبہ کو شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کے کلام سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اور بیگم صاحبہ کو اقبالؔ کے سینکڑوں اشعار یاد ہیں۔ بیگم صاحبہ کی اقبالؔ شناسی ہی انھیں ڈاکٹر کاٹجو مرحوم (جو ان دنوں ہوم منسٹر حکومتِ ہند تھے) کے نزدیک سے نزدیک تر لائی۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جامع مسجد کے میدان (جگت ٹاکیز کے سامنے) ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر کاٹجو فرما رہے تھے اور ڈاکٹر کاٹجو کو اقبالؔ کی نظم ع "سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے" بہت پسند تھی۔ منتظمینِ مشاعرہ صدر صاحب کی پسندیدگی اور خوشنودی کے لیے یہ چاہتے تھے کہ مشاعرہ کا آغاز اقبالؔ کی اس نظم سے ہو۔ بیگم صاحبہ شاعرہ کی حیثیت سے اس مشاعرہ میں مدعو تھیں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی موقع شناس نظر (۔) نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ اقبال کی اس نظم سے مشاعرہ کا آغاز فرمائیں۔ بیگم صاحبہ کا ترنم۔ حسن اور اس وقت **چائے کی کیتلی میں** کوکا کولا ملی شراب کے دو چار فنجان پیٹ میں جانے کے باعث ہلکا سا سُرور، موسیقی، حسن اور **شراب کی اس کاکٹیل** نے وہ قیامت ڈھائی کہ ڈاکٹر اقبالؔ کی رُوح بھی جھوم کر رہ گئی ہوگی۔ ڈاکٹر کاٹجو کا یہ حال تھا کہ ہر مصرع پر بہکی بہکی سی ڈھکی ہوئی آنکھوں کو بار بار اُٹھا کر بیگم صاحبہ کو دیکھتے اور زبان سے تو ڈاکٹر اقبال کے کلام کی داد دے رہے تھے۔ مگر آنکھوں اور دل کی گہرائیوں میں بیگم صاحبہ کی تصویر اُتار رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نظم سُنا کر اور ہزارہا دلوں پر بجلی گرا کر مائک سے الگ ہوئیں تو ڈاکٹر کاٹجو نے انھیں اپنے پہلو میں بڑی عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ اور جی بھر کر داد دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر کاٹجو ہوم منسٹری میں اپنے دفتر میں ہوں یا

اپنی رہائش گاہ پر بیگم صاحبہ بلا جھجک اور بغیر وقتِ ملاقات مقرر کیے ڈاکٹر کاٹجو کے ہاں جانے لگیں۔

جب گوپال متل صاحب کو بیگم صاحبہ کی اس اقبال پسندی کا یقین ہوگیا تو انھوں نے ڈاکٹر اقبال کے کلام کو تقریبِ بہرِ ملاقات کا ذریعہ بنا لیا اور بیگم صاحب کے ہاں ان کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ اور یہ سلسلہ قریبًا ایک سال تک رہا۔ اس عرصہ میں گوپال متل صاحب کا یہ "اقبالی" عشق محض بیگم صاحبہ سے اشعار پر بحث۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سُرور تک ہی محدود رہا۔ ان کی بدقسمتی سے اخبار "تیج" کے مالکان میں سے ایک صاحبِ دل مالک جناب دھرم پال گپتا وفا کا بیگم صاحبہ کے ہاں روز کا آنا جانا تھا۔ آندھی یا طوفان ہو، بارش ہو رہی ہو۔ مگر کیا مجال کہ وفا صاحب بیگم صاحبہ کے ہاں عین وقتِ مقررہ پر حاضری نہ دیں۔ مالک اور مُلازم میں رقابت پیدا ہوگئی۔ دھرم پال گپتا وفا کو گوپال متل صاحب کا بیگم صاحبہ کے ہاں آنا جانا دخل در معقولات محسوس ہو رہا تھا۔ اور ویسے بھی وفا صاحب گوپال متل کے مقابلے میں ادبی اور شعری لحاظ سے ایک صفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ اور گوپال متل گھنٹوں کلامِ اقبال پر گفتگو کرتے رہتے۔ اور وفا صاحب اس گفتگو کو محض بکواس سمجھتے تھے اور وہ جس طرح دلی کے شرفا کی طرح خاموش عشق کے خواہاں تھے۔ گوپال متل کی شاعرانہ گفتگو اس میں سدِّ راہ تھی۔ لہٰذا دھرم پال گپتا وفا نے بیگم صاحبہ سے پُرزور استدعا کی کہ کسی طرح گوپال متل صاحب کا اپنے یہاں آنا بند کر دیں۔ ورنہ ان کا دل و دماغ جذبۂ رقابت سے بیکار ہو جائے گا۔

اس پر ایک روز بیگم صاحبہ نے گوپال متل صاحب سے کہا کہ اچھا متل صاحب آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں لیلیٰ اگر مجنوں سے یہی پوچھتی تو مجنوں کا جو حال ہوتا عین وہی حال گوپال متل صاحب کا تھا۔ (تعریفی کلمات پوری طرح زبان ادا نہیں کر پا رہی تھی) ایک تو ویسے ہی متل صاحب قدرے لکنت سے بولتے ہیں اس پر حُسن کی یہ نوازش جس سے متل صاحب کی لکنت اور بھی بڑھ گئی۔ جب متل صاحب لُغات کے تمام تعریفی الفاظ بیگم صاحبہ کی تعریف میں ختم کر چکے تو بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی شاگردہ بن جاؤں کیونکہ کامل قریشی صاحب کی اصلاحیں بے جان ہیں۔ اور مَیں کسی اچھے اُستاد کی تلاش میں تھی آپ سے بہتر اُستاد نہیں مل سکتا لہٰذا میری یہ گزارش قبول فرمائیے اس کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے یہ بھی فرمایا کہ اُستاد اور شاگردہ کے تعلقات باپ بیٹی کے ہوتے ہیں۔ اس لیے آئندہ ہمارے اور آپ کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے۔ بیگم صاحبہ کا یہ کہنا تھا کہ گوپال متل صاحب ایک لمحہ میں ساری شیرینیِ گفتار بھول گئے اور ڈاکٹر اقبال انھیں جگن ناتھ آزاد محسوس ہونے لگے۔ بیگم صاحبہ کے ایک جُملہ نے ہی گوپال متل صاحب کے دِل کے ہزار ٹکڑے کر دیے تھے۔ اور وہ فوری طور پر وہاں سے چلے آئے۔ اور اس کے بعد بیگم صاحبہ کے ہاں نہیں گئے۔

ایک شاعر تھے غالباً اُن کا تخلص جوہر تھا۔ آج کل یہ صاحب گیسو اور داڑھی بڑھائے پیری مریدی کا دھندا نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ تعویذ گنڈے بھی دیتے ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے ہندو تھے بعد میں اسلام قبول کر کے پیری مُریدی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان صاحب کا یہ ایمان تھا کہ بیگم صاحبہ کے ہاں ہر روز گھنٹوں حاضری دیتے دل کی باتیں تو خدا ہی جانتا ہے مگر بظاہر یہ صرف چائے اور کھانے کے لالچ میں ہی آتے تھے اور اُن کا بیگم صاحبہ سے یہ مُطالبہ اکثر رہتا تھا کہ انھیں مشاعرے دلوائے جائیں۔ بیگم صاحبہ کا طُوطی بول رہا تھا کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مشاعرہ نہیں کہلاتا تھا۔ لہٰذا منتظمینِ مشاعرہ کو اُن کا ایک اشارہ ہی جوہر صاحب کی شرکت کے لیے کافی تھا بیگم صاحبہ نے صرف کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کو ہی کہہ کر سینکڑوں مشاعرے جوہر صاحب کو دلوائے ہوں گے۔ ایک دن کسی کام کے باعث ایڈیٹر شانِ ہند بیگم صاحبہ کے ہاں دوپہر کو گیا تو دیکھا کہ جھوٹے برتنوں کا ایک ڈھیر ہے جسے جوہر صاحب

نہایت چابکدستی سے صاف کر رہے ہیں ـــــ بیگم صاحبہ سے راقم الحروف نے اشارے سے جوہر صاحب کے اس فنکارانہ مظاہرے کا سبب پوچھا تو فرمانے لگیں۔ سرور صاحب میرا ملازم کل سے نہیں آیا۔ گھر کی صفائی وغیرہ کرنے والی مائی بھی بیمار ہے۔ دو دنوں سے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ابھی جوہر صاحب آئے تو میں بیٹر کے نشتے میں بھی ان سے کہا کہ مُرغی کے مشاعرے تو روزانہ مانگتے ہو آج ذرا ان برتنوں کو صاف کر دو۔ لہذا انھوں نے سعادتمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اور جس بہتر انداز میں یہ برتن صاف کر رہے ہیں اُس سے میرا دِل خوش ہوا اُٹھا ہے۔ اور میں انھیں آج ہی ایک اچھا مشاعرہ دلواؤں گی جہاں سے انھیں کم از کم ایک سَو روپیہ مل جائے گا (اُن دنوں سو روپیہ کافی اہمیت رکھتا تھا) برتن صاف کرتے ہوئے جوہر صاحب نے جھینپ مٹانے کے لیے کہا۔ سرور صاحب بیگم صاحبہ کے گھر کو میں اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں۔ لہذا اپنے گھر کا کام کرنے میں کیا شرم ہے۔ میں نے دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ خدا آپ کو ایسا ہی سعادت مند اور برخوردار بنائے رکھے۔

بیگم صاحبہ کے ہاں ایک صاحب ثروت صاحب جنھیں بیگم صاحبہ اپنا بہنوئی کہا کرتی تھیں رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کی ایک ملازمہ جو بچپن کے بعد جوانی کی حد میں داخل ہو چکی تھی۔ بڑی طرار اور عشووں اور غمزوں کا مظاہرہ کرتی رہتی تھی ایک دن سُننے میں آیا کہ بیگم صاحبہ اور اُن کے مبینہ بہنوئی کو اس ملازمہ کے اغوا میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ فوری طور پر بیگم صاحبہ اور ان کے بہنوئی کی ضمانت ہو گئی اور مقدمہ عدالت میں آگیا۔ جناب ڈھلوں صاحب ایس۔ ڈی۔ ایم دہلی کے ہاں یہ مقدمہ چل رہا تھا۔ (ڈھلوں صاحب کو بعد میں فیروز پور میں اُن کے لڑکے نے ہی پستول کی گولی سے سوتے میں ہلاک کر دیا تھا) کشمیری گیٹ رٹز سینما کے عقب میں اُن دنوں دلّی کی فوجداری عدالتیں تھیں۔ ہر پیشی پر راقم الحروف عدالت میں مقدمہ کی کارروائی سُننے جاتا۔ اور پیشی کے بعد بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی ان کے دولت کدہ پر جاتا اور مقدمہ کے بارے میں صلاح و مشورہ کیا جاتا۔ ایک شام سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں سردار ڈھلوں ایس ڈی، ایم تشریف لائے۔ سردار صاحب نے پاس بیٹھے دو چار شعراء کو ڈھلوں صاحب سے متعارف کرایا تو ڈھلوں صاحب فرمانے لگے کہ ایک شاعرہ پر مقدمہ تو میری عدالت میں چل رہا ہے۔ ڈھلوں صاحب باتوں باتوں میں کہہ گئے کہ مقدمہ کے سب گواہان استغاثہ نے زخمی بیش کیے ہیں اور کہ مقدمہ میں کوئی جان نہیں ہے۔ چونکہ یہ بات سردار صاحب کے مکان پر ایک ایس، ڈی، ایم کی زبان سے نکلی تھی۔ اب اگر یہ بات باہر جاتی ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس وقت جو حضرات سردار صاحب کے ہاں موجود تھے اُنھوں میں سے کسی نے یہ بات باہر پہنچائی۔ باقی شعراء کو تو اس مقدمہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ البتہ راقم الحروف کو اس معاملہ میں گہری دلچسپی تھی۔ لہذا میں نے یہ بات بیگم صاحبہ کو بھی نہ بتائی کیونکہ اگر انھیں بتا دیا جاتا تو وہ شراب کے نشتے میں کسی وقت بھی یہ راز اُگل دیتیں اور میرا سردار صاحب کے ہاں آنا جانا ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا اور دشمنی مُفت میں ہو جاتی۔ یہ مقدمہ دو سال تک چلتا رہا۔ آخر فیصلے کا دن آ پہنچا۔ مجھے تو یہ معلوم ہی تھا کہ بیگم صاحبہ اور ان کے بہنوئی دونوں باعزت بری ہوں گے۔ لہذا میں نے چاندنی چوک سے گلاب کے پھولوں کے دو ہار خریدے اور انھیں اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اور سیدھا ڈھلوں صاحب کی عدالت میں پہنچا۔ بیگم صاحبہ سراسیگی کے عالم میں تھیں اتنے میں پتہ چلا کہ غازی آباد اور مُراد نگر کے درمیان ایک ہوائی جہاز گر گیا ہے۔ جس کی تفتیش کے لیے ایس، ڈی، ایم صاحب موقع پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ عدالت کے چپراسی سے ریڈر تک کو بیگم صاحبہ نے کرنسی نوٹوں سے خوش کر رکھا تھا۔ ڈرائیور کو بھی پانچ کا نوٹ بیگم صاحبہ نے دیا۔ چند منٹ بعد ڈھلوں صاحب ریڈر اور اسٹینو گرافر کو ہمراہ لیے جائے واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریباً چار بجے ڈھلوں صاحب واپس تشریف لائے۔ اس درمیانی وقت میں بیگم صاحبہ اُن کے بہنوئی وکیل اور

پینتیس

مَیں کارلٹن ہوٹل کشمیری گیٹ میں بیٹھے کھاتے پیتے رہے۔ جوں ہی چپراسی نے ہوٹل میں آکر اطلاع دی کہ صاحب آ گئے ہیں ہم سب فوری طور پر عدالت کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ ڈرائیور نے اتنا بتایا کہ صاحب نے راستہ میں فیصلہ لکھوا دیا ہے۔ اور اسٹینوگرافر اُسے ٹائپ کر رہا ہے۔ بیگم صاحبہ نے تمام انتظامات کر رکھے تھے اگر عدالت نے سزا سُنا دی تو ضمانت کی درخواست دی جا سکے۔ اور اگر عدالت ضمانت نامنظور کر دے تو فوراً ٹیکسی پر وکیل سیشن جج کے ہاں جا کر ضمانت کی درخواست پیش کر سکے۔ مگر یہ سب انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے کیونکہ پانچ بج چکے تھے اور دیگر سب عدالتیں بند ہو رہی تھیں۔ پانچ بج کر پانچ منٹ پر عدالت کے چپراسی نے مُلزمان کے نام پکارے تو بیگم صاحبہ کچھ ورد کرتی ہوئی عدالت میں داخل ہوئیں۔ مَیں بھی عدالت کے کمرہ میں فیصلہ سُننے گیا۔ ڈھلوں صاحب نے بڑے وقار کے ساتھ حُکم سُنایا کہ جائیے آپ دونوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا بیگم صاحبہ نے دُعاؤں کی بھرمار کر دی۔ خدا آپ کو ڈپٹی کمشنر بنا دے یہ کر دے وہ کر دے۔ ڈھلوں صاحب مُسکراتے رہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے بریف کیس سے دو نوں ہار نکالے ایک بیگم صاحبہ کے گلے میں اور دوسرا اُن کے بہنوئی کے گلے میں ڈال دیا۔ ڈھلوں صاحب کرسیٔ عدالت سے اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ اور بیگم صاحبہ نے پرس کھول کر پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی بارش شروع کر دی۔ عدالت کا ہر اہل کار ان نوٹوں کو جھپٹ رہا تھا۔ یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کشمیری گیٹ بس اسٹینڈ پر ایڈیٹر شانِ ہند نے بیگم صاحبہ کو پھر مُبارکباد دیتے ہوئے رخصت چاہی تو بیگم صاحبہ فرمانے لگیں ارے آپ کہاں جا سکتے ہیں سرور صاحب میرے حسن اور جوانی پر لوگوں نے منوں پھول قربان کئے ہوں گے۔ مگر خُدا کی قسم آج عدالت میں آپ کے گلاب کے پھولوں کے ہار نے جو مزا دیا اس ایک ہار پر منوں پھول نچھاور۔ آپ کارلٹن ہوٹل چلیے اور گھر پر فون کر دیجیے کہ آج رات آپ گھر نہیں آئیں گے۔ بلکہ میرے ہاں جشن میں شریک ہوں گے۔ کارلٹن ہوٹل سے بیگم صاحبہ نے وسکی اور بیئر کی بوتلوں سے ٹیکسی کی ڈگی بھروالی۔ اور مجھے اپنے بہنوئی اور وکیل کو ساتھ لے کر اپنے مکان پر آگئیں۔ رات بھر جو جشن منایا گیا اس کی تفصیل پھر کبھی لکھوں گا۔ کس کس شاعر نے کیا کیا حرکتیں کیں آپ پڑھیں گے تو اپنے مُلک گیر شہرت رکھنے والوں شاعروں کی اصلیت سے واقف ہو سکیں گے ——

"میں ماضی کے اُن ہیروں کے غاروں میں
اُتر رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں مٹی کا
ایک دیا ہے جو میں خود ہوں، جو میرا اپنا
وجود ہے جو میری ذات، میری رُوح ہے۔"

— میرزا ادیب

ہجومِ شوق میں ہم

کوئے یار سے گزرے

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کو کسی ریاست کے مہاراجہ نے وسکی سیٹ تحفتاً بھجوایا۔ صراحی اور چھ گلاس اُن پر جو نقاشی کی گئی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سردار صاحب کا کہنا تھا کہ یہ سیٹ مہاراج نے لندن سے پچاس پاؤنڈ میں خریدا تھا۔ سردار صاحب نے وسکی کبھی نہیں پی۔ ہاں برانڈی وہ ضرور پیتے تھے اور وہ بھی "ہنزے تھری اسٹار" نہ معلوم یہ کیسے مشہور ہو گیا تھا کہ سردار صاحب بہت بڑے شرابی تھے۔ حالانکہ انھوں نے کبھی دو چھوٹے پیگ سے زیادہ برانڈی بھی نہیں پی اور نہ ہی انھیں روزانہ کی عادت تھی۔ مولانا عبدالحق ہاپوڑی (انجمن ترقی اُردو والے بابائے اُردو) کے بھائی عادی پینے والے تھے اور جی بھر کر پینے والے تھے۔ سردار صاحب نے ایک دن ہنزے تھری اسٹار کی بوتل منگائی اور اس صراحی میں برانڈی ڈال کر ابھی گلاس میں آدھا پیگ ڈالا ہی تھا کہ مولانا عبدالحق کے بھائی تشریف لے آئے۔ سردار صاحب نے فوراً دوسرا گلاس منگایا اور مولانا کے لیے پورا پیگ بنا کر پیش کیا۔ مولانا کے دوسرے پیگ کے ساتھ سردار صاحب نے بھی چھوٹے پیگ سے ساتھ دیا۔ سردار صاحب تھوڑی دیر کے بعد ایک گھونٹ پیتے اور اتنا ہی پانی گلاس میں ڈالتے جاتے مگر مولانا نے پانچ بڑے پیگ پینے کے بعد صراحی جس میں ابھی نصف بوتل برانڈی موجود تھی اٹھائی اور اپنے تھیلے میں ڈال کر کرسی سے اُٹھے اور فرمانے لگے اچھا سردار صاحب آداب اجازت دیجیے۔ سردار صاحب فرمایا۔ مولانا یہ صراحی تھیلے میں کیوں رکھ لی ہے۔ مولانا نے بڑی معصومیت کے ساتھ فرمایا، سردار جی یہ صراحی آپ کے پاس تو رہے گی نہیں۔ کوئی نہ کوئی اسے لے جائے گا اور جب کسی نے لے ہی جانی ہے تو پھر میں ہی کیوں نہ لے جاؤں۔ سردار صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور فرمانے لگے ٹھہریے چھ گلاس بھی ساتھ لیتے جائیے اور مولانا پورا وسکی سیٹ معہ نصف بوتل برانڈی لیے یہ جا وہ جا۔

سردار صاحب نے ریڈیو کی کیبنٹ ہاتھی دانت کی بنوائی .... جو اتنی خوبصورت تھی کہ بس دیکھتے ہی رہیے محلے کی ایک لڑکی پھولاں جس کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ دس سال ہو گی۔ سردار صاحب کے یہاں اکثر آتی تھی۔ اُس نے جب شام کو ریڈیو دیکھا تو وہ جتنی دیر بیٹھی رہی۔ ریڈیو کو ہی دیکھتی رہی۔ جب یہ لڑکی معمول سے زیادہ وقت بیٹھی رہی تو اُس کی بہن اور بھائی اُسے بار بار بلانے آتے کہ گھر چلو ماں بُلا رہی ہے تو پھولاں یہی کہتی رہی ابھی آتی ہوں اور وہ ٹکٹکی لگائے ریڈیو کو دیکھتی ہی رہی۔ جب گھر والوں نے اُسے بُلانے کا تقاضا زیادہ کر دیا تو سردار صاحب نے کہا کہ پھولاں تو جاتی کیوں نہیں۔ اِس پر وہ بے دِلی سے اٹھی اور کہنے لگی "بھاپا جی تسیں آکھیا سی کہ جدوں تیرا ویاہ ہووے گا تے توں جہڑی چیز منگیں گی او ہو دیاں گا۔" (بھاپا جی آپ نے کہا تھا کہ جب تیری

اُنتالیس

شادی ہوگی تو تو جو چیز بھی مانگے گی وہی لے دوں گا) سردار صاحب نے اپنے وعدے کی حامی بڑے زور دار الفاظ میں بھری تو پھولاں کہنے لگی "تے پھیر مینوں اے ریڈیو دے دیو" (تو پھر مجھے یہ ریڈیو ہی دے دیجیے)۔ سردار صاحب نے اپنے ملازم کو آواز دی اور حکم دیا کہ یہ ریڈیو اُٹھا کر اس لڑکی کے گھر چھوڑ آؤ۔ اور دوسرے دن ریڈیو کا لائسنس بھی پھولاں کے نام ٹرانسفر کرا دیا گیا۔

مضطر ہاشمی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ایک دن شام کے وقت سردار صاحب کے ہاں آئے اور اُن کے کان میں کچھ کہا۔ سردار صاحب نے فرمایا۔ سردار صاحب کمرے میں میری میز پر کیش کا ڈبہ پڑا ہے اُٹھا لائیے (کریم کریکر بسکٹ کا ٹین کا ڈبہ سردار صاحب کا کیش بکس ہوتا تھا) میں نے یہ ڈبہ لا کر دیا تو اس میں سو سو روپے کے تین نوٹ رکھے تھے وہ نکالے اور مضطر ہاشمی کو دے دیے اور وہ فوراً واپس چلے گئے۔ مضطر ہاشمی کے جانے کے بعد سردار صاحب کے بڑے لڑکے بھولی نے کہا کہ کل پرچہ چھپنا ہے کاغذ لینا تھا اور آپ نے روپیہ دے دیا ہے۔ اس پر سردار صاحب نے غضبناک آنکھوں سے بھولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسی تیسی میں گیا پرچہ ایک دوست کی ضرورت تو پوری ہو گئی۔ مگر دوست کی ضرورت پوری کرنے کے باعث اُس ہفتہ ریاست چھپ ہی نہ سکا اور دو ہفتوں کا مشترکہ شمارہ شائع کرنا پڑا۔

سردار صاحب ہمیشہ مقروض رہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب بھی اُن کے پاس روپیہ آیا تو انھوں نے سب سے پہلے قرض کی ادائیگی کی طرف توجہ دی۔ سردار صاحب کے ہاں ایک صاحب کام کرتے تھے جب اُن کی تنخواہ کا اٹھارہ سو روپیہ سردار صاحب پر واجب الادا ہو گیا تو وہ صاحب ان کی ملازمت چھوڑ کر "روزنامہ ملاپ" جالندھر میں چلے گئے۔ آٹھ نو ماہ بعد جناب سید محمود صاحب وزیر حکومتِ بہار نے اخبار "ریاست" کی ایک سو کاپیوں کے زرِ سالانہ کا ڈرافٹ بھجوایا تو سردار صاحب نے سب سے پہلے اٹھارہ سو روپیہ اُن صاحب کو جالندھر بھجوایا۔ اُن صاحب کا کہنا ہے کہ جب انھیں یہ اٹھارہ صد روپیہ ملا تو دوسرے دن ان کی لڑکی کی برات آنے والی تھی۔

سردار صاحب کا کوئی بھی ملاقاتی اجازت لیے بغیر اُن کے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ تراہا بہرام خاں والے مکان میں دفتر نچلی منزل میں تھا اور سردار صاحب دوسری منزل میں بیٹھتے تھے۔ ہر ملاقاتی کا نام وغیرہ لکھ کر چپراسی کو دیا جاتا اور وہ سردار صاحب کے ہاں لے جاتا۔ اگر انھوں نے اجازت دی تو ملاقاتی کو اوپر بھیج دیا جاتا اور اگر انھوں نے انکار کر دیا تو ملاقاتی سے دفتر کے منیجر معذرت چاہتے۔ (مگر یہ شرط جوش ملیح آبادی کے لیے نہیں تھی) ایک روز سردار صاحب کے بھانجے میجر کھنہ جو میدانِ جنگ سے واپس آئے تھے۔ سردار صاحب سے ملنے آئے اور بغیر اطلاع دیے اوپر چلے گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ سردار صاحب کی دیوان سنگھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فرمانے لگے کہ تم میجر ہو تمھیں اتنی بھی عقل نہیں کہ کسی کے کمرے میں بغیر اجازت نہیں جانا چاہیے۔ اگر میں اس وقت .... کر رہا ہوتا۔ بیچارہ میجر کھنہ جو کئی سالوں کے بعد بڑے ارمانوں کے ساتھ ماموں سے ملنے آیا تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی تصویر بنا سب کچھ سنتا رہا۔ جب سردار صاحب کی گھن گرج قدرے کم ہوئی تو میجر کھنہ نہایت احترام سے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر نمسکار کر کے چلا گیا۔

سردار صاحب کے جب کسی سے تعلقات خراب ہو جاتے تو خواہ وہ کتنا ہی قریبی دوست کیوں نہ رہا ہو اُس سے بول چال تو بند کر ہی دیتے تھے اس کے ساتھ ہی اپنے دروازے بھی اُس پر بند کر دیتے تھے۔ پھر کیا مجال

۱۹۸۷ء
ایک ہزار
پہلی بار

پروڈکشن

مُطرب صحرائی

کہ وہ سردار صاحب کو منا سکے یا اپنا اصلی یا مفروضہ تصور معاف کرا سکے۔ مگر چرنجیت لال ایڈوکیٹ نے اس سلسلے میں نظیر قائم کی کہ پندرہ سال تک متواتر ہر دوسرے تیسرے دن سردار صاحب کے ہاں آ کر مُلاقات کی اجازت مانگنا اور انکار ہونے پر چُپ چاپ واپس چلے جانا۔ یہاں تک کہ سردار صاحب بے نقط گالیاں بھی سُنا۔ تے مگر آذیں ہے چرنجیت لال کی کہ اُس نے سردار صاحب کو ہرا کر ہی چھوڑا۔ ایک دن چرنجیت لال صبح سویرے ہی آ کر سردار صاحب کے دروازے پر بیٹھ گئے اور چپراسی سے کہلوا دیا کہ سردار صاحب جب تک آپ مُلاقات کی اجازت نہیں دیں گے مَیں یہیں بیٹھا ہوں۔ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ ماہ جون کے دن۔ دفتر کے اسٹاف۔ نے چرنجیت لال کی ہر خدمت کرنے کی کوشش کی مگر اس نحیف وکیل نے پانی پیا اور نہ کچھ کھایا۔ سردار صاحب نے کہلوایا کہ اُسے کہہ دو وہ چلا جائے وگرنہ پولیس کو بُلوا کر نکلوا دیا جائے گا۔ مگر چرنجیت لال صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ شام کے سات بجے حسب معمول مَیں اور ماسٹر امیر چند کھنہ جب سردار صاحب کے ہاں پہنچے تو اس تمام صورتِ حال سے آگاہی ہوئی۔ میری تو ہمت نہ ہوئی مگر ماسٹر امیر چند کھنہ نے سردار صاحب سے کہا کہ دیوان سنگھ ایس چرنجیت لال نے تیرے کپڑے ماں مارے ہیں کہ اہدی بخشش ہی نہیں مُہندی۔ (دیوان سنگھ اس چرنجیت لال نے کون سے تیرے ماش کے کھیت اُجاڑ دیے ہیں جو اس کی بخشش نہیں ہو رہی) اس پر سردار صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ بُلالے اُس حرامزادے نوں۔

منشی عبدالقدیر صاحب دہلی کی مشہور علمی، ادبی شخصیت کے مالک تھے اور ایسے سخنہ کانگریسی شاید و باید ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ دہلی میں ایک مُسلم لیگی لیڈر کا قتل ہو جانے پر ان منشی عبدالقدیر صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ مُدت زمین ضمانت پر رہا ہوئے تو ان میں منشی عبدالقدیر بھی تھے۔ منشی صاحب سردار دیوان سنگھ کے بڑے مدّاح اور سردار صاحب منشی صاحب کے تنا خواں تھے۔ منشی جی ہر روز بارش ہو یا آندھی سردار صاحب سے ملنے ضرور جاتے۔ سردار صاحب کو یقین تھا کہ اس قتل میں منشی عبدالقدیر کا قطعاً کوئی ہاتھ نہ تھا مگر مقدمہ کی جس انداز میں سماعت ہو رہی تھی وہ چغلی کھا رہی تھی کہ پولیس کئی بے گناہوں کو سزائیں دلوا کے رہے گی اور منشی عبدالقدیر ایسے بے گناہ کا بچنا بھی مُشکل نظر آ رہا تھا۔ سردار صاحب منشی جی کو بچانے کی تراکیب سوچتے رہے۔ جب سیشن جج نے مُقدمے کے فیصلے کی تاریخ مُقرر کر دی تو سردار صاحب نے سیشن جج کو اپنے ہاں کھانے پر بُلایا۔ جناب تو کلی ایڈوکیٹ اور اسی قسم کے دیگر معززین کو مدعو کیا گیا۔ سردار صاحب کی اسکیم کے مُطابق ایک صاحب نے اس سیاسی قتل کا ذکر چھیڑ دیا۔ سردار صاحب نے تفصیل سے امر واقعہ کو بیان کیا۔ اور باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ سارے مُلزم۔ بے گناہ ہیں اور پولیس نے اصل مجرموں کو تو چھوا تک نہیں اور بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکوانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ سب باتیں سُننے کے بعد سیشن جج کہنے لگے کہ سردار صاحب یہ مُقدمہ تو میری عدالت میں چل رہا ہے۔ یہ سُنتے ہی سردار صاحب فرمانے لگے۔ اوہو معاف فرمائیے گا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو مَیں اس سلسلے میں کوئی بات بھی نہ کرتا یہ تو..... صاحب نے ذکر چھیڑ دیا تو جو کچھ مجھے اصل حالات معلوم تھے بتا دیے۔ جب اس مُقدمہ کا فیصلہ سُنایا گیا تو سیشن جج نے تمام ملزمان کو باعزّت بَری کر دیا اور پولیس کے خلاف اسٹرکچر پاس کیا کہ بے گناہوں کو پھانسا گیا ہے منشی عبدالقدیر صاحب نے سردار صاحب کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھا۔ افسوس ہے کہ ایک جھوٹی اطلاع پر سردار صاحب نے منشی عبدالقدیر سے بھی تعلقات منقطع کر لیے۔ انہی منشی عبدالقدیر صاحب نے ہی سردار دیوان سنگھ کے کہنے پر مجھے محلہ سوئی والان میں مکان کرایہ

پر دلایا تھا۔

سردار صاحب جب کسی ریاست کے نواب یا راجے کے خلاف مہم چلاتے اور معاملہ لین دین کا طے ہو جاتا تو روپیہ لینے وہ خود کبھی نہیں جاتے تھے بلکہ اس کام کے لیے ماسٹر امیر چند کھنہ۔ جناب شیونارائن بھٹناگر ایڈیٹر وطن، اور ..... نوٹیری پبلک کی خدمات مستعار لیتے تھے اور اس خدمت کا معاوضہ وہ فیاضی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ چنانچہ ماسٹر امیر چند کھنہ ایک ریاست میں سردار صاحب کے لیے روپیہ لینے کے لیے گئے تو دائی ریاست نے ماسٹر امیر چند کھنہ کو قتل کرا دینے کی اسکیم بنائی کسی طرح امیر چند کھنہ کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی اور وہ آدھی رات کو کسی نہ کسی طرح مہمان خانہ سے نکل کر کئی میل پیدل چل کر انگریزی علاقے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچے اور جس سمت کی بھی ریل انھیں پہلی وہ اُسی میں سوار ہو کر پانچ چھ دنوں کے بعد حواس باختہ دہلی پہنچے اور سارا واقعہ سردار صاحب کو سُنایا تو جہاں سردار صاحب نے دانت پیستے ہوئے دائی ریاست کو بے نقط سُنائیں۔ وہاں امیر چند کھنہ کو اس سے زیادہ روپیہ دیا جو وہ اس حالت میں دیتے۔ جبکہ ماسٹر امیر چند کھنہ اس دائی ریاست سے روپیہ لاتے۔ مگر اس کے بعد ماسٹر امیر چند کھنہ نے ایسی خدمت سے کنارہ کشی کر لی۔

غالباً ریاست اُودے پور کے دائی ریاست اور اُن کے بھائی میں ناچاقی ہو گئی۔ مہاراج کے بھائی سردار صاحب کے ہاں آئے اور "ریاست" میں مہاراج کے خلاف مہم شروع کرنے کے لیے ان کی مدد چاہی اور ساتھ ہی دس ہزار روپے کے نوٹ سردار صاحب کی میز پر رکھے مگر سردار صاحب اس خدمت کا معاوضہ ۲۵ ہزار چاہتے تھے اور اُودے پور والے صاحب دس ہزار سے زائد دینے کو تیار نہ تھے۔ ہاں منت سماجت ضرور کر رہے تھے کہ اتنے میں ہی کام کر دیجیے۔ سردار صاحب زُود رنج تو تھے ہی غصہ میں آ کر دس ہزار کے نوٹ اُٹھائے اور کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیے۔ جی۔ بی روڈ پر (اُن دنوں ریاست کا دفتر اجمیری گیٹ کے باہر جی۔ بی روڈ پر تھا)۔ اُودے پور والے حضرات نوٹ اکٹھے کر رہے تھے اور کئی راہگیر نوٹوں کی اس بارش میں فیضیاب ہوئے۔ جب سردار صاحب پر ریاستوں کے خاتمے کے بعد مالی بدحالی کا سایہ منڈلانے لگا تو ماسٹر امیر چند کھنہ کہتے تھے کہ سردار جی وہ دن یاد کیجیے۔ جب کہ آپ دس دس ہزار کے نوٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا کرتے تھے۔ آپ نے روپیہ کی بے قدری کی اور اب روپیہ آپ کی بے قدری کر رہا ہے۔

سردار صاحب کے ہاں تبادلہ میں سینکڑوں اخبارات آتے تھے جنھیں بغیر کھولے ہی وہ ایک کمرے میں پھینک دیا کرتے اور سال کے بعد کئی من ردّی فروخت ہوتی تھی۔ چاوڑی بازار کی ایک مشہور طوائف حج پر جا رہی تھی (اُن دنوں چاوڑی بازار میں گانے والی طوائفیں اپنا دھندا کرتی تھیں) وہ سردار صاحب کے ہاں آئی اور ایک رومال میں بیس ہزار روپے کے بندھے نوٹ دے کر کہنے لگی۔ سردار صاحب یہ میری امانت اپنے پاس رکھ لیجیے۔ جب میں حج سے واپس آؤں گی تو لے لوں گی۔ سردار صاحب نے بغیر نوٹ گنے بندھا بندھایا رومال اس خاتون سے لے کر اس ردّی والے کمرے میں پھینک دیا۔ کچھ دنوں بعد لالہ شیونارائن بھٹناگر ایڈیٹر وطن سردار صاحب کے ہاں آئے اور کچھ روپیہ قرض کے طور پر طلب کیا۔ سردار صاحب نے فرمایا کہ بھٹناگر جی میں جھوٹ بول نہیں سکتا۔ میرے پاس بیس ہزار روپے ہیں مگر میں اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔ بھٹناگر صاحب نے بیس ہزار روپیہ کا نام سُنا۔ تو اُن کے کانوں نے اس انکشاف کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے سوچا کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کیسے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ سردار صاحب انھیں بے وقوف بنا رہے۔

بھٹناگر صاحب نے کہا اچھا سردار صاحب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ سے روپیہ نہیں لوں گا مگر مجھے وہ بیس ہزار روپیہ دکھا دیجئے۔ سردار صاحب نے بڑی بے اعتنائی سے اس اندھیرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان ردّی اخبارات میں پڑا ہے۔ بھٹناگر کمرے میں گئے اور چند منٹ میں اخبارات کو ادھر اُدھر کر کے بعد بیس ہزار کے نوٹوں کے رُومال میں بندھے ہوئے بنڈل کو اُٹھا لائے۔ بھٹناگر صاحب نے رُومال کھول کر نوٹ گنے تو پورے بیس ہزار تھے۔ سردار صاحب نے کہا کہ ویسے ہی باندھ کر دہیں پھینک دو۔ چنانچہ جب یہ طوائف حج سے واپس آئی تو کچھ دنوں کے بعد اپنی امانت واپس لینے کے لیے سردار صاحب کے ہاں آئی۔ تو سردار صاحب نے فرمایا کہ جہاں رومال پھینکا گیا تھا وہیں سے اُٹھا لیجیے۔

ایمبیسڈری کی ٹریننگ

دلّی ریلوے اسٹیشن پر ایک پارسل کلرک تھے۔ اُن کا ہفتے میں ایک بار سردار دیوان سنگھ مفتون کے [illegible] دیکھنے میں تو یہ صاحب خاصے وجیہہ اور صاحب فہم و ذکا معلوم پڑتے تھے، مگر جب زبان کھولتے تو پتہ چلتا کہ اُن کے دماغ کا کوئی پُرزہ ڈھیلا ہے۔ چار پانچ سال کے بعد جب یہ ریٹائر ہوئے تو ان کا سردار صاحب کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا۔ اور یہ سردار صاحب سے اکثر کہتے . . . مجھے ایسا کوئی کام بتائیے کہ جس سے میری زندگی آرام سے کٹ جائے۔ ان لالہ صاحب نے سردار صاحب سے یہ بھی بتا دیا تھا کہ انھیں ریٹائرمنٹ کے بعد قریباً نصف لاکھ روپیہ بھی محکمہ ریلوے سے ملنے والا ہے — سردار صاحب ہنسی ہنسی میں کہتے کہ آپ ایسے لائق وجیہہ اور صاحبِ عقل و ہوش کو کسی مُلک کا ایمبسڈر ہونا چاہیے . . . مگر یہ صاحب سمجھتے کہ سردار صاحب سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔

شام کو جب سردار صاحب کے ہاں محفل جمتی اور کسی دن یہ صاحب بھی آجاتے تو باتوں باتوں میں سردار صاحب قہقہوں میں ان لالہ جی کو مخاطب کرتے وقت کہتے کہ ایمبسڈر صاحب آپ کے لیے ہم پنڈت جواہر لال نہرو سے سفارش کریں گے کہ ایسے دانا اور تجربہ کار کو کسی مُلک میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھجوایا جائے . . . اور یہ سُن کر لالہ جی کا گورے رنگ کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو جاتا۔

جناب نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار، لکھنؤ کسی کام سے دہلی تشریف لائے تو اُن کا قیام سردار صاحب کے ہاں تھا۔ چنانچہ نیاز صاحب سے ملنے کے لیے اکثر ادیب، شعرا اور صحافی سردار جی کے ہاں کثرت سے آتے مگر نیاز صاحب سے ملاقات کے اوقات بھی وہی تھے جو سردار صاحب کا تفریح کا وقت تھا یعنی شام کو سورج غروب ہونے کے بعد — نیاز صاحب دن بھر جہاں بھی تشریف لے جاتے میں ان کے ساتھ رہتا۔ سردار صاحب نے سردار دول سنگھ کو ٹیکسی کار منگائی تھی تاکہ نیاز صاحب کو جہاں بھی جانا ہو اُسی کار سے آجا سکیں۔

ایک دن جب نیاز صاحب اور میں قریباً ۷ بجے شام سردار صاحب کے مکان پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سردار صاحب کی محفل میں دستور سے زیادہ حاضری ہے اور پاکستانی ہائی کمیشن کے پریس اٹیچی جناب محمد شریف بھی تشریف فرما ہیں اور ریٹائرڈ ریلوے پارسل کلرک بھی موجود ہیں۔ اور قہقہوں کا ایک سیلاب ہے کہ رُکنے میں نہیں آرہا — جب حاضرین اور نیاز صاحب میں علیک سلیک ہو چکی تو سردار صاحب نے [illegible] گفتگو جاری کرتے ہوئے فرمایا کہ . . . صاحبان پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر یہاں موجود ہیں۔ یہ لالہ صاحب کو بتائیں گے کہ ایمبسڈر بننے کے لیے کسی اُمیدوار کی کیا کوالفیکیشن ہونی چاہیے۔

پینتالیس

محمد شریف صاحب بھی سمجھ چکے تھے کہ معاملہ کافی دلچسپ ہے لہٰذا اُنھوں نے فرمایا کہ اس جاب کے لیے اُمیدوار میں حسبِ ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے :

۱ - انگریزی رواں دواں بول سکتا ہو۔

۲ - نہ صرف یہ کہ اس کی بیوی اچھی خوبصورت ہو بلکہ وہ بھی انگریزی رواں دواں بول سکتی ہو۔ اگر اُمیدوار رنڈوا ہو تو اس کی لڑکی جس میں یہ خوبیاں ہونا ضروری ہیں تاکہ سفارت خانہ کی تقریبات میں آنے والے مہمانوں کی آؤبھگت بہتر انداز میں کر سکے اور ان سے انگریزی میں بے تکان گفتگو کر سکے۔

سردار صاحب نے کٹ شارٹ کرتے ہوئے فرمایا (کیونکہ سردار صاحب دو منٹ سے زیادہ کسی دوسرے کی بات سُن ہی نہیں سکتے تھے) کہ شریف صاحب ان دو خصوصیات کے علاوہ باقی کسی بات کی ضرورت ہی نہیں اور لالہ صاحب سے کہنے لگے کہ . . . آپ کی بیوی تو پُرانے زمانے کی ہوگی اس لیے آپ کسی وقتی بیوی کا انتظام کیجیے تاکہ آپ کے لیے پنڈت نہرو سے سفارش کی جائے . . . سردار صاحب نے مزید یقین دلاتے ہوئے فرمایا کہ جوش صاحب کا پنڈت نہرو پر اتنا اثر ہے کہ وہ بے تکلف پنڈت جی سے آپ کی سفارش کر سکتے ہیں۔ اسی ہنسی خوشی میں ساڑھے نو بجے کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ قبلہ جوش صاحب کو سردار جی نے کھانے پر مدعو فرمایا۔ اس شام کو سردار صاحب نے چار پانچ احباب کو ہی مدعو کر رکھا تھا۔ اور باقی حضرات کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ جوش صاحب سے کسی خاص مسئلہ پر بات چیت ہونی ہے اس لیے وہ تشریف نہ لائیں۔ مجھے سردار صاحب نے اس شام کے لیے نہ تو مدعو فرمایا تھا اور نہ آنے سے منع کیا تھا۔ مگر مَیں نے از خود اس شام کو سردار صاحب کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور بیوی کو ساتھ لے کر گولچہ سینما میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ —— ۹½ بجے رات کو جب گھر پہنچا تو بچوں نے بتایا کہ سردار صاحب کے ہاں سے دو مرتبہ ملازم بلانے آیا تھا اور کہہ گیا ہے کہ سرور صاحب جونہی آئیں تو سردار صاحب کے ہاں چلے آئیں بہت ہی ضروری کام ہے۔

مَیں اُلٹے پاؤں سردار صاحب کے ہاں پہنچا تو کھانا چل رہا تھا اور لالہ جی بھی شراب میں شرابور مُرغ کی ٹانگ کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ سردار صاحب فرمانے لگے کہ آپ کھانے پر کیوں نہیں آئے جب کہ آپ کو معلوم تھا کہ جناب جوش صاحب کو مدعو کیا گیا ہے —— مَیں نے اصل بات کہہ دی کہ آپ نے کھانے کے لیے کہا ہی نہ تھا، تو سردار صاحب قہقہے لگاتے ہوئے فرمانے لگے . . . سرور صاحب جب ہر شام کا کھانا آپ یہیں کھاتے ہیں تو آپ سے اس شام کے لیے کہنے کی کیا ضرورت تھی . . . عرض کیا کہ جب آپ نے ایک دن پہلے یہ کہا تھا کہ، بھئی جوش صاحب کو ایک خاص معاملے کے لیے مدعو کیا گیا ہے اس لیے کل محفل نہیں جمے گی۔ اتنے میں ملازم میرے سامنے ٹی پائے پر رکھ چکا تھا۔ اور سردار صاحب نے جلدی سے بھری اسٹار برانڈی کا ایک بڑا پیگ مجھے دیتے ہوئے فرمایا کہ آج لالہ جی کو عملی ٹریننگ دینی شروع کر دی گئی ہے یعنی آج انھیں شراب پینا سکھایا گیا ہے کیونکہ سفارت خانوں میں تو شراب پینے اور پلانے کی صلاحیت ایمبیسڈروں میں ہونا ضروری ہوتا ہے اور سردار صاحب نے یہ خوشخبری بھی سُنائی کہ جوش صاحب نے پنڈت نہرو سے ان کی سفارش کرنا منظور کر لیا ہے مَیں نے اشارے سے سردار صاحب سے پوچھا کہ کل تو آپ نے لالہ صاحب کو آج کے لیے آنے کو منع فرمایا تھا پھر یہ کیسے آ گئے —— تو سردار صاحب ہنسی کو ضبط نہ کر سکے اور اپنی مخصوص ہنسی میں آنکھوں کو سکیڑتے اور

چھیالیس

پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہنے لگے . . . . اجی جناب ہمارے ایمبسڈر صاحب کو ریلوے سے روپیہ بھی مل گیا ہے اور انھوں نے نئی شادی کا بھی انتظام کر لیا ہے - یہ خوشخبری دینے لالہ جی تشریف لائے تو ان کی موجودگی میں مَیں نے جوش صاحب سے گزارش کی ہے کہ وہ پنڈت نہرو سے ان کی سفارش کر دیں اور جوش صاحب نے منظور کر لیا ہے . . اس کے پندرہ بیس منٹ بعد جوش صاحب کو مَیں ترا ہا بہرام خاں تک اُن کی کار تک پہنچاتے ہوئے سوئی والان میں اپنے گھر چلا گیا -

دوسرے دن ابھی شام کے سوا پانچ ہی بجے تھے کہ سردار صاحب کا ملازم بلانے آیا کہ جلدی چلیے سردار صاحب نے کہا ہے کہ اپنے ساتھ ہی لے کر آنا ——— تعمیلِ حکم میں جب مَیں سردار صاحب کے ہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لالہ صاحب مع ایک فیشن ایبل محترمہ تشریف فرما ہیں - سردار صاحب نے رازدارانہ لہجہ میں فرمایا . . سرور صاحب یہ . . . ہاں - بی اے تک پڑھی ہوئی ہیں - پہلے کسی پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرتی تھیں، آجکل بے کار ہیں - خاوند سے نا چاقی کے باعث طلاق مل چکا ہے - چونکہ لالہ صاحب بہت جلد کسی مُلک میں ایمبسڈر بن کر جانے والے ہیں - اس لیے یہ ان صاحبہ سے شادی کر رہے ہیں تاکہ تعلیم یافتہ بیوی کو اپنے ساتھ لے جا سکیں یہ سُنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی ——— قریباً تیس بتیس سالہ یہ حسینہ پورے کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئی تھیں - مَیں نے انھیں ایک نظر دیکھا اور لالہ جی سے پوچھا کہ آپ کی پہلی بیوی کو اِس شادی کا علم ہے . . فرمانے لگے . . . سرور صاحب ایسی باتوں کو بیوی بچّوں کو بتایا جاتا ہے بھلا - مجھے جو رقم ریلوے سے ملی ہے وہ سب ان کے نام کرنی ہے - تب یہ میرے ساتھ شادی کریں گی -

جب سردار صاحب نے یہ شرط سُنی تو مَیں نے محسوس کیا کہ ان کے دماغ میں بھی ہلچل مچ گئی - سردار جی نے گرم گرم سموسے منگائے اور چائے پلا کر ان دونوں کو رخصت کیا اور لالہ جی سے کہا کہ مَیں آج سوچوں گا کہ یہ عورت آپ کے لیے موزوں رہے گی یا نہیں ——— لہٰذا شادی کا فیصلہ کل کرنا - جب لالہ جی اور ان کی دریافت چلے گئے تو سردار صاحب فرمانے لگے . . . سرور صاحب ہم تو ہنسی مذاق میں تفریح کر رہے تھے - اور یہ معاملہ بڑا خطرناک حالت اختیار کر رہا ہے - اگر اس اُلّو کے پٹھے نے سارا روپیہ اس کے نام لگوا دیا تو اس کی بیوی اور بچّوں کا کیا بنے گا - یہ حرافہ تو اسے چند دنوں میں کنگال کر دے گی - لہٰذا ابھی جا کر لالہ جی کی بیوی اور بچّوں کو سارا واقعہ بتا دو کہ وہ لوگ روپیہ پر قبضہ کر لیں اور لالہ جی کی ذرا اچھی طرح سے خبر لیں - تاکہ یہ دوسری شادی نہ کر سکیں -

مَیں اُسی وقت شاہدرہ گیا - اور لالہ جی کے گھر جا کر سارا قصّہ سُنایا - لالہ جی کے میٹر کے اُتار چڑھاؤ پر نظر دوڑائی تو انھیں یقین آنے لگا - کیونکہ لالہ جی ایک ہفتہ میں ہی قریباً ایک ہزار روپیہ گھر سے لے جا چکے تھے -

رات کو جب لالہ جی گھر پہنچے تو ان کی بیوی اور جوان بچّوں نے جو ان کی سمری ٹرائل کی اس کی روداد جب لالہ جی نے خود سردار صاحب کے ہاں سُنائی تو سردار صاحب نے لالہ جی کو دو پیگ وہسکی پلا کر دلاسا دیا کہ گھبرائیے نہیں اگر آپ کو ایمبسڈری راس نہیں آتی تو آپ کے لیے کوئی دوسری نوکری تلاش کریں گے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اُدھر تمھارے گھر والے اس نوکری کے خلاف ہیں اور دوسرے تمھیں دُوسری نوجوان اور خوبصورت تعلیم یافتہ بیوی کا اس عمر میں ملنا مُشکل ہے - لہٰذا چند دنوں میں ہی آپ کے لیے کوئی موزوں ملازمت تلاش کریں گے کہ جس میں یہ جھنجھٹ ہی نہ رہے -

ناکام بلیک میلنگ

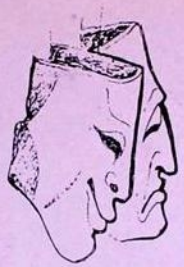

اُن دنوں ایک فلم "شاعر" بنی۔ جس کے دہلی اور یو۔پی کے تقسیم کار سیٹھ جگت نرائن تھے۔ دیوان متھرا داس آہوجہ فرحت کرنال میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ باتوں باتوں میں اُنھوں نے پروفیسر ضیاؔ مرحوم (جو انبالہ میں پڑھاتے تھے۔) سے کہا کہ جب وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں ایم۔ اے کے اسٹوڈنٹ تھے تو انھوں نے ایک فلمی کہانی "شاعر" لکھی تھی اور اپنے پروفیسر سید عابد علی عابدؔ کو نظر ثانی کے لیے دی تھی جسے وہ بمبئی لے گئے تھے اور اس کے بعد اس کہانی کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئی۔ قیام پاکستان کے باعث دیوان متھرا داس آہوجہ ہندوستان آ گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سید عابد علی ان کی یہ کہانی بمبئی میں کسی فلم ساز کو دیکھنے کے لیے دے آئے ہوں۔ اور اب تقسیم مُلک کے بعد اس فلم ساز نے وہی کہانی کچھ ردّ و بدل کے ساتھ کسی فرضی یا اصلی کہانی کار کے نام سے فلمادی ہو۔ پروفیسر ضیاؔ نے یہ سب کچھ سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ کو بتایا تو مفتوںؔ صاحب کے زرخیز دماغ نے فوراً سیٹھ جگت نارائن کے لیے ایک اور مُشکل کھڑی کرنے کا پلان بنا لیا۔

ایڈیٹر شانِ ہند اور دیوان متھرا داس آہوجہ فرحت رشتہ دار ہونے کے علاوہ دوست بھی ہیں۔ اتفاقاً میں کرنال میں آہوجہ صاحب کے ہاں مقیم تھا کہ رات کے نَو دس بجے کوتوالی کرنال کا ایک کانسٹیبل آہوجہ صاحب کے بنگلہ پر آیا، اور کہنے لگا کہ دہلی سے کوتوالی میں فون آیا ہے کہ آہوجہ صاحب اس فون نمبر پر فوراً آ کر بات کریں۔ اس وقت آہوجہ صاحب کے بنگلہ پر فون نہیں تھا۔ آہوجہ صاحب نے فون نمبر پڑھا تو انھوں نے حیرانی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ دہلی میں میرے کسی بھی جاننے والے کا یہ فون نمبر نہیں ہے۔ انھوں نے فون نمبر والے کاغذ کے ٹکڑے کو مجھ کو دکھایا تو میں نے نمبر پڑھتے ہی بے ساختہ کہا کہ یہ نمبر تو سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ کا ہے۔ آہوجہ صاحب کے بنگلہ کے قریب ہی ایک سردار صاحب مجسٹریٹ کی کوٹھی پر فون تھا لہٰذا آہوجہ صاحب مجھے ساتھ لیے ان مجسٹریٹ صاحب کے ہاں گئے اور وہاں سے انھوں نے مفتوں صاحب کے نمبر پر ٹرنک کال بُک کرائی اور ٹیلیفون آپریٹر سے کہا کہ مَیں اے۔ ڈی۔ ایم کرنال بول رہا ہوں لہٰذا یہ کال فوراً ملا دی جائے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر فون پر پروفیسر ضیاؔ صاحب آہوجہ صاحب سے بات کر رہے تھے۔ یہ بات چیت پندرہ منٹ تک جاری رہی اور ضیاؔ صاحب نے آہوجہ صاحب کو یہ یقین دلایا کہ انھوں نے ہر طرح سے یہ تحقیقات کر لی ہے کہ یہ فلم شاعر آپ ہی کی کہانی پر تیار کی گئی ہے۔ لہٰذا آپ فوراً عدالت سے حُکم امتناعی حاصل کر کے سیٹھ جگت نارائن پر تعمیل کرائیں کہ وہ اس فلم کی نمائش نہیں کر سکتے۔ اور اِدھر پانچ دن کے بعد یہ فلم نادلٹی سینما دہلی میں دکھائے جانے کا پروگرام تھا۔ دوسرے دن آہوجہ صاحب نے اپنی عدالت میں جاتے ہی سینئر سب جج کو بلوایا اور اُن سے مشورہ کر کے ایک وکیل سے اس فلم کی نمائش کو روکنے کے لیے حکمِ امتناعی کی درخواست

سینیئر سب جج کی عدالت میں دے دی اور نصف گھنٹے میں حکم امتناعی مل گیا اور اس کی تعمیل کے لیے عدالتی کارندہ دہلی روانہ بھی ہو گیا اور اسی روز جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز دہلی پر اس حکم امتناعی کی تعمیل عمل میں بھی آ گئی۔

لالہ کرم چند آف "پارس" سیٹھ جگت نارائن کے ہاں جانے والے حاضر باش قسم کے اخبار نویس تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سیٹھ صاحب کے رحم و کرم پر ہی "پارس" کی زندگی کا دارومدار تھا تو بے جا نہ ہو گا۔ چنانچہ سیٹھ جگت نارائن صاحب نے لالہ کرم چند سے اس سارے واقعے کا ذکر کیا تو لالہ کرم چند نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے سیٹھ صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اس مشکل میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اب تیسرے دن جمعہ کو یہ فلم نادکٹی سینما کے علاوہ یو۔پی کے کئی مقامات پر دکھائی جانے والی تھی۔ اس لیے سیٹھ جگت نارائن کی پریشانی کا اندازہ لگایا جانا مشکل نہ تھا۔

لالہ کرم چند مرحوم اور مرحوم پنڈت ہری چند اختر کی جوڑی لاہور میں بھی مشہور تھی۔ اور یہ دوستی دہلی میں بھی حسبِ سابق تھی۔ لالہ کرم چند نے پنڈت ہری چند اختر سے اس معاملے کا ذکر کیا تو انھیں اس کا علم تھا کہ دیوان متھرا داس آہوجہ اور سرور تونسوی رشتہ دار ہیں۔ ویسے پنڈت ہری چند اختر آہوجہ صاحب سے ذاتی طور پر بھی واقف تھے مگر انھوں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر ایڈیٹر شانِ ہند سے رجوع فرمایا۔

کرنال سے واپس آنے کے بعد ایڈیٹر شانِ ہند سردار صاحب کے یہاں حسبِ معمول شام کی محفل میں شرکت کر رہا تھا۔ پروفیسر ضیاؔر صاحب خلافِ توقع تین چار دنوں سے سردار صاحب کے مہمان تھے۔ مگر سردار صاحب نے اس معاملے کے بارے میں ایڈیٹر شانِ ہند کے کانوں میں بھنک تک نہ پڑنے دی۔ کسی سازش کی تیاری اور اس کی رازداری کا کمال جو سردار صاحب کو حاصل تھا وہ کم لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ مگر سردار صاحب اور ضیاؔر صاحب کو اس کا علم نہ تھا کہ جب انھوں نے کرنال آہوجہ صاحب کو فون کیا تو ایڈیٹر شانِ ہند وہاں موجود تھا۔ اور اسے ڈرامے کے پلاٹ سے پوری پوری واقفیت ہے۔ پنڈت ہری چند اختر نے مجھے اتنا ہی بتایا کہ آہوجہ صاحب نے فلم "شاعر" کی نمائش رکوا دی ہے۔ اور پرسوں فلم سارے ہندوستان میں ریلیز ہونی ہے۔ اس لیے سیٹھ جگت نارائن پریشان ہیں۔ آہوجہ صاحب تمہارے رشتہ دار ہیں اور دوست بھی لہٰذا کرنال چلو اور اتنا کرا دو کہ حکم امتناعی منسوخ ہو جائے۔ سیٹھ جگت نارائن صاحب کا کہنا ہے کہ اگر واقعی یہ کہانی آہوجہ صاحب کی ہے تو وہ اس کا مناسب معاوضہ دے دیں گے۔

پنڈت جی کا یہ فرمان سننے کے بعد اُن کی واقفیت کے لیے اس ڈرامے کا پس منظر اُن کے گوش گزار کیا گیا تو وہ کانوں کو پکڑ کر سردار دیوان سنگھ مفتون کے سازشی دماغ کی تعریف کرنے لگے۔ پروفیسر ضیاؔر سے پنڈت جی کے تعلقات بڑے ہی دوستانہ تھے۔ انھوں نے سردار صاحب کے ہاں فون کر کے ضیاؔر صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی تو ضیاؔر صاحب نے وہاں موجود ہوتے ہوئے سردار صاحب سے کہلوا دیا کہ ضیاؔر صاحب تو دو دن ہوئے انبالہ چلے گئے ہیں کیونکہ ضیاؔر صاحب کو یہ یقین تھا کہ سیٹھ جگت نارائن اب ایسی مشکل میں ہیں کہ وہ آہوجہ صاحب انھیں اور سردار دیوان سنگھ مفتون کو ہزار ہا روپیہ دینے پر مجبور ہوں گے۔ پنڈت ہری چند اختر صاحب پروفیسر ضیاؔر کے اس کردار پر حیران تھے۔ چونکہ پنڈت ہری چند اختر کا فرمان نہایت مناسب طور پر مصالحانہ تھا اس لیے میں نے ان کو یقین دلایا کہ آہوجہ صاحب بلیک میلنگ کی اس سازش میں قطعاً شریک نہیں ہیں۔ بلکہ پروفیسر ضیاؔر نے انھیں اس سازش میں از خود شریک کر رکھا ہے۔ اور جب آہوجہ صاحب کو اصل واقعے کا علم ہو گا تو یہ حکم امتناعی پل بھر میں منسوخ ہو جائے گا۔

پنڈت جی نے میرے ہاں سے ہی فون پر سیٹھ جگت نارائن سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ سرور کو ساتھ لے کر ان کی رہائش گاہ

خوشنویس

جمال گیاوی

ابوالحسنات صدیقی

حسن کار

مصطفیٰ آرٹسٹ

لیڈ لو کیسل پر آجائیے۔

میں اور اختر صاحب جب سیٹھ جگت نارائن صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو انھیں کسی قدر سراسیمہ اور کافی حد تک پریشان پایا۔ مگر وہ ایک کامیاب کاروباری اور انتہائی سُوجھ بُوجھ کے مالک تھے۔ انھوں نے سو سو روپے کی دو گڈّیاں دس دس ہزار روپے کی میرے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ سردار صاحب یہ روپیہ کرنال لے جائیے اور اس معاملہ کو آج چار بجے سے پہلے پہلے ختم کرا دیجئے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اگر پانچ دس ہزار روپے کی اور ضرورت پڑے تو وہ بھی دوں گا۔ اتنے میں میز پر چائے آچکی تھی۔ چائے کی پیالی ختم کرتے ہی میں نے فیصلہ کُن انداز میں سیٹھ صاحب سے گُذارش کی کہ یہ روپیہ تو اپنے پاس رکھیے مجھے فلم "شاعر" کی مختصر چھپی ہوئی کہانی اور گانے وغیرہ دے دیجئے اور میرے ساتھ اپنا کوئی آدمی دے دیجئے۔ ہم یہ کہانی دیوان متھرا داس آہوجہ کو سُنا آتے ہیں اور یہ باور کیجئے کہ اگر اُن کی کہانی نہیں ہوگی تو وہ اس کا صاف صاف اقرار کرلیں گے اور اگر یہ کہانی اُن کی ہے تو اُس کے معاوضہ وغیرہ کی بات بعد میں ہوجائے گی مگر ہر حالت میں حکم امتناعی کی منسوخی کا آرڈر آپ کو شام تک مل جائے گا۔ سیٹھ صاحب نے فوراً "جگت ٹاکیز" ڈسٹری بیوٹرز کے جنرل مینیجر اور اپنے بھتیجے کو حکم دیا کہ تم دونوں کار پر سردار صاحب کے ساتھ کرنال جاؤ اور فلم کی کہانی وغیرہ بھی ساتھ لے جاؤ۔ پندرہ منٹ کے بعد کار کرنال روڈ پر دوڑ رہی تھی اور ہم ½ ۱۲ بجے کرنال آہوجہ صاحب کی عدالت میں جا پہنچے۔ آہوجہ صاحب کسی مقدمہ کی سماعت فرما رہے تھے۔ فریقین کے وکلا پورے پورے وکیلانہ انداز میں اپنا اپنا معاملہ پیش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آہوجہ صاحب نے چپراسی کو حکم دیا کہ انھیں اُن کے ریٹائرنگ روم میں بٹھا دیا جائے۔ نصف گھنٹہ کے بعد لنچ ہوتے ہی آہوجہ صاحب ہمارے پاس تشریف لے آئے اور فرمانے لگے کہو بھائی کیسے آنا ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا اور آنے کا مدّعا بھی ظاہر کیا تو کہنے لگے دکھائیے کہانی کہاں ہے۔ مختصر کہانی کی مطبوعہ کاپی اُن کے سامنے رکھی گئی۔ اور انھوں نے نصف گھنٹے تک کہانی اور اس کے گانے وغیرہ پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ کہانی میری نہیں ہے۔ اور کہنے لگے کہ حضرات مجھے افسوس ہے کہ ضیار صاحب کی غلط بیانی کے باعث میں نے جلدی میں آپ لوگوں کو پریشان کیا لنچ کا وقت ختم ہونے دیجئے سینئر سب جج صاحب عدالت میں تشریف لے آئیں تو میں فوری طور پر حکم امتناعی کی منسوخی کی درخواست دیئے دیتا ہوں۔ آہوجہ صاحب نے چپراسی کو حکم دیا کہ فوراً فلاں وکیل کو بُلا کر لاؤ۔ دس منٹ کے بعد وکیل صاحب تشریف لے آئے جنھیں آہوجہ صاحب نے ہدایت فرمائی کہ سینئر سب جج صاحب کی عدالت میں اِن کی طرف سے درخواست دی جائے کہ فلم "شاعر" کی نمائش کے خلاف جو حکم امتناعی جاری کیا گیا ہے اُسے فوراً منسوخ کرایا جائے کیونکہ وہ کہانی میری نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ چائے وغیرہ پی ہی رہے تھے کہ وکیل صاحب درخواست ٹائپ کرا کے لے آئے اور آہوجہ صاحب نے اس پر دستخط فرما دیے۔ تقریباً تین بجے حکمِ امتناعی کی منسوخی کا حکم نامہ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اور ہم تینوں آہوجہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے دہلی کے لیے روانہ ہوئے اور ½ ۵ بجے سیٹھ صاحب کے ہاں واپس آئے تو وہ ہمارے منتظر تھے۔ حکمِ امتناعی کی منسوخی کا سُن کر سیٹھ جگت نارائن کی خوشی کی انتہا نہ رہی فرمانے لگے سردار صاحب آج ڈنر روشن آرا کلب میں ہوگا۔ مگر میں نے کوئی بہانہ بنا کر ڈنر میں شرکت کے لیے معافی چاہی اور سیٹھ صاحب نے ڈرائیور سے کہا کہ سردار صاحب کو گھر پہنچا آئے۔

دوسرے دن فلم "شاعر" پروگرام کے مطابق ریلیز ہوئی تو سردار صاحب اور ضیار صاحب کی شکست خوردگی کا منظر دیکھنے والا تھا۔ شام کو جب حسبِ معمول میں سردار صاحب کے ہاں پہنچا تو رات کے قریباً آٹھ بجے

اکیاون

ضیا رصاحب نے کرنال آہوجہ صاحب کو فون کر کے صورتِ حال جاننی چاہی۔ ٹیلیفون پر نصف منٹ کے قریب بات چیت ہوئی۔ جس کے بارے میں بعد میں آہوجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے ضیا رصاحب کو صرف اتنا ہی کہا کہ تم نے میری سرکاری پوزیشن کا تو دھیان رکھا ہوتا۔ کیونکہ ضیاؔر صاحب نے یہ سارا ڈرامہ اپنے خیال و یقین کے مطابق مجھ سے انتہائی طور پر خفیہ رکھ کر کھیلا تھا۔ اس لیے میں نے بھی THE END کو پردۂ راز میں ہی رکھا۔

دوسرے ہی دن جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کی طرف سے شانِ ہند کے لیے ایک سال کے لیے چار صفحہ اشتہارات ہر ماہ کا ریلیز آرڈر ملا۔ سیٹھ جگت نارائن صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اِن اشتہارات کی اشاعت سے معذوری کا اظہار کیا گیا۔ تو سیٹھ صاحب نے حیرت سے فرمایا سرؔور صاحب یہاں اخبار والے اشتہار حاصل کرنے کے لیے میرے پاؤں پر پگڑیاں اُتار کر رکھتے ہیں۔ اور ایک آپ ہیں کہ اشتہار چھاپنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس پر انھیں آگاہ کیا گیا کہ جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کے اشتہارات شانِ ہند میں شائع ہوتے ہی سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ ہوا سونگھ کر ہی اندازہ لگالیں گے کہ سیٹھ صاحب اور سرؔور تونسوی کا میل ملاپ ہے۔ اور سردار صاحب اپنے دشمن کے لیے اپنے مخلص سے مخلص دوست کو قربان کر دینا ایک معمولی بات سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت کا رُخ آپ کی طرف سے ہٹ کر میری طرف ہو جائے گا۔ سیٹھ صاحب نے اس نزاکت کا احساس کیا اور ان کے دِل میں ایڈیٹر شانِ ہند کے لیے ایک جگہ بن گئی اور یہی وجہ تھی کہ سیٹھ صاحب جب تک زندہ رہے سرؔور تونسوی کے ساتھ ان کے تعلقات انتہائی دوستی کے رہے اور وہ مجھے اپنے خیر خواہوں میں سمجھتے رہے جو دوسرے کئی صحافیوں کے لیے سوہانِ رُوح تھا۔

سیٹھ جگت نارائن کو بلیک میل کرنے کے لیے مفتوںؔ صاحب کی یہ دوسری کوشش بھی ناکام گئی تو انھیں اندازہ ہوا کہ اِن تِلوں سے تیل نکلنا مشکل ہے اور انھوں نے سیٹھ جگت نارائن کے خلاف پھر کوئی سازش نہیں کی گو یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا یہ اقدام مجبوری کے تحت تھا ورنہ طبعاً وہ ایسا نہ کرتے۔

"ان واقعات پر جو محض مادی عظمت یا
اثر و اقتدار کا باعث ہوتے ہیں سرسری
نظر ڈالتے ہوئے گزر جانا اور خیالات
کو نچلی کوائف میں لے جانا اور زندگی کی
باریک جزئیات کو نمایاں کرنا بھی فن کاری
ہے۔"

——— جانسن

بحوالہ اردو میں سوانح نگاری
مصنف سید علی شاہ

اِنٹرویو

میرا مکان چاندنی محل میں تھا اور سردار دیوان سنگھ مفتونؔ ایڈیٹر ریاست کا پھاٹک مفتی والان میں۔ چاندنی محل اور پھاٹک مُفتی والان میں بڑی مشکل سے ایک فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ اس لیے دن میں دو چار مرتبہ سردار صاحب کے ہاں جانا ہوتا تھا۔ ایک دن سردار صاحب کا ملازم شام کے وقت آیا۔ اور کہنے لگا کہ سردار صاحب نے کہا ہے کہ اسی وقت آجائیے بڑا ضروری کام ہے۔ تعمیلِ حُکم میں ملازم کے ساتھ ہی ہو لیا۔ سردار صاحب اور مائسٹر امیر چند کھنہ مجھے دیکھتے ہی خلاف معمول اُٹھ کھڑے ہوئے اور یک زبان ہو کر کہنے لگے آیئے ڈائرکٹر صاحب اس خلافِ معمول استقبال سے میں سمجھ گیا کہ کسی کو اُلّو بنانا ہوگا۔ دیکھا تو ایک سکھ نوجوان نے بھی مجھے بڑے احترام اور انکساری سے ست سری اکال کہا۔ مجھے بڑے احترام سے کُرسی پیش کی گئی اور سردار صاحب نے چائے کا گلاس اور کریم کریکر بسکٹ پیش کیے۔ اس اہتمام نے مجھے اور بھی یقین دلایا کہ معاملہ کافی دلچسپ ہے۔

چائے پینے کے بعد سردار صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ڈائرکٹر صاحب آج کل بیرونی ممالک کے وزرائے اعظم اور مہمانانِ خصوصی اکثر نئی دہلی آرہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر یہ بیرونی حضرات جب پھُول مالائیں چڑھانے آتے ہیں تو انھیں یہ دکھانے کے لیے کہ ہندوستانی مہاتما گاندھی کا غم کس شدّت سے منا رہے ہیں۔ اور یہ رونے والے اُجرتاً رکھے جاتے ہیں۔ مَیں نے آپ کو تکلیف اس لیے دی ہے کہ ہمارے یہ سردار صاحب بے کار ہیں اگر آپ انھیں بھی ان اُجرتاً رونے والوں میں ملازم رکھ لیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ مَیں نے بڑی مشکل سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سردار صاحب سے کہا سردار صاحب اس نوجوان کو انٹرویو دینا ہوگا تب ہی اندازہ ہو سکے گا کہ یہ اس ڈیوٹی کے لیے فٹ ہیں بھی کہ نہیں۔ سردار صاحب نے بھی اپنی ہنسی کو نہ معلوم کس طرح ضبط میں رکھا اور کہا کہ وہ انٹرویو کیا ہوگا۔ گزارش کی گئی کہ وہاں تو ایسے پیشہ ورانہ قابلیت رکھنے والے لوگوں کی ضرورت ہے کہ جونہی کسی بیرونی مُلک کے معزز مہمان کی کار راج گھاٹ پر کھڑی ہوئی اور ان رونے والے ملازمین نے رونا شروع کر دیا۔ اس لیے اگر یہ نوجوان بھی ہم سب کے سامنے رو کر دکھا سکتا ہے تو سمجھیے کہ یہ ملازم ہو گئے۔ اب سردار صاحب نے قہقہوں اور سنجیدگی دونوں کا درمیانی راستہ اپناتے ہوئے اس سکھ نوجوان سے کہا کہ وہ رو کر دکھائے۔ اس سکھ نوجوان نے اپنے خاندان میں سب مرنے والوں کو باری باری یاد کیا اور کئی بار اس کے چہرے پر رقّت طاری ہونے کے بھی آثار نظر آئے مگر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوئے۔ نصف گھنٹے تک ہم سب بھی ماتمی فضا طاری کیے بیٹھے رہے مگر یہ سکھ نوجوان انٹرویو میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر طے پایا کہ اب دوسرے روز اس کے بارے میں کچھ سوچا جائے گا۔ سردار صاحب نے ہم سب کو کھانا کھلایا اور رات کے دس بجے یہ محفل

برخاست ہوئی۔

دوسرے دن ہم سب پھر اکٹھے ہوئے سردار صاحب نے اس سکھ نوجوان سے کہا کہ دیکھو بھئی پنڈت جواہر لال نہرو سے سفارش کر کے تمہیں کسی ملک میں ہندوستان کا سفیر بنوا سکتا ہوں مگر کسی بھی سفیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت ہونی چاہیے اور وہ یہ اہلیت رکھتی ہو کہ وہ ایک سفیر کی بیوی ہونے کی حیثیت سے دوسرے ملک کی حکومت کے سربراہوں سے اچھے رکھ رکھاؤ کا برتاؤ کر سکے۔ اس پر اس سکھ لڑکے نے کہا کہ اس کی بیوی میٹرک پاس ہے مگر بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ اور وہ خود انگریزی روانی سے نہیں بول سکتا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ یہ امیدوار اس آسامی کے لیے بھی اَن فٹ ہے۔

اگلے روز انٹرویو بورڈ میں مضطر ہاشمی (آل انڈیا ریڈیو) لالہ چرنجیت لال ایڈوکیٹ کا اضافہ ہو چکا تھا اور اس سکھ نوجوان کا معاملہ بڑی شدّومد سے پیش ہوا۔ لالہ چرنجیت لال ایڈوکیٹ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ وہ دہلی میں کس کے ہاں قیام پذیر ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بیچارا رات کو گوردوارہ سیس گنج میں سوتا ہے رات کا کھانا تو سردار صاحب کے ہاں کھا لیتا ہے اور دن کا کھانا کبھی گوردوارے سے ہی مل جاتا ہے اور کبھی یہ بازار سے کھا لیتا ہے اور اب اُس کے پاس صرف ایک روپیہ باقی رہ گیا ہے۔ سردار دیوان سنگھ نے اپنے کیش بکس کریم کریکر بسکٹ کے ڈبّے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس سکھ نوجوان کو دیا کہ وہ اسے اپنے اخراجات میں لائے اور دن کا کھانا بھی سردار صاحب کے ہاں کھا لیا کرے (حالانکہ سردار صاحب عام طور پر دن کا کھانا کھاتے ہی نہیں تھے مگر مہمانوں کو بازار سے منگا دیا کرتے تھے۔) سردار صاحب نے انتہائی سنجیدگی سے ممبرانِ انٹرویو بورڈ سے کہا کہ اس نوجوان کے لیے کوئی موزوں ملازمت کا جلد از جلد انتظام کیا جائے۔ اس پر مضطر ہاشمی نے بڑے مدبّرانہ انداز میں کہا سردار جی آپ اتنے بڑے اخبار کے ایڈیٹر ہیں آپ سے ساری حکومت کانپتی ہے مگر آپ نے کبھی سکھوں کے حقوق کا خیال ہی نہیں کیا۔ کیا وجہ ہے کہ اگر ہندوستان کا وزیر اعظم ہندو ہے تو پریذیڈنٹ سکھ کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اس نوجوان کو ہندوستان کا پریذیڈنٹ بنایا جائے اور محترم ڈاکٹر راجندر پرشاد سے گزارش کی جائے کہ وہ گاندھی جی کے پیروکار ہونے کی حیثیت سے از خود صدر کے عہدہ جلیلہ کو چھوڑ کر صداقت آشرم پٹنہ تشریف لے جائیں اور اپنی جگہ ان سردار صاحب کو ہندوستان کا صدر "دگھوشت" کر دیں۔ ہاشمی کی تجویز بڑی زوردار اور اس سلسلہ کو کئی دنوں تک جاری رکھنے میں معاون ہو سکتی تھی لہٰذا ہم سب نے اس تجویز کی پسندیدگی پر تالیاں بجائیں۔ اور کھانا کھانے کے بعد دوسرے دن شام کو اکٹھے ہونے کا پروگرام بنا کر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اگلی شام کو ایرانین ایمبیسی کے مرزا صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ ممتاز مرزا بھی شریکِ محفل ہوئے اور اس سکھ نوجوان کو ہندوستان کا صدر بنانے کی تجویز پر بڑی شدّومد سے غور ہوا۔ سردار صاحب نے کئی بار اس نوجوان سے کہا کہ دیکھو پریذیڈنٹ بن جانے کے بعد ہم کو نہ بھول جانا۔ دُنیا بڑی مطلب پرست ہے مطلب نکل جانے کے بعد تم بھی ہم کو نہیں پوچھوگے۔ اور یہ نوجوان ہاتھ جوڑ کر بار بار کہتا نہیں جی مَیں تہاڈا داس رہوں گا۔ بہرکیف دو چار دنوں کے بعد ایک درخواست کا مسوّدہ تیار کیا گیا۔ درخواست کیا تھی صدرِ مملکت کو کرسی صدارت خالی کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا تاکہ ان کی جگہ ایک بہتر صدر ہندوستان کو مل سکے جو ملک کی خدمت بہتر انداز میں کر سکے۔ یہ محضرنامہ جس پر ہم سب کے دستخط ثبت تھے لفافہ میں بند کر کے میرے حوالے کیا گیا کہ صبح بذریعہ رجسٹری صدرِ مملکت کے نام بھجوا دیا جائے۔ مَیں نے یہ محضرنامہ تو پسرد آتش کیا اور دوسری شام ڈاکخانہ کی ایک رسید جو کسی دوسرے رجسٹرڈ لیٹر کی تھی حاضرینِ محفل کو دکھا کر اپنی جیب

میں رکھ لی۔ ایک ہفتہ تک ہر روز اس سکھ نوجوان کی حماقتوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک ٹائپ شدہ خط جو سردار صاحب نے اپنے ٹائپسٹ سے کرایا تھا) ممبران انٹرویو بورڈ کو دکھایا گیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ آپ کا جائنٹ میمورنڈم موصول ہوا مگر افسوس ہے کہ اس پر عمل کرنا میرے احاطۂ اختیار میں نہیں ہے۔ چند منٹ اس خط پر ہر ممبر نے اظہار ناراضی کیا اور اس سکھ نوجوان ایسے موزوں اور مناسب اُمید دار صدارت کی حق تلفی پر اظہارِ افسوس کرنے کے بعد پھر غور و خوض شروع ہوا اور یہ طے پایا کہ اس نوجوان کے لیے کسی مملک کی سفارت ہی موزوں رہے گی اگر یہ اپنے حلیے کو ٹھیک کرے۔ اور بن ٹھن کر رہے اور کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لے تو سفارت کا ملنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ دوسری شام کو ہم تو موجود تھے مگر یہ سکھ نوجوان غیر حاضر تھا۔ اور اس کی غیر حاضری کئی دنوں تک مسلسل رہی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ اُسے بیوقوف بنایا جا رہا ہے لہٰذا وہ یا تو اپنے گاؤں چلا گیا ہے اور یا کہیں چھوٹی موٹی نوکری کر لی ہوگی۔ مگر تین ہفتوں بعد ہم نے دیکھا کہ شام کے وقت ایک نوجوان بہترین سوٹ میں ملبوس اُوپر آیا تو سردار صاحب نے غصّہ سے کہا کہ نیچے ٹھہرو تم بغیر اجازت کیسے اُوپر آ گئے۔ تو نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا آہو جی ہُن تسیں سانوں کیوں پہچانوں گے۔ اُس کی آواز سے ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ تم اتنے دن کہاں تھے اور تم نے یہ کیا کیا ہے۔ کیونکہ یہ نوجوان بال اور داڑھی صفا کر کے کلین شیو تھا۔ اور سوٹ میں واقعی آدمی ...... نظر آ رہا تھا۔ ہم سب دم بخود ہو گئے کہ اس نے یہ کیا کیا ہے۔ ماسٹر امیر چند کھنہ فرمانے لگے دیوان سنگھ تم دیکھ لینا کہ تمہارے دروازے پر گوردوارہ پربندھک کمیٹی والے دھرنا دیں گے کہ تیری وجہ سے ایک سکھ پتت ہو گیا ہے۔ مگر دیوان سنگھ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اُستاد تو واقعی گریٹ ہے۔ اور مجھے سفیر نہ بنانا ہندوستان کی بدقسمتی ہے۔ اچھا اب یہ بتا کہ کسی خوبصورت لڑکی سے شادی بھی کی ہے یا نہیں۔ اس پر یہ نوجوان سنجیدہ ہو کر کہنے لگا میں نے کوشش تو کی مگر میرے سالے اور سُسر نے کہا ہے کہ اگر تو نے دوسری شادی کی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے خیر یہ شام تو اس نوجوان سے بات چیت میں ہی کٹ گئی اور دوسری شام کو پھر اس مسئلہ پر غور کرنا ملتوی کیا گیا۔

دوسرے دن ہم سب تو وقت مقررہ ۷ بجے شام کو سردار صاحب کے ہاں پہنچے مگر یہ نوجوان پانچ بجے کے بعد ہی سردار صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہو گیا تو اتفاق سے بیگم شاہدہ نکہت سردار صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائی ہوئی تھیں۔ چپراسی نے اس نوجوان کو نیچے برآمدے میں بٹھا دیا۔ جب بیگم صاحبہ واپس جانے کے لیے نیچے آئیں تو انھوں نے ایک بھرپور نظر اس نوجوان پر بھی ڈالی۔ کچھ دیر بعد سردار صاحب نے چپراسی کو آواز دے کر کہا کہ اس نوجوان کو اُوپر بھیج دے۔ دو چار اِدھر اُدھر کے کام سردار صاحب نے اس نوجوان کو بتائے اور جونہی ماسٹر امیر چند کھنہ۔ میں اور مضطر ہاشمی سردار صاحب کے ہاں پہنچے تو انھوں نے ہم سب کو تمام واقعہ سُنایا کہ انھوں نے بیگم شاہدہ نکہت سے کہہ دیا تھا کہ نیچے جاتے ہوئے برآمدے میں بیٹھے نوجوان کو کچھ ایسی نگاہِ کافرانہ سے دیکھیں کہ اُس کو حماقت کی آخری حدوں تک غلط فہمی ہو جائے۔ چند منٹ بعد یہ نوجوان بھی سردار صاحب کے کام کر کے واپس آ گیا۔ سردار صاحب گوشت بھونتے بھونتے فرمانے لگے کہ صاحبان میں نے آج اس لڑکے کی سب سے بڑی پرابلم حل کر دی ہے اور تفصیل بتاتے ہوئے فرمانے لگے کہ آج بیگم شاہدہ نکہت تشریف لائی تھیں تو میں نے اُن سے کہا کہ ایک بہت ہی خوبصورت اور نوجوان لڑکا نیچے برآمدہ میں بیٹھا ہے اور وہ بہت جلد ایمبیسیڈر بننے والا ہے لہٰذا اگر تم اس سے شادی کر لو تو مزے میں رہو گی۔ تم نیچے جاتے ہوئے برآمدہ میں لڑکے کو دیکھتی جانا اور اگر یہ تجویز پسند ہو اور لڑکا بھی پسند ہو تو فون کر دینا تاکہ شام کو میں لڑکے سے بات پکّی کر دوں۔

یہ سُننا تھا کہ اس لڑکے کے دِل و دماغ میں زلزلہ آگیا۔ بیگم صاحبہ نے واقعی جاتے ہوئے اُسے عجب انداز سے دیکھا تھا اور اُس زمانے میں تو بڑے بڑے دانشور یہ حسرت دلوں میں دبائے پھرتے تھے کہ بیگم صاحبہ ایک بار اُنھیں پلک اُٹھا کر دیکھ ہی لیں تاکہ ان بیچاروں کی عاقبت سُدھر جائے چہ جائیکہ بیگم صاحبہ نے نگاہ غلط انداز کا بھرپُور وار اس نوجوان پر کیا تھا۔ خوشی کی فراوانی سے لُکنت زدہ لہجہ میں یہ نوجوان کہنے لگا مہاراج جے ادبی بی میرے نال ویاہ کرن نوں تیار ہو دے تاں ل پنڈ جا کے اپنے حصے دی زمین دیچ کے دھوم دھام نال آنند کارج کراں گا۔ سردار صاحب گوشت پکاتے پکاتے کبھی مُلازم کو کسی فروگذاشت پر بھاری بھرکم گالی دیتے تو کبھی اس نوجوان کو کوئی چیز لانے کے بہانے نیچے بھیج کر ہم سب سے کہتے کہ اس مذاق کا آخر کیا ہوگا۔ نیز اس اسٹوری کو آگے کس طرح بڑھایا جائے۔ سردار صاحب اس مذاق کے THE END کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی سردار صاحب نے ریسیور اُٹھایا تو معلوم ہُوا کہ فون بیگم صاحبہ کا ہے۔ اور اُنھوں نے تہقہوں کی بارش میں اس نوجوان سے شادی کرنا منظور فرمایا تھا۔ بس پھر کیا تھا سب نے اس نوجوان کو مبارکباد دی سردار صاحب نے پانچ روپیہ کا نوٹ ڈبّے سے نکال کر اس نوجوان کو دیا کہ مٹھائی لا کر بانٹے۔ رات کا کھانا کھا کر خوشی خوشی ہم سب اپنے اپنے گھروں کو اور نوجوان گوردوارہ سیس گنج کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک شادی کی تیاریوں کی بات چیت چلتی رہی کہ انتظامات کی ذمہ داری کون لے۔ شادی کے اخراجات کا اندازہ کئی ہزار روپیہ کا تھا۔ اور یہ تخمینہ ایسا کہ اس نوجوان کے اپنے حصے کی تو کیا اگر وہ اپنے خاندان کی بھی زمین فروخت کرے تو بھی کم رہے۔

سردار صاحب کا مُلازم ریاست بھاول پور کا ایک شرنارتھی تھا وہ یہ ڈرامہ روزانہ دیکھتا تھا۔ ایک دن اُس نے اس نوجوان کو رازدارانہ انداز میں بتایا کہ تجھے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ نہ معلوم کتنے بیوقوفوں کو یہاں ایمبیسڈر۔ صدر اور نائب صدر بنایا گیا ہے۔ تم یا تو اپنے گاؤں لوٹ جاؤ یا کہیں نوکری کر لو۔ ایک دن صبح سویرے یہ نوجوان میرے مکان پر آیا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا سردار صاحب سچ سچ بتا نا کہ میرے ساتھ مذاق ہو رہا ہے یا واقعی میری شادی اس بی بی کے ساتھ ہو جائے گی اور میں ایمبیسڈر بن جاؤں گا ـــــ میں نے اُسے بڑے پیار سے کرسی پر بٹھایا بیوی سے چائے لانے کو کہا اور اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں یہ شک کیوں کر ہُوا ہے تو اس نے بتایا کہ سردار صاحب کے نوکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میری بیوی بھی اس کی باتیں سُن کر مسکرا رہی تھی میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا کہ آج شام کو اس سلسلہ میں سردار صاحب کے نوکر کے سامنے سب باتیں ہوں گی۔ شام کو میں نے "ریاست کلب" کے جملہ اعزازی اراکین کے سامنے یہ معاملہ رکھا تو سردار صاحب نے اپنے ملازم کو ایسی ایسی گالیاں دیں کہ لُغات میں ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکیں گی اور پھر قہقہوں کا سیلاب تھا کہ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔ اب جب یہ معاملہ ختم ہی ہو گیا تھا تو سردار صاحب نے اس نوجوان کو سردار سرُدول سنگھ کولیشر کے ہاں ملازم کرا دیا اور ہم لوگ کسی نئے شکار کا انتظار کرنے لگے۔

■■

اگر سوانح نگاری عمدہ طریقہ پر لکھی جائے
اور اس کا مقصد کسی ایسی شخصیت کی پیشکش
ہو جس میں چھوٹے عام اور نجی دونوں طرح
کے اعمال کا امتزاج ہو تو یہ لازمی طور پر
ایک زیادہ سچی اور دلچسپ پیش کش ہوگی۔

—— بیکن

بحوالہ اردو میں سوانح نگاری
مصنف سید علی شاہ

مولوی صاحب

بنام شاہِ ایران

طباعت : سیما آفسیٹ پریس، دہلی
جلد ساز : یونیورسل بک بائنڈنگ کمپنی، کوچہ ناہر خاں، دریا گنج، دہلی
اسکرین : اسکرینڈ، پرموڈی ہاؤس، دریا گنج، دہلی
طباعت سرورق : رتن دیپ پریس، کوچہ چیلاں، دریا گنج، دہلی

ناشر : ودیا پرکاش سرور تونسوی
فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تقسیم کار : ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت :
ایک سو روپے

ایک دراز ریش مولوی صاحب کو مولوی سمیع اللہ صاحب قاسمی (مرحوم) مالک کتب خانہ عزیزیہ اُردو بازار دہلی نے سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں بھجوایا اور تعارفی خط میں لکھا کہ مولوی صاحب فارسی کے عالم ہیں۔ چونکہ شاہ ایران (افسوس کہ شاہ اب سابق شاہ ہو کر رہ گئے ہیں) معہ ملکہ ثریا (افسوس کہ اس ملکہ نے اس قابلِ احترام اعزاز کو پلید کر دیا) ہندوستان تشریف لا رہے ہیں۔ چونکہ آپ کے تعلقات سفارت خانہ ایران کے سکریٹری جناب اخلاق مرزا سے دوستانہ ہیں اُن سے کہہ کر مولوی صاحب کا منظوم نذرانۂ عقیدت شہنشاہِ ایران کی خدمت میں پیش کرا دیجیے۔

سردار صاحب نے مولوی سمیع اللہ صاحب کا یہ خط پڑھا تو ایک بھرپور نگاہ مولوی صاحب پر ڈالی۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کی چھٹی حس نے چٹکی لی اور سردار صاحب نے فاتحانہ قہقہہ لگاتے ہوئے چپراسی کو آواز دی اور حکم دیا کہ سردار صاحب کے یہاں جاؤ اور اسی وقت اپنے ساتھ لے کر آؤ۔

بے وقت سردار صاحب کی طرف سے بلاوا آنے کے دو ہی مقصد ہوا کرتے تھے۔ مالی پریشانی یا کوئی ایسا مُرغا پھنس گیا ہے جس سے کچھ شامیں پُر لطف گذر سکیں گی۔ چپراسی سے پوچھا کہ سردار صاحب اکیلے تھے یا کوئی اور بھی موجود تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایک مولوی اُن کے پاس بیٹھے ہیں اور سردار صاحب زور زور سے ہنس رہے تھے۔ (حالانکہ سردار صاحب نے زندگی بھر آہستگی سے نہیں ہنسا!) چپراسی کی اس نشان دہی نے واضح کر دیا تھا کہ معاملہ گمبھیر نہیں بلکہ پُر لطف ہے۔ سردار صاحب کے حکم کی تعمیل فوری کی گئی۔ دیکھا تو سردار صاحب اور مولوی صاحب دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سردار صاحب نے میرا تعارف مولوی صاحب سے اس انداز سے کرایا کہ جیسے شاہِ ایران محض میرے مشورہ سے مولوی صاحب کو لاکھوں روپے انعام کے طور پر بخش دیں گے۔ سردار صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ اپنا فارسی میں کہا ہوا منظوم عقیدت نامہ مجھے دکھائیں۔ مولوی صاحب نے جھٹ تھیلے سے معمولی سے فریم میں جڑا ہوا منظوم عقیدت نامہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے بظاہر بڑے غور کے ساتھ اُس عقیدت نامہ کو پڑھا۔ اشعار بے وزن، فارسی اس قدر غلط کہ مجھ ایسا غیر فارسی داں بھی مولوی صاحب کی اس "فارسی دانی" پر زیرِ لب مُسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں نے سردار صاحب سے مخاطب ہو کر گزارش کی کہ سردار صاحب اول تو اس عقیدت نامہ کا فریم سیاہ رنگ کا ہے جو بد شگونی ہے۔ اس لیے فریم سنہری اور قیمتی ہونا چاہیے۔ دوسرے مولوی صاحب نے جو فارسی لکھی ہے کوئی بھی ایرانی نژاد سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ اس لیے اگر منظوم کی بجائے نثر میں عقیدت نامہ پیش کیا جائے تو بہتر رہے گا اور نثری عقیدت نامہ جناب مرزا صاحب یا اُن کی بیگم ممتاز مرزا صاحبہ

سے لکھوایا جائے کیونکہ وہ جدید فارسی میں ہوگا۔ جسے اعلیٰ حضرت اور ملکۂ عالیہ پسند فرمائیں گے۔ سردار صاحب نے فرمایا کہ مرزا صاحب کو فون کرو۔ آج شام کو مرزا صاحب مع مرزانی (ممتاز مرزا سے معافی کے ساتھ) تشریف لائیں اور سخت تاکید کردو کہ ضرور آئیں اور کھانا بھی یہیں کھائیں۔ مرزا صاحب کو فون کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ مولوی صاحب شام کو سات بجے تشریف لے آئیں تاکہ اس معاملے پر پوری کیبنٹ غور کر سکے۔

شام کو کلب کے سب ممبران جمع ہوئے تو مولوی صاحب کا معاملہ زیر غور آیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ نذرانۂ عقیدت میں ردّوبدل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو مولوی صاحب کے جذباتِ دلی کا اظہار ہے۔ اس میں اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔ شاہ مولوی صاحب کی دلی عقیدت کو دیکھیں گے تاکہ زبان دانی یا فریم کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ شاہ پرسوں تشریف لا رہے ہیں۔ اگلے روز جمعۃ العلماء ہند انھیں عصرانہ دے رہی ہے۔ بہتر ہے کہ مولوی صاحب اس تقریب میں عقیدت نامہ پیش کریں۔ اس پر سردار صاحب نے کہا کہ مرزا جی کیا غضب فرما رہے ہیں آپ۔ وہ کانگریسی مولوی انعام کا سارا روپیہ خود کھا جائیں گے اور ان مولوی صاحب کو کچھ نہیں دیں گے۔ ان کا تو الگ سے معاملہ کرائیے۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ اچھا نماز جمعہ کے بعد اعلیٰ حضرت سفارت خانۂ ایران تشریف لائیں گے۔ ان کو وہاں بھجوا دیجیے گا تو کوشش کی جائے گی کہ مولوی صاحب اعلیٰ حضرت کی خدمت عالیہ میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر سکیں۔ چار دنوں تک مولوی صاحب کو خوب خوب تفریح طبع کا نشانہ بنایا گیا۔ آخر جمعہ کے دن مولوی صاحب ایرانی سفارت خانہ پر تشریف لے گئے تو وہاں پولیس والوں نے انھیں سفارت خانہ کے نزدیک نہ آنے دیا۔ مولوی صاحب چلاتے رہے اور فریم شدہ نذرانۂ عقیدت پولیس والوں کو دکھاتے رہے۔ مگر پولیس والوں نے مولوی صاحب کو پاگل سمجھ کر سفارت خانہ سے دو سو گز تک دُور رکھا۔ شام کو جب ہم سردار صاحب کے یہاں پہنچے تو مولوی صاحب کی بدحواسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ مرزا صاحب پر سخت برہم تھے اور یہ راز اشارۃً فرما رہے تھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا فائدہ ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔ مرزا صاحب کو حسد ہو گیا کہ اس مولوی کو اعلیٰ حضرت انعام واکرام سے نوازیں گے۔ اس پر سردار صاحب نے چٹکی لی اور کہنے لگے مولوی صاحب آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ ابھی مرزا صاحب آتے ہی ہوں گے۔ آج ان سے یہ بات کریں گے کہ وہ انعام دلا دیں۔ پچیس فیصد ان کو کمیشن دے دیا جائے گا۔ ماسٹر امیر چند کھنہ فرمانے لگے سردار جی پچیس فیصدی کم ہے نصف رکھیے تو مرزا صاحب لالچ کے زیر اثر انعام دلائیں گے بھی اور انعام کی رقم بھی زیادہ سے زیادہ کرانے کی کوشش فرمائیں گے۔ اس تجویز کو ہم سب نے پسند کیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مرزا صاحب مع ممتاز مرزا صاحبہ تشریف لائے تو سردار صاحب نے انھیں پہلے تو بناوٹی طور پر غصہ سے کہا کہ دیکھیے مرزا صاحب آپ نے ہمارا بھی خیال نہیں رکھا۔ مولوی صاحب سفارت خانہ پر گئے اور آپ ان کو باہر لینے تک نہیں آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والوں نے انھیں سفارت خانہ سے ایک فرلانگ تک دُور رکھا اور یہ دھکے کھا کر واپس آ گئے۔ مرزا صاحب نے پہلے تو رُواں دُواں فارسی بولتے ہوئے مولوی صاحب پر اپنی فارسی دانی کا سکہ جمایا اور پھر کہنے لگے کہ ہم اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری کے انتظامات میں مصروف تھے۔ وہاں مولوی صاحب کا کسے ہوش تھا۔ خراب فرمائیے کیا حکم ہے کیونکہ اعلیٰ حضرت کل صبح آگرے تشریف لے جا رہے ہیں اور پرسوں بمبئی تشریف لے جائیں گے۔

سردار صاحب نے فرمایا ہم کچھ نہیں جانتے۔ آپ تو یہ کیجیے کہ مولوی صاحب کا نذرانۂ عقیدت۔ لے جائیے

بَاسَٹھ

اور اعلیٰ حضرت کو پیش کر دیجئے، اور جو بھی وہ انعام دیں نصف آپ کا اور نصف مولوی صاحب کا۔ اس پر ایک نعرہ پسندگی کا لگا اور مرزا صاحب نے یہ پیش کش اس انداز میں قبول فرمائی کہ نصف انعام مولوی صاحب کا اور نصف رقم مشترکہ طور پر کھانے پینے کے پروگرام میں صرف ہوگی۔

مولوی صاحب نے فریم شدہ نذرانۂ عقیدت مرزا صاحب کو تھمایا تو مضطر ہاشمی صاحب فرمانے لگے ع
سُپردم بتو مایۂ خویش را۔ اعلیٰ حضرت واپس ایران بھی پہنچ گئے۔ مولوی صاحب ہر شام کو سردار صاحب کے ہاں حاضر باش شاگرد کی طرح عین وقتِ مقررہ پر آجاتے اور مطالبہ کرتے کہ مرزا صاحب کو بلایئے مگر مرزا صاحب کا کہیں پتہ نہیں۔ سب نے بڑے رازدارانہ طور پر مولوی صاحب کو بتایا کہ مرزا صاحب نے اعلیٰ حضرت سے انعام کی رقم تو لے لی اور اب وہ آپ کو کچھ دینا نہیں چاہتے۔ اس لیے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ جب چار پانچ روز تک مرزا صاحب تشریف نہیں لائے تو سردار صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ مرزا صاحب کے مکان پر چلے جایئے۔

مرزا صاحب کی رہائش سفارت خانہ میں ہی تھی۔ دوسرے دن مولوی صاحب مرزا صاحب کے یہاں گئے تو انھوں نے اُن سے وعدہ کیا کہ آج شام کو وہ ضرور سردار صاحب کے ہاں آئیں گے۔ شام کو مرزا جی آئے تو مولوی صاحب کا نذرانۂ عقیدت اُن کے ہاتھ میں تھا جسے انھوں نے واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ اعلیٰ حضرت سے بات ہی نہ ہو سکی اس لیے اب یہی طریقہ مناسب رہے گا کہ یہ عقیدت نامہ بذریعہ ڈاک اعلیٰ حضرت کو بھجوا دیا جائے۔ مولوی صاحب کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا اور وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں تھے۔ سردار صاحب نے فوراً اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے مجھے حکم دیا کہ یہ عقیدت نامہ کل بذریعہ رجسٹرڈ پارسل اعلیٰ حضرت کو ایران بھجوا دیا جائے۔ میں نے جملہ حاضرینِ محفل کی خدمت میں گذارش کی کہ فریم شدہ عقیدت نامہ پارسل کرنے میں دقت آئے گی۔ صرف کاغذ پر لکھا ہوا عقیدت نامہ لفافہ میں رجسٹرڈ پوسٹ ایرمیل سے بھجوا دیا جائے۔ مرزا صاحب نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور فریم میں سے نذرانۂ عقیدت جو مولوی صاحب نے خود کتابت کیا ہوا تھا نکالا گیا اور اسی وقت ایک لفافہ میں بند کر کے سردار صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا کل دفتر کھلنے پر پوسٹ کر دیا جائے گا۔

مولوی صاحب ایک ماہ تک مزید تفریح کا سامان بنتے رہے۔ آخر جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا تو سردار صاحب نے مولوی صاحب سے رازدارانہ انداز میں کہا کہ میرے خیال میں شاہ ایران نے روپیہ بھجوا دیا ہے مگر مرزا صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا ہوگا۔ دو چار دنوں تک مولوی صاحب کے دل میں یہ بات بٹھانے رہنے سے مولوی صاحب اچھی طرح سے مرزا صاحب سے بدظن ہو چکے تھے۔ لہٰذا ایک شام کو جونہی مرزا صاحب تشریف لائے تو انھوں نے مرزا صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ دیکھیے صاحب میرا انعام تو شاہ ایران نے بھجوا دیا ہے مگر آپ نے اُسے دبا رکھا ہے۔ کیونکہ شاہ ایران نے تو اپنے سفیر ہی کو لکھا ہوگا کہ مولوی صاحب کو اتنی رقم انعام میں دے دیجیے۔

اب مرزا صاحب جس قدر اپنی صاف نیتی کا ثبوت دے رہے ہیں مولوی صاحب کو اُن کی بددیانتی کا اتنا ہی زیادہ یقین ہو رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولوی صاحب ایک دم جلال میں آگئے۔ اور کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ میں پولیس میں رپورٹ درج کراؤں گا اور سفیر ایران کے پاس جاؤں گا اور مرزا صاحب کی شکایت کروں گا کہ انھوں نے میرا انعام کھا لیا ہے۔ بس پھر کیا تھا کہ سردار صاحب کے قہقہے تھے کہ سارا محلہ سُن رہا تھا اور مرزا صاحب کہہ رہے تھے۔ سردار صاحب اس بیچارے کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اب اُسے مزید اُلو نہ بنایئے۔ جب سردار صاحب

ترسیٹھ

مقوئ دل ودماغ قہقہے لگا چکے تو مولوی صاحب سے مُخاطب ہو کر کہنے لگے۔ معاف کیجیے، مولوی صاحب یہ سارا ڈرامہ تھا۔ مرزا صاحب ایسے معزز دوست پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ میں نے مذاق کو جاری رکھنے کے لیے آپ کو مرزا صاحب کے بارے میں مشکوک نظریہ قایم کرنے کی رائے دی۔ سردار صاحب نے ایک سو روپیہ مولوی صاحب کو نذر کیے اور کہا کہ آپ بھی معاف فرمائیے گا۔ یہ ایک سو روپیہ میری طرف سے انعام لیجیے۔ پھر مولوی صاحب سردار صاحب کے ہاں تشریف نہیں لائے اور ہم سب کسی نئے شکار کا انتظار کرنے لگے۔

"زندگی میں ایسا موقع ضرور آتا ہے جب ہم
آپ بیتے ہوئے زمانے کی دھوپ چھاؤں سے
گزرنے کی کوشش کرتے ہیں بغیر اس خیال کے
کہ اس سیر سے کیا حاصل ہوگا۔"

——— محمد احمد سعید خاں چھتاری
یادِ ایام

سُوامی پارس ناتھ

۱۹۵۰ء کے شروع میں ایک سوامی جی سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں تشریف لائے اور انھوں نے حضرت احمق پھپھوندوی کا ایک خط سردار صاحب کے حوالے کیا جس میں احمق صاحب نے لکھا تھا کہ رقعہ حامل سوامی پارس ناتھ جی ہندوستان کے صدر بننے کے حق دار ہیں۔ آپ دہلی میں رہتے ہیں ان کے لیے کوشش فرمائیے تاکہ یہ صدر جمہوریۂ ہند بن سکیں۔

گرمی کا موسم تھا سردار صاحب کے ہاں محفل کا آغاز آٹھ بجے شروع ہوتا تھا۔ حسب معمول پوری پارٹی اکٹھی ہوئی تو سردار صاحب نے سوامی پارس ناتھ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ کہ سوامی جی بہت بڑے شاعر ہیں جوانی میں انھوں نے ایک مشہور ہندی شاعرہ کو بغیر دیکھے اپنا دل اُن پر فدا کر دیا اور آج تک اس انتظار میں ہیں کہ شاید اُس شاہدِ رعنا تک ان کی رسائی ہو سکے جب کہ ان کی محبوبہ اس وقت پچاس سال کا پُر بہار عرصۂ حیات گزار چکی ہے۔ اور غالباً نصف درجن بچوں کی ماں بھی ہیں۔ سردار صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ سوامی کا خیال ہے کہ موجودہ صدرِ محترم ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب ہندوستان ایسے مُلک کی صدارت کے اہل نہیں ہیں اگر سوامی جی صدرِ جمہوریہ ہند بن جائیں تو مُلک کی کایا ہی پلٹ دیں۔ لہٰذا ہم سب کا فرض ہے کہ سوامی جی کو ہندوستان کا صدر بنائیں اس لیے حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی تاکہ وہ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو سے کہیں کہ ڈاکٹر راجندر بابو کو صدارت سے ہٹا کر سوامی جی کو صدر بنایا جائے۔ سردار صاحب اپنے آپ ہی قہقہے لگاتے ہوئے سلسلۂ تقریر جاری نہ رکھ سکے تو ہم سب نے تالیوں سے سوامی جی کا خیر مقدم کیا۔

ماسٹر امیر چند کھنہ فرمانے لگے کہ سب سے پہلے سوامی جی سے ان کا کلام سُنا جائے یہ کہنے کی دیر تھی کہ سوامی جی فرمانے لگے کہ میرے ہر شعر میں ایک لفظ راجہ یا رانی ہوتا ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ارشاد ارشاد اور سوامی جی فرمانے لگے سنیئے ایک شعر "صنم کے ابرُو" عنوان سے کہا ہے ؎

نظر کو زہر سمجھے اور ابرُو اک کٹارا ہے
نظر سے جو نہ مر جائے اُسے ابرُو نے مارا ہے

داد بھی کہ پڑوسیوں نے دیواروں سے اُچک اُچک کر دیکھنا شروع کر دیا۔ سوامی جی فرمانے لگے کہ اس شعر میں ابرُو راجہ ہے۔

اس کے بعد سوامی جی فرمانے لگے کہ اس شعر کا عنوان ہے "گوُمُوتر"۔ سُنیئے ارشاد فرماتے ہیں۔

؎۔

سرسٹھ

ایک ہزار بیماریاں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں
دوا سب کی ایک ہے "گئو موتر" پینا چاہیے

داگر مرار جی ڈیسائی کی دریافت "آب حیات" کا ظہور اس وقت ہوا ہوتا تو اس سلسلے میں سوامی پارس ناتھ یقیناً مرارجی بھائی کو شکست دے جاتے

اس شعر پر بھی داد حسبِ سابق دل کھول کر دی گئی تو سوامی جی اپنے کلام بلاغت نظام کو گا کر سنانے لگے جس سے پڑوسیوں نے سیڑھیاں لگا کر یا چارپائیوں پر کھڑے ہو کر دیواروں سے جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ سوامی جی زمار ہے ہیں۔ ؎

دمہ گرمی سے گر ہووے تو نسخہ ایک ملتا ہے
صبح شبنم کے پینے سے دمہ کا دم نکلتا ہے

سوامی جی نے بتایا کہ اس شعر میں دم راجہ ہے اور اگلا شعر بھی ترنم سے عطا ہوا ہے۔ ؎

سمجھ اپنی سے دنیا میں ہر اک انسان لق لق ہے
خدا کی نظر میں لیکن ہر انسان احمق ہے

کھانے تک سوامی جی کا کلام خوب سنا گیا اور جی بھر کے سب نے داد دی۔ سردار صاحب نے تجویز رکھی کہ سب سے پہلے سوامی جی کا مجموعۂ کلام شائع کیا جائے اور اس مجموعہ کے لیے ملک کے بڑے بڑے لیڈروں اور شاعروں سے آرار طلب کی جائیں اور جب یہ مجموعہ چھپ جائے تو اسے سوامی جی کے اس بیان کے ساتھ کہ میں ہندوستان کا صدر کیوں بننا چاہتا ہوں۔ ہر ممبر پارلیمنٹ اور حکومتِ ہند کے ہر وزیر کے پاس بھجوایا جائے۔ ماسٹر امیر چند کھنہ اور آل انڈیا ریڈیو کے مضطر ہاشمی فرمانے لگے کہ مجموعۂ کلام کا نام کیا رکھا جائے۔ راقم الحروف کا تجویز کردہ نام "دیوارِ قہقہہ" قرار پایا اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپی گئی اور یہ بھی طے پایا کہ یہ مجموعہ جشنِ آزادی کے موقع پر ۱۵ اگست کو ریلیز کیا جائے۔

ہر شام کو سوامی جی تفریح کا سامان مہیا کرتے اور سوامی جی کی شہرت کے باعث سردار صاحب کے ہاں شام کو ایک خاصا مجمع لگ جاتا جس کی خاطر مدارات سردار صاحب بخوشی فرماتے مگر سوامی جی کی شہرت نے ایسا زور پکڑا کہ روزانہ بن بلائے مہمانوں کا ریلا سردار صاحب کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کو بھی اکھرنے لگا۔ مگر قدرت کو سردار صاحب کی مہمان نوازی کی شان کو برقرار رکھنا منظور تھا کہ سوامی جی نے از خود جمنا پار کسی مندر میں کوئی چلہ کاٹنے کے لیے عارضی رہائش اختیار کر لی اور سوامی جی کے مداحوں کی تعداد صرف وہی رہ گئی جو ان کے دہلی میں ورودِ مسعود کے وقت تھی۔

۱۵ اگست ۱۹۵۰ء کو سوامی پارس ناتھ کا مجموعۂ کلام "دیوارِ قہقہہ" پوری تابانی کے ساتھ شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ گیا تو سردار صاحب نے اس نادرِ روزگار دیوان کو ریلیز کرنے کے لیے ایک جامع پروگرام بنایا۔ اور دوستوں کی زبانی یہ پروپیگنڈہ کرایا گیا کہ سوامی پارس ناتھ کے دیوان کی رسمِ اشاعت کی کارروائی ریڈیو سے نشر ہو گی اور اکابرینِ ملک کے پیغاماتِ تہنیت بھی ریڈیو پر سنائے جائیں گے۔ یہ خبر دلی کے باذوق حضرات تک کسی نہ کسی طرح پہنچا دی گئی۔ سردار سردول سنگھ کو یشر کے ہاں سے سردار دیوان سنگھ مفتون نے ورزش کی مشین منگائی جس کے بارے میں سوامی جی کو بتایا گیا کہ یہ براڈکاسٹنگ کی مشین ہے۔ تاریخ مقررہ پر دفتر ریاست میں زندہ دلانِ دلی کا اجتماع ہر کسی کو زعفران زار بنائے ہوئے تھا۔ حارات کے پورے آٹھ بجے یہ کارروائی شروع ہوئی۔ مولوی سمیع اللہ قاسمی کو کرسیِ صدارت پر

بٹھایا گیا۔ مضطر ہاشمی کو اناؤنسر کے فرائض انجام دینے کے لیے مقرر کیا گیا۔ بجلی کی ایک تار کو ورزش کی مشین سے باندھ کر چھت پر ریڈیو کے ایریل کے تار کے ساتھ گانٹھ دیا گیا۔ ورزش کی مشین کے سامنے ایک کرسی پر سوامی جی کو بٹھایا گیا اور ان کے گلے میں حاضرین نے پھولوں کے ہار ڈالے اور مضطر ہاشمی نے بجلی کا ایک قمقمہ رسّی سے باندھ کر ورزش کی مشین سے باندھ دیا اور اُس قمقمے کو ہاتھ میں تھمائے مائیک کا کام لیتے ہوئے فرمانا شروع کیا۔ حضرات یہ تمام دُنیا کے رہنے والوں کے لیے عزّت کا مقام ہے کہ آج سوامی جی کا دیوان دیوارِ قہقہہ کی رسم اجرا کی جا رہی ہے۔ یہ مجموعہ ایسی بیش بہا تصنیف ہے کہ دُنیا کی ہر مصیبت کا علاج اِس کتاب سے ہو سکتا ہے۔ حضرات اس بیش بہا تصنیف کی رسم اجرا، ہندوستان کے مشہور صحافی سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست فرمائیں گے۔ دیوارِ قہقہہ کی ایک جلد سنہری کاغذ میں لپٹی ہوئی جو ایک خوشنما دھاگے سے بندھی ہوئی تھی سوامی جی نے سردار صاحب کے دستِ مبارک میں دی اور انھوں نے اس بند پیکٹ کو کھولتے ہوئے کتاب کا اجرا فرمایا۔ اور اس کے ساتھ ہی سب حاضرین نے پُرجوش تالیوں سے سوامی جی کو مبارکباد پیش کی اور سوامی کی لمبی ناک اور بھی بڑھتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اب مضطر ہاشمی نے بجلی کا قمقمہ جو محض ایک سوتی رسّی سے بندھا ہوا تھا سوامی جی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اعلان کیا کہ دُنیا کے رہنے والو اب ہندوستان کی صدارت کے امیدوار سوامی پارس ناتھ جی کا کلام بلاغت نظام اُن کی زبان مبارک سے سُنیئے۔ سوامی جی نے پہلا شعر ہی پڑھا تھا کہ مضطر صاحب کو مخاطب کر کے سوامی جی کہنے لگے کہ یہ بلب تو کرنٹ مار رہا ہے بس ہنسی کا ایک طوفان تھا کہ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔ سردار دیوان سنگھ کا تو ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ جب ہنسی کا زور کم ہوا تو مضطر صاحب نے مُلازم سے پانی کا ایک گلاس منگایا اور اس رسی کو بھگو دیا جس سے بجلی کا بلب بندھا ہوا تھا اور سوامی جی سے کہا کہ اب یہ بلب کرنٹ نہیں مارے گا آپ کلام شروع رکھیے۔ سوامی جی نصف گھنٹے تک کلام سُناتے رہے تو مضطر صاحب نے انھیں پانی کا ایک گلاس پیش کیا جسے سوامی جی ایک ہی سانس میں پی گئے اور کہنے لگے کہ یہ مشین سانس کو کھینچتی ہے۔ پھر ہنسی کا ریلا ہے کہ تھمنے میں نہیں آ رہا۔ جب ہنسی کچھ رُکی تو مضطر صاحب نے اعلان فرمایا کہ اب سوامی جی تقریر فرمائیں گے اور یہ بتائیں گے کہ انھیں ہندوستان کا صدر کیوں بنایا جائے۔ بس پھر کیا تھا سوامی جی نے جو کچھ بھی ان کی مرضی تھی اوّل جلوسِ تقریر کی اور یہ یادگاری پروگرام ختم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ سردار صاحب کے ہاں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو بھی ٹیلیفون آ رہا ہے سوامی جی کو مبارکباد دے رہا ہے کہ ابھی ریڈیو پر پروگرام سُنا ہماری طرف سے سوامی پارس ناتھ کو مُبارک باد پہنچا دیجیے۔ اس پر سردار صاحب نے سوامی جی کو ہی ٹیلیفون کے نزدیک بٹھا دیا تاکہ جو بھی ٹیلیفون آئے وہ خود ہی سُنیں۔ پری پلان کے مُطابق رات کے دس بجے تک پندرہ سولہ ٹیلیفون آتے رہے اور سوامی جی اپنے اس کامیاب پروگرام پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ دو تین دنوں کے بعد قریب و دور انیز بڑے بڑے شہروں سے خطوط آنے شروع ہو گئے جس میں سوامی جی کو اتنے شاندار پروگرام پر مبارک باد دی گئی تھی یہ سب کچھ سردار صاحب کا ترتیب دیا ہوا پری پلان تھا۔ سوامی جی بازار میں نکلے تو طے شدہ اسکیم کے تحت دو چار افخاص انھیں مبارکباد دیتے۔

اس دوران ہم سب نے مل کر سوامی جی کا وہ بیان ترتیب دیا جو انھوں نے ممبران پارلیمنٹ اور وزرائے ہند کو اپنے دیوان کے ساتھ بھجوانا تھا۔ سردار صاحب نے اس بیان کا انگریزی ترجمہ کیا اور اُسے بہترین انداز میں چھپوایا گیا اور سردار صاحب نے آناً فاناً سوامی جی کی جناب راجندر بابو صدر جمہوریۂ ہند سے مُلاقات کا وقت بھی

مقرر کرادیا۔

سوامی جی راشٹرپتی بھون پہنچے تو محترم راجندر پرشاد جی کو آپ نے اپنا مطبوعہ بیان دیا جسے راشٹرپتی صاحب نے بغور پڑھا اور جب آخر میں اُنھوں نے یہ پڑھا کہ حضرت ان کی جگہ راشٹرپتی بننے کے اُمیدوار ہیں تو وہ بھی ہنس دیئے اور فرمانے لگے سوامی جی مجھے تو اس ذمہ داری پر بنے رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے مگر بھارت نواسیوں نے مجھے یہ سیوا سونپ رکھی ہے جب بھی مجھے بھارت نواسی حکم دیں گے میں یہ پدوی چھوڑ دوں گا۔ آپ جواہر لال جی مولانا آزاد صاحب اور دوسرے لیڈروں سے ملیے میں ہر وقت یہ جگہ چھوڑنے کو تیار ہوں۔ سوامی جی کہنے لگے کہ راشٹرپتی جی آپ بھارت کے کرشی منتری (وزیر زراعت) بھی رہے ہیں یہ تو بتایئے کہ جَو کی دھرم پتنی کو کیا کہتے ہیں۔ راشٹرپتی اس استفسار کا جواب سوائے مسکراہٹ کے کیا دے سکتے تھے۔ اس پر سوامی جی فرمانے لگے جبھی تو میں کہتا ہوں کہ وزیروں کو وہ محکمے دیئے جائیں جن کا ان کو پتہ ہو اب آپ وزیر زراعت رہے ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جَو کی مادہ جَوئی ہوتی ہے۔ اس پر راجندر پرشاد جی نے مسکراتے ہوئے سوامی جی کو رخصت کیا اور شام کو سوامی جی نے راشٹرپتی سے اپنی تاریخی ملاقات کی یہ تفصیل بتائی جسے ہم سب نے خوب مزے لیتے ہوئے سُنا۔

ڈاکٹر کیشو چند رسین حقیر آسانی

کے نام

"اگر ماضی و حال کے مشاہدات کو سمیٹ کر
قلمبند نہ کیا گیا تو گزشتہ زمانوں سے مستقبل
کو کن باتوں سے دلچسپی باقی رہ سکے گی ——
یہی وہ خیال تھا جس نے مجھے آمادہ کیا کہ
حافظے کی مدد سے وہ محفوظ کر دوں جس کا تماشا
کبھی مجھے ہنس ہنس کر دیکھنا پڑا اور کبھی
رو رو کر ——"

—— ہوش بلگرامی
مشاہدات

سُبحَان اللہ
سُبحَان اللہ

سُوامی پارس ناتھ کے دیوان 'دیوارِ قہقہہ' میں شائع شدہ آرائے گرامی کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

"عجیب اتفاق ہے اور ہماری بیسویں صدی کا ایک اچھوتا واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ میں اب نہیں ملتی اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ شاید آئندہ بھی نہ مل سکے۔ کسے خبر تھی کہ قصبہ پھپھوند (اٹاوہ) کے کسی غیر معروف دیہات میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جسے ساٹھ سال کی عمر تک کوئی نہ جان سکے گا۔ اور جس وقت دنیا اس سے واقف ہوگی تو صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ بھی اس کی قابلیت کے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور ہوں گے۔

لارڈ لارنس لارڈ ایلگزینڈر اور لارڈ کرپس نے آپ کو خوشنودی مزاج کے خطوط لکھ کر آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ آپ نے گوشہ نشینی کا عذر کرتے ہوئے لکھا:

"غروب ہونے والے چاند کو نہیں دیکھنا چاہیے۔"

—— حضرت احمق پھپھوندوی

"... کتاب پریس سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے مجھ کو دی جائے۔"

—— پنڈت جواہر لعل نہرو

"... للہ میرا سارا دیوان آپ لے لیجیے اور اپنا کوئی ایک شعر دے دیجیے۔"

—— حضرت یگانہ چنگیزی

"... اگر سوامی جی مجھے اپنا شاگرد بنالیں تو اپنا سارا کلام

قربان کر دوں :

——— حضرت جگر مراد آبادی

" . . . سوامی صاحب اپنے وقت کا پیغمبرِ سخن ہیں - اور تمام شعراء اس کی امت ہیں ۔"

——— حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

" . . . آپ نے اپنی کتاب کے جو اکتیس شعر بطور نمونہ روانہ فرمائے ہیں ان کو دیکھ کر میں یقین کرتی ہوں کہ آپ کی کتاب نوبل پرائز حاصل کرنے کے قابل ہے ۔ (بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مسز سروجنی نائیڈو کی موت کا سبب سوامی جی کے وہ اشعار ہیں جو انھوں نے مرحومہ کو مرنے سے پہلے بطور نمونہ روانہ کیے تھے ۔ جن پر وہ اتنی گرویدہ ہوئی تھیں کہ روزانہ شام کو ایک مخصوص نشست میں انھیں سنتی تھیں ۔ ایک دن انہیں شعروں پر سر دھنتی ہوئیں ہمیشہ کے لیے سو گئیں)۔"

——— مسز سروجنی نائیڈو، سابق گورنر یوپی ۔

" . . . سبحان اللہ سبحان اللہ، شعر کہے تو یوں کہے ۔ بللہ یہ کلام بشر نہیں ۔ ان چیزوں کا جواب ہو ہی نہیں سکتا ۔ یہ ہے ادب برائے زندگی ۔ کہاں ہیں ہندوستان کے شعرائے کرام جن کو اپنے اپنے بلاغتِ نظام پر ناز ہے ، وہ دیکھیں سوامی جی کے ان گوہر ہائے آبدار کو جن میں ایک راجہ بیٹھا ہوا ہے ۔ دنیا بھر کے شاعر اگر مل کر سوامی پارس ناتھ کا مقابلہ شاعری میں کریں تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب ہار جائیں گے ۔"

——— حضرت جوش ملیح آبادی

سوامی جی نے اپنے ۳۶۵ اشعار میں اپنے حسبِ ذیل پانچ نکاتی صدارتی پروگرام کے بارے میں تشریح فرمائی ہے:

۱ - مکمل شانتی پروگرام ۔
۲ - مکمل زراعت پروگرام ۔
۳ - مکمل دفینہ پروگرام ۔
۴ - مکمل تعلیم پروگرام ۔
۵ - مکمل شادی پروگرام ۔

چوہتّر

ٹیلی فون ڈائرکٹری سے حکومت ہند کے تمام وزرائے کرام اور ممبرانِ پارلیمنٹ (لوک سبھا) اور (راجیہ سبھا) کے پتے دفتر 'ریاست' میں ٹائپ کرائے گئے اور سوامی جی کا بیش بہا دیوان " دیوارِ قہقہہ " اور سوامی جی کے پانچ نکاتی صدارتی پروگرام کی تفصیل ان تمام پتوں پر بذریعہ ڈاک بھجوائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدارت کے آئندہ امیدوار کا سکریٹریٹ دفتر 'ریاست' میں کھل گیا ہے۔ اور اس ہونے والے صدر کے خورد و نوش کا انتظام تو سردار صاحب کے ذمے تھا ہی، انھیں ہر دو چار دنوں کے بعد سردار صاحب جیب خرچ کے لیے دس پانچ روپے بھی دے دیتے تھے۔

کچھ ممبران پارلیمنٹ اور وزرائے کرام نے سوامی جی کو اخلاقی طور پر کتاب اور خط ملنے کی رسمی رسید دیتے ہوئے شکریہ ادا کیا تو ہم سب نے سوامی جی کو یہ یقین دلایا کہ شکریہ ادا کرنے والے وزراء اور ممبران پارلیمنٹ کو ان کے صدر بننے کی حمایت حاصل ہے۔ لہٰذا جن ممبران پارلیمنٹ اور وزرائے کرام کے خطوط نہیں آئے ہیں ان سے سوامی جی خود ملاقات کریں۔ اور انھیں اپنے پروگرام کے بارے میں متفق کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ آخر کار ان ممبرانِ پارلیمنٹ کے ووٹوں سے ہی تو وہ صدر بن سکیں گے۔

چنانچہ ہر روز سوامی جی کو دس ممبران پارلیمنٹ اور وزراء کی فہرست مع ان کے رہائشی پتوں کے دے دی جاتی۔ اور سوامی جی پیدل ہی ان حضرات سے ملاقات کے لیے چل پڑتے۔ دن بھر میں دو چار ممبران پارلیمنٹ اور ایک آدھ وزیران کے ہتھے چڑھ جاتے تو بے چاروں کو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ پھر شام کو سوامی جی اپنی ان ملاقاتوں کا حال سناتے اور ہم سب لطف اٹھاتے۔

یہ سلسلہ مہینہ بھر رہا۔ اب سوامی جی کے جوتے بھی گھس ہی نہیں گئے، بلکہ پھٹ گئے تھے۔ اور ادھر ہم سب بھی اس مسلسل پروگرام میں کچھ جدت چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم سب نے میٹنگ کی اور سوامی جی کو یہ سمجھا دیا گیا کہ سارے وزیر اور ممبران پارلیمنٹ آپ سے گھبراتے ہیں اور وہ اپنی اپنی کرسیوں سے چمٹے رہنے کے لیے آپ کو لفٹ نہیں دے رہے ہیں —— لہٰذا آپ صدر جمہوریۂ ہند کے راشٹرپتی بھون اور وزراء کی کوٹھیوں کے باہر اپنے صدارتی پروگرام کے بارے میں تقریر کے ذریعہ عوام تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ اس سے حکومت کانپ جائے گی۔

دوسرے دن سے سوامی جی نے یہ پروگرام شروع کر دیا۔ پہلے ہی دن راشٹرپتی بھون کے سامنے انھوں نے اپنا ستیہ گرہ شروع کیا تھا کہ پولیس نے انھیں پکڑ لیا اور ان کا حسب و نسب دریافت کیا تو سوامی جی نے بڑے طمطراق سے جواب دیا کہ تم لوگ ہونے والے راشٹرپتی کا اپمان کر رہے ہو۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست سے میرے بارے میں دریافت کرو تو تمھیں سب پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔ تھانہ پارلیمنٹ کے کسی افسر نے دفتر 'ریاست' میں فون کیا۔ سردار صاحب نے افسر مذکورہ کو سب معاملہ بتایا کہ یہ صاحب بے ضرر اور سنیاسی قسم کے بزرگ ہیں، انھیں آپ چھوڑ دیجیے اور ان سے کہیے کہ وہ اسی وقت دفتر 'ریاست' میں آجائیں۔

شام کو پھر میٹنگ ہوئی اور اس صورتِ حال پر سب نے قدرے تشویش ظاہر کی آج تو پولیس والوں نے انھیں چھوڑ دیا ہے اور اگر یہ ہر وزیر کی رہائش گاہ پر مجمع لگائیں گے تو یقیناً گرفتار کر لیے جائیں گے، اس لیے یہ پروگرام ملتوی کر دیا جائے اور ان سے یہ کہا جائے کہ یہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے شہر میں اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھیں —— لہٰذا سوامی جی کو سمجھایا گیا کہ پہلے عوام کی رائے آپ کے حق میں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ممبران پارلیمنٹ اور وزراء خود بخود آپ کا ساتھ دیں گے۔

پچھتر

سوامی جی کی پہلی تقریر مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ اُردو بازار جامع مسجد کے باہر ہوئی۔ جامع مسجد کا علاقہ جہاں کوئی پاگل بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگائے تو سینکڑوں آدمی اسے پیر جی سمجھ لیں، چونکہ اس علاقہ میں سوامی جی پہلے ہی روشناس تھے، لہٰذا یہاں عوام میں ان کی خوب خوب پذیرائی ہوئی تو سوامی جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ عوام ان کی تقریر سن کر سوامی پارس ناتھ کی جے کے نعرے لگائے اور شام کو ہم سب یہ تمام روداد سن کر خوب ہنسے مگر سوامی جی کو یہ پختہ یقین تھا کہ سردار دیوان سنگھ مفتون انھیں واقعی ہندوستان کا صدر بنا دیں گے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون ایسا متلون مزاج اب سوامی جی اور اس مستقل مذاق سے اُکتا چکا تھا اور کسی نئے شکار کی تلاش میں تھا کہ اتنے میں ایک ریٹائرڈ ریلوے بکنگ کلرک سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون کے جھانسوں میں آگیا۔ اور سردار صاحب نے اسے پورا پورا یقین دلا دیا کہ ہندوستان کا صدر تمھارے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ صاحب ہیں کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد جو روپیہ ان کو ریلوے سے ملا ہے وہ اس مہم پر لگانے کو تیار ہیں۔ چنانچہ اب اس نئے امیدوارِ صدارت کے باعث سوامی جی پر سردار جی کی توجہ کم ہونے لگی جسے سوامی جی نے بھی چند دنوں میں ہی محسوس کر لیا ——— اور ایک دن وہ میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میں نے بڑے احترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور چائے مٹھائی پیش کی تو چند منٹ بعد کہنے لگے . . . وِدیا پرکاش جی آپ مجھے مشورہ دیجیے کہ اب میں کیا کروں . . . میں نے انھیں نہایت نرمی سے سمجھایا کہ بابو راجندر پرشاد اور دوسرے حکومتی کارندے یہ نہیں چاہتے کہ آپ ایسا اچھا اور عوامی شخص ہندوستان کا صدر بن جائے۔ کیونکہ پھر ان کو کون پوچھے گا۔ اس لیے اب آپ بھگوان سے پرارتھنا کرنے میں اپنا وقت لگائیں کہ وہ ان گمراہ کن لوگوں کو راہِ راست پر لائیں اور یہ از خود آپ کے لیے صدارت کی جگہ خالی کر دیں۔ اور سوامی جی کو میں نے یہ بھی سمجھا دیا کہ سردار جی نے جتنا زور لگانا تھا وہ لگا لیا، اب ان کے بس میں آپ کو صدر بنانا ناممکن نہیں ہے۔

اس کے چند دن بعد ہی سوامی جی نے جمنا پار والے مندر میں اپنی رہائش کا انتظام کر لیا اور سردار جی کے یہاں آنا بھی کم کر دیا۔ ہفتہ عشرہ میں آتے گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھتے اور چلے جاتے۔ سوامی جی نے مندر کی زمین پر خوب پھلواری لگائی اور آس پاس کے رہنے والوں نے بھی ان کی سیوا میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر دو سال بعد سوامی جی کا سورگباش ہو گیا ——— رہے نام اللہ کا۔

دراصل سوانح حیات فرسودہ اور مردہ
واقعات کی فہرست نہیں ہوتی ہے اس
لحاظ سے سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے
بیان میں فکر و فن کی آمیزش کرے۔

——— ڈاکٹر عبدالسلام ندوی

سِکھ مُسلمان

اخبار "الامان" دہلی کے ایڈیٹر کا قتل ہوا تو مشہور کانگریسی کارکن منشی عبدالقدیر صاحب کا نام بھی مسلم لیگیوں نے قاتلوں میں لکھوا دیا ——— چنانچہ ایف، آئی، آر کے مطابق جب نامزد اشخاص کی باقاعدہ گرفتاری ہوئی تو منشی عبدالقدیر صاحب کو بھی کوچہ چیلان سے اُن کے مکان سے گرفتار کر لیا گیا ——— اہلِ محلہ اور دہلی کے تمام کانگریسی کارکن جانتے تھے کہ منشی عبدالقدیر پر یہ سراسر بہتان ہے۔ اور وہ کسی کو قتل کرنا تو درکنار، کسی سے سخت کلامی سے بھی پیش نہیں آتے تھے۔

اُن دنوں ملتان سے میرا دہلی آنا اکثر ہوتا رہتا تھا ——— حالی پبلشنگ ہاؤس اُردو بازار کے دو مالکان تھے، خالد صاحب اور بدر صاحب، خالد صاحب منشی عبدالقدیر صاحب کے فرزندِ ارجمند تھے۔ دہلی کے اُردو اداروں کی تمام کتابیں مَیں حالی پبلشنگ ہاؤس سے ہی خریدتا تھا۔ اس لیے خالد صاحب اور بدر صاحب دونوں سے خاصے دوستانہ تعلقات تھے، اور خالد صاحب نے ہی اپنے والدِ محترم جناب منشی عبدالقدیر صاحب سے مجھے متعارف کرایا تھا۔ منشی صاحب بہترین خوشنویس (دہلی کے سب سے بہترین خوشنویس یوسف صاحب ان کے چھوٹے بھائی تھے) اور ایک اچھے عالم تھے اور کٹر کانگریسی تھے۔ منشی صاحب کے سر کے اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور وہ پگڑی باندھتے تھے، لہٰذا انھیں اکثر سِکھ مسلمان کہا جاتا تھا۔

منشی عبدالقدیر کے احباب اور اُن سے محبت کرنے والوں کا دہلی میں بہت بڑا حلقہ تھا اور اس حلقہ میں سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست بھی شامل تھے، چنانچہ سردار دیوان سنگھ مفتون منشی عبدالقدیر صاحب کی ناحق گرفتاری اور قتل کے جھوٹے الزام سے بڑے پریشان تھے اور وہ چاہتے تھے کہ سچ کا بول بالا ہو۔ مگر اُن دنوں مسلم لیگی حضرات کا زور تھا اور وہ ہر قیمت پر جھوٹی شہادتوں سے منشی جی کو تختۂ دار پر چڑھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا سردار دیوان سنگھ مفتون کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ——— کرنا خدا کا کیا ہوا کہ جب مقدمہ ابتدائی عدالت سے چالان ہو کر جس سیشن کورٹ میں گیا وہ سیشن جج اخبار ریاست اور سردار دیوان سنگھ مفتون کا بڑا مداح تھا۔ مگر نہ تو کوئی سیشن جج اپنی عدالت میں کسی زیرِ سماعت مقدمہ میں اپنے بڑے سے بڑے دوست کی سفارش مان سکتا ہے اور نہ ہی سردار دیوان سنگھ مفتون ایسے اوچھے تھے کہ ایسی حماقت کرتے۔

سیشن کورٹ میں مقدمہ کی سماعت شروع ہو چکی تھی اور دو تین پیشیاں ہو بھی چکی تھیں یعنی منشی عبدالقدیر کو پھانسی پر لٹکائے جانے کے دن قریب آتے جا رہے تھے اور سردار دیوان سنگھ مفتون کی راتوں کی

نیند اُڑ چکی تھی۔ اس لیے نہیں کہ ان کا دوست پھانسی پا جائے گا بلکہ اس لیے کہ ایک بے گناہ کو سیاسی مخالفت کی بنا پر جھوٹے الزام میں پھنسا کر بھیانک کھیل کھیلا جا رہا تھا جس سے ایک بے گناہ کو پھانسی ہو سکتی تھی۔ بڑے غور و خوض کے بعد سردار صاحب نے اُن سیشن جج اور ان کی بیوی کو اپنے ہاں کھانے پر بُلایا اور سیشن جج صاحب وقتِ مقررہ پر سردار صاحب کے یہاں تشریف لے آئے۔ کھانے سے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دلی کے کچھ اور معززین کو بھی سردار صاحب نے کھانے پر بُلایا ہوا تھا لہٰذا خوش گپیاں ہوتی رہیں اور کھانے کی میز پر ہی ایک صاحب نے (جسے سردار صاحب نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا) سردار صاحب سے دریافت کیا۔ . .

سردار صاحب وہ منشی صاحب کے مقدمہ میں کس کس کی گواہی ہوئی ہے۔ سردار صاحب نے بڑی بے اعتنائی سے فرمایا کہ . . . بھائی یہ تو سیاسی مقدمہ ہے۔ مسلم لیگ والے ایک شریف اور غریب کانگریسی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں . . . اور باتوں باتوں میں سارے واقعات کا پس منظر بیان کر گئے ——— احباب اور سیشن جج صاحب کھانا بھی کھاتے رہے اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر سیشن جج صاحب بات چیت میں کسی قسم کی خلل اندازی کے بغیر بڑے غور سے سب کی باتیں سنتے رہے اور بظاہر چھری کانٹے کو بھی پوری طرح سے کام میں لاتے رہے ——— جونہی سردار صاحب اور دوسرے دوستوں نے اس بات پر انتہائی افسوس کیا کہ ایک بے گناہ پھانسی پر چڑھ جائے گا، تو سیشن جج صاحب چونکے اور کہنے لگے یہ کیس تو میری عدالت میں ہے۔ اس پر سب چُپ ہو گئے اور سردار صاحب نے معذرت کی کہ انھیں یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ اس مقدمہ کی سماعت آپ کی عدالت میں ہو رہی ہے . . . اس پر سیشن جج صاحب نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں بلکہ آپ لوگوں کی بات چیت سے مَیں چوکنا ہو گیا ہوں کہ کوئی بے گناہ نہ مارا جائے۔

مُقدمہ کئی ماہ تک چلتا رہا ——— اور آخر کار جب فیصلہ ہوا تو منشی عبدالقدیر صاحب کو باعزت بری کیا گیا۔ اور سیشن جج نے ایسا مدلّل فیصلہ لکھا کہ اپیل میں بھی منشی عبدالقدیر صاحب کا بال بیکا نہ ہو سکا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد مَیں جب دہلی آیا تو ہر روز منشی عبدالقدیر صاحب سے سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون کے ہاں مُلاقات ہوتی تھی اور انھوں نے ہی سوئیوالان میں اپنی ذمّہ داری پر مجھے مکان دلایا۔ منشی عبدالقدیر صاحب واقعی سِکھ نظر آتے تھے اور ۱۹۴۷ء کی خوں ریزی میں بھی وہ ہر گلی محلّے میں پھرتے رہے۔ اور انھوں نے دلّی کے مسلمانوں کی ہر طرح سے مدد کی اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سے آنے والے ہندو شرنارتھیوں کے بسانے میں بھی پورا پورا تعاون دیا۔

منشی عبدالقدیر صاحب ایسے مرنجان مرنج، شریف، خلیق اور ہر کسی کے کام آنے والے بے غرض انسان اب دلّی میں نظر نہیں آتے۔ کچھ عرصہ ہوا منشی جی کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُن کی فرشتہ صورت اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے ——— رہے نام اللہ کا!

ترتیب

دیباچہ	گوپی چند نارنگ	گیارہ

مجھے آپ اچھی لگتی ہیں	پندرہ
اتنا تو میر نے دیکھا	انیس
لیکن تو چنیز دے دیگری	تئیس
اے روشنیٔ طبع	ستائیس
جمالو دور کھڑی	اکتیس
ہجوم شوق میں ہم	سینتیس
ایمبیسڈری کی ٹریننگ	تینتالیس
ناکام بلیک میلنگ	سینتالیس
انٹرویو	ترپن
مولوی صاحب	انسٹھ
سوامی پارس ناتھ	پینسٹھ
سبحان اللہ سبحان اللہ	اکہتر
سکھ مسلمان	ستتر

"یہ ایک فرد کی کہانی نہیں مولف صرف نگارندہ ہے اس نے اپنی کہانی اس حد تک بیان کی ہے جس حد تک وہ اس میں گزرا ہے۔ یہ کہانی ایک عہد ایک دور ایک انجمن ایک تحریک ایک ولولے اور ایک معرکے کی تاریخ ہے جس میں عشق اور فرض ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

——— شورش کاشمیری

پسِ دیوارِ زنداں

خواجہ حسن نظامی

۱۹۳۵ء میں ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ جالندھر کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ اُن دنوں یہ ماہنامہ ایک اچھا تعلیمی اور ادبی پرچہ سمجھا جاتا تھا ——— چار مسلم حضرات اس کے مشترکہ مالکان تھے مگر مینیجنگ ڈائریکٹر عبدالرزاق صاحب تھے، جو قطعاً غیر ادبی اور کسی حد تک ماہنامے اور پریس کی انتظامی سُوجھ بوجھ سے ناواقف تھے، مگر تھے بڑے چاق و چوبند۔

ابھی مجھے ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ اور ایجوکیشنل پریس کی ذمہ داری سنبھالے چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ حضور نظامِ دکن کی سلور جبلی منائے جانے کا اعلان ہوا۔ اور مالکان نے یہ طے کیا کہ اس موقع پر ایجوکیشنل گزٹ کا نظام نمبر شائع کیا جائے۔ اور اس کی تیاری کے لیے مجھے مناسب ہدایات دی گئیں۔

چنانچہ وقتِ مقررہ پر یہ نمبر شائع ہوا۔ اور اسے حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے عبدالرزاق صاحب اور مجھے حیدر آباد دکن جانا تھا ——— لہٰذا ہم دونوں جالندھر سے دہلی آئے اور خواجہ حسن نظامیؒ سے ملاقات کی۔ خواجہ صاحب کے بارے میں ہفت روزہ 'ریاست' میں اکثر سردار دیوان سنگھ مفتون کے اداراتی شذرے میری نظر سے گُزر چکے تھے ——— لہٰذا میرے دماغ میں خواجہ صاحب کے بارے میں کوئی اچھی تصویر کُندہ نہیں تھی۔ مگر جونہی خواجہ صاحب سے آمنا سامنا ہوا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دو تین اصحاب ان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک صاحب کو خواجہ صاحب کچھ لکھوا رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ دوسرے صاحب سے فرمانے لگے ... ہاں بھئی آپ کہاں تک لکھ چکے ہیں۔ اس نے تحریر کا آخری فقرہ پڑھ کر سُنایا اور خواجہ صاحب نے انھیں بھی آگے لکھوانا شروع کر دیا۔ پہلے صاحب نے جو کچھ لکھا تھا، وہ کاتب کے حوالے کر کے پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ کوئی دس منٹ تک دوسرے صاحب کو کچھ لکھوانے کے بعد پھر پہلے صاحب کی طرف رجوع ہوئے اور جو کچھ وہ لکھ چکے تھے اس سے آگے کا مضمون لکھوانا شروع کر دیا۔ اور دوسرے صاحب جو کچھ خواجہ صاحب کے فرمودات لکھ چکے تھے مسودہ کاتب کو دینے چلے گئے ——— خواجہ صاحب ہم سے فرما ہی چکے تھے کہ کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا۔ پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد خواجہ صاحب نے توجہ ہماری طرف مبذول فرمائی تو اُن سے ہم کلامی کا فخر مجھے ہی حاصل رہا۔ کیونکہ عبدالرزاق صاحب جالندھر سے چلتے وقت ہی یہ فرما چکے تھے کہ سرور صاحب میں اُردو نہ تو اچھی طرح بول سکتا ہوں اور نہ ہی ادبی گفتگو کر سکتا ہوں۔ اس لیے جہاں بھی کوئی ایسا موقع آئے تو آپ ہی نے بات کرنی ہے۔ اور اتفاق دیکھیے کہ پہلا واسطہ بات چیت کا پڑا تو وہ بھی خواجہ حسن نظامی ایسی ہستی سے جو ہمیں برسوں پڑھا

سکتے تھے ——— تاہم خواجہ صاحب سے خوب باتیں ہوئیں۔ اور انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد وزیر اعظم حیدر آباد (دکن) کے نام تعارفی خط دیا۔ اور ساتھ ہی میرے وزٹینگ کارڈ پر اپنے قلم سے رقم فرما دیا . . . "معہ خط خواجہ حسن نظامی" اور فرمایا کہ جونہی یہ ملاقاتی کارڈ مہاراجہ بہادر کے یہاں پہنچے گا وہ آپ کو فوراً بلالیں گے۔

مارچ کا مہینہ تھا، شام ہوگئی تھی، خواجہ صاحب نے چائے اور بسکٹ سے نوازا اور فرمانے لگے میں بھی دلّی جارہا ہوں۔ میرے ساتھ گاڑی میں چلیے، جامع مسجد چھوڑ دوں گا۔ اُن دنوں نظام الدین بستی سے لے کر دلّی گیٹ تک ایسی عمارات نہیں ہوتی تھیں جہاں آجکل کاکا نگر، سُندر نگر اور چڑیا گھر نیز پرگتی میدان وغیرہ ہیں یہاں جنگل ہی جنگل تھا اور اکہری سڑک کے دونوں جانب گھنے درخت اور جھاڑیاں خاصہ ڈراؤنا ماحول بنائے ہوئے تھیں ——— خواجہ صاحب کا موٹر خاصہ پُرانا تھا مگر چلنے میں اچھا تھا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ میں خواجہ صاحب ہمیں جگت ٹاکیز کے پاس اُردو گھر لے آئے ——— جہاں پر فرش اور دیوار کی ہر اینٹ پر اُردو بولو، اُردو پڑھو، اُردو لکھو، لکھا ہوا تھا۔ یہ اُردو گھر اب آزاد ہند مسلم ہوٹل میں تبدیل ہوچکا ہے ——— خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ دوسرے دن بھی تشریف لائیں گے اور اگر ہم لوگ ابھی دہلی میں رہیں تو اسی اُردو گھر میں شام کے تین بجے ملیں . . . عبدالرزاق صاحب تو فتح پوری کے ہوٹل میں سوئے رہے اور میں وقتِ مقررہ پر خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اور وہ مجھے اپنے ساتھ چاوڑی بازار میں دلّی پریس میں لے گئے جہاں 'منادی' چھپتا تھا۔ 'منادی' کی کتابت شدہ کاپیاں دلّی پریس کے مالک کو دیں اور ساتھ ہی طباعت کی اجرت بھی پیشگی دے دی۔ فرمانے لگے . . . پیشگی اُجرت دے دینے سے کام جلدی ہوجاتا ہے ——— چنانچہ میں نے بھی خواجہ صاحب کے اس اصول کو گرہ میں باندھ لیا۔ اور اب تک پریس اور کاتبوں کو اُجرت پیشگی دیتا ہوں، مگر افسوس کہ اب نہ تو کاتب ہی وہ کاتب رہے ہیں اور نہ پریس ہی وہ پریس رہے ہیں ——— اکثر کاتب حضرات پیشگی اُجرت لے کر دوسرا کام لے لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پہلے کام کی تو اُجرت پیشگی مل ہی چکی ہے وہ کام تو اپنے پاس ہی رہے گا دوسرا کام جو ملتا ہے اسے بھی لے لو۔ اسی طرح پریس والوں کا حال ہے۔ اوّل تو کوئی بھی پریس ہو وہ وعدے پر کام کرکے نہیں دیتا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ اجرت خواہ پیشگی دیجیے یا ساتھ چائے بھی پلایئے مگر کام وعدے پر ملنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔

جناب عزیز حسن بقائی ایڈیٹر 'حریت' سے بھی خواجہ صاحب نے ہی مجھے متعارف کرایا۔ اس ملاقات کا ذکر خواجہ صاحب نے مارچ ۱۹۳۵ء کے 'منادی' میں ان الفاظ میں فرمایا:

"... آج تین بجے جالندھر کے ماہنامہ 'ایجوکیشنل گزٹ' کے مالک عبدالرزاق اور ایڈیٹر ودیا پرکاش سرور تونسوی ملاقات کے لیے خواجہ منزل آئے۔ اس رسالے کی یہ ادا مجھے پسند آئی، کہ مالک مسلمان اور ایڈیٹر ہندو ہیں اور دونوں خدمتِ اُردو میں ایک دوسرے کے معاون ہیں ..."

خواجہ صاحب کی ایک نظرِ غلط انداز نے ہی میرے دل و دماغ سے اُن خیالات کو نکال دیا تھا جو

ریاست، کے مطالعہ کے باعث میرے دل میں موجود تھے۔ حیدر آباد پہنچنے پر دوسرے دن مہاراجہ بہادر کشن پرشاد شاد وزیر اعظم کے پرائیویٹ سکریٹری کو جو وزٹنگ کارڈ دیا گیا تو انھوں نے چند منٹ بعد ہی راقم کو مہاراجہ بہادر کے حضور میں پیش کر دیا، اور انھوں نے مجھے 'کلبوس' پہننے وغیرہ کی پابندی سے بھی مبرا رکھا۔

کچھ سال بعد خواجہ حسن نظامی صاحب ملتان تشریف لائے ——— انھیں خاص طور پر ہندو مسلم اتحاد کو بڑھاوا دینے پر تقریر کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ لوہڑ دروازے کے باہر نالے کے قریب سرکاری ہسپتال (اب اس ہسپتال کا نام غالباً جناح ہسپتال ہے) سے ملحق باغ میں خواجہ صاحب نے تقریر فرمائی۔ ہزار ہا سامعین کا مجمع تھا، اور خواجہ صاحب کی تقریر کے ایک ایک فقرے پر تالیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

خواجہ صاحب نے جب یہ فرمایا کہ فلاں پران میں ہزاروں سال پہلے حضرت محمدؐ کی بعثت کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور انھوں نے یہ پیشین گوئی سنسکرت زبان میں سنائی تو تالیوں کا شور کئی منٹ تک جاری رہا ——— تقریر کے بعد عوام نے خواجہ صاحب کو گھیر لیا، اور ہر کوئی اُن سے مصافحہ کرنا اور اُن کے ہاتھ چومنا سعادت سمجھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں بھی اُن تک پہنچ پایا تو دیکھتے ہی فرمانے لگے . . . . میں تھیں ملتان آنے کی خبر بھجوانا چاہتا تھا مگر پروگرام اس قدر جلدی میں ترتیب دیا گیا کہ لاہور، منٹگمری اور دیگر مقامات پر کسی کو بھی اطلاع نہ دی جا سکی۔ مجھے یقیناً انتہائی خوشی ہوئی کہ خواجہ صاحب نے مجھے پہچان لیا۔

خواجہ صاحب کا قیام نواب مریدحسین قریشی کے ہاں تھا ——— میں دوسرے دن صبح اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کچھ دیر تک ان کی گفتگو سنتا رہا، جو وہ مخصوص حاضرین سے فرما رہے تھے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے . . . 'شانِ ہند' میں تمھارے ادارتی شذرے کبھی کبھی پڑھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ تمھیں صحافتی گُر معلوم ہیں۔"

قسمت نے تقسیم وطن کے بعد خواجہ کی دلّی میں پناہ گزین کی حالت میں لا پٹکا، اور سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر 'ریاست'، کے ہاں ہر روز کی حاضر باشی کے دوران اکثر و بیشتر خواجہ صاحب کا ذکر آتا رہتا ——— ——— اُن دنوں سردار صاحب اور خواجہ صاحب میں بول چال بھی بند تھی۔

سردار صاحب کی محفل میں بیٹھنے والوں کی خیریت اسی میں رہتی تھی کہ وہ سردار صاحب کی ہر بات پر صاد کہیں ——— ماسٹر امیر چند کھنہ اور لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر روزنامہ 'وطن'، اور مالک اعلیٰ پریس کبھی کبھی سردار صاحب سے اختلاف کرتے تو سردار صاحب آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور محفل معمول سے پہلے ہی برخاست ہو جاتی تھی۔ اس لیے ہر کوئی محتاط رہتا تھا کہ سردار صاحب کی مخالفت نہ ہی کی جائے تو بہتر ہے تاکہ ہنسی خوشی کی محفل ناخوش گواری پر ختم نہ ہو ——— لہٰذا مجھ ایسے شخص کا محفل جن کے تعلقات سردار صاحب کے مبینہ اور مفروضہ مخالفوں سے بھی بہتر تھے وہ زیادہ تر سردار صاحب کے فرمودات سننے پر ہی اکتفا کرتے اور کسی قسم کی رائے زنی نہ کرتے۔

مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد بستی نظام الدینؒ کھلے بندوں آنا جانا شروع ہوا تو خادم نے بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسرو کے مزارات پر سرِ عقیدت جھکایا اور خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں بھی حاضری دی ——— ملتان سے دلّی پہنچنے تک کے حالات خواجہ صاحب نے سنے تو حوصلہ

بندھاتے ہوئے فرمانے لگے . . . یہ سب کچھ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے ۔ لہٰذا صبر و شکر کے ساتھ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے محنت کرو، اللہ ضرور کامیابی دے گا ۔

سردار صاحب کی سی ۔ آئی ۔ ڈی بھی غضب کی تھی ۔ وہ اس کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اُن کے احباب یا ملنے والوں میں کون کون اُن کے مخالف حضرات سے ملاقات کرتا ہے یا میل جول رکھتا ہے ۔ ایک دن بھیّا احسان الحق صاحب سردار صاحب کے ہاں تشریف لائے تو سردار صاحب نے اُن سے دریافت فرمایا: سُنائیے خواجہ صاحب کا کیا حال چال ہے (بھیّا احسان الحق صاحب کے تعلقات خواجہ صاحب سے بہت گہرے تھے اور سردار صاحب سے دیرینہ اور دوستانہ تعلقات تھے) بھیّا احسان الحق فرمانے لگے . . . کل ان کی خدمت میں حاضری دی تھی تو آپ کی صحت کے بارے میں دریافت کر رہے تھے ۔ بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ ہاں سردار صاحب مجھ سے بھی انھوں نے آپ کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تھا . . . اس وقت تو سردار صاحب خاموش رہے، مگر بھیّا صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد میری جواب طلبی بلکہ تفتیش شروع ہوئی کہ . . . تمھارے خواجہ صاحب سے کب کے تعلقات ہیں اور مُلتان سے آنے کے بعد کتنی بار اُن سے مُلاقات ہو چکی ہے اور اس سے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا کہ خواجہ صاحب نے تم سے میری صحت کے بارے میں دریافت کیا . . . میں نے سردار صاحب کو جب یہ بتایا کہ ۱۹۳۵ء سے میری نیازمندی کا سلسلہ خواجہ صاحب سے وابستہ ہے تو انھیں حیرت نہ ہوئی بلکہ افسوس ہوا کہ وہ اس سے بے خبر کیوں رہے . . . تب سے سردار صاحب خواجہ صاحب کے بارے میں مجھ سے کافی محتاط رہنے لگے ۔

■■

"اس سفر نامہ کی داستان ان گنت خون چکاں
کہانیاں لیے ہوئے ہے جسے پڑھنے اور سننے
سے انسان کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ لیکن وقت
سب سے بڑا مرہم ہے۔ نئی نسلیں پرانی نسلوں کے
پرسکون چہروں سے خوبصورت ماضی کی یقین
دہانی پر مطمئن ہیں۔"

—— منیر فاطمی
خواب سفر

صحبتِ صالح

دفترِ شانِ ہند میں تشریف لانے والے اکثر ملاقاتی حضرات میز پر رکھے اخبارات و رسائل کو اُٹھا کر ورق گردانی کرنے کے بعد اس بے ترتیبی سے پھینکتے ہیں کہ جس سے ان کی ذہنی بے ترتیبی کی نشاندہی از خود ہو جاتی ہے۔

۱۹۴۵ء میں مَیں جب سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر 'ریاست' کو پہلی بار ان کے دفتر مٹیا محل میں ملا تو میرے ساتھ ایک دوسرے صحافی بھی تھے۔ سردار صاحب کی میز پر ملک بھر کے اخبارات و رسائل کا ڈھیر لگا ہُوا تھا، یہ صحافی نہایت بے تکلفی سے اخبارات و رسائل کو بکھیرتے ہوئے اپنے کسی پسندیدہ رسالے کو پڑھنے لگے تو سردار دیوان سنگھ مفتون نے ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے کہا۔ . . صاحب یہ کوئی لائبریری نہیں ہے۔ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ لہٰذا اپنے مقصد تک رہیے۔ اخبار گھر جا کر پڑھیے گا یا قریب ہی میونسپل لائبریری ہے وہاں جا کر اپنا شوق پورا کر لیجیے گا۔ . . سردار صاحب کا یہ فرمان سُن کر یہ صحافی اپنی صحافت تک بھول گئے اور مجھے کان ہو گئے ——— لہٰذا وہ دن اور آج کا دن مَیں نے سردار صاحب کی اس نصیحت کو پلے باندھ رکھا ہے۔

ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ جالندھر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۳۵ء میں مجھے پشاور ایک ادبی اجتماع میں شرکت کے لیے جانا ہُوا۔ واپسی میں کیمبل پور ریلوے اسٹیشن پر مَیں مسافر خانہ میں سویا ہُوا تھا کہ میری جیب سے کوٹ سلطان ریلوے اسٹیشن کا ریلوے ٹکٹ اور سلیج سات روپے کسی نے نکال لیے۔ صبح جب میری آنکھ کھُلی تو جیب تو خالی ہو ہی چکی تھی، اس کے ساتھ سفر جاری رکھنے کے لیے ریل کا ٹکٹ بھی جا چکا تھا۔ تونسہ شریف جانے کے لیے کیمبل پور سے ہی کوٹ سلطان کے لیے ریلوے لائن جاتی تھی۔ مَیں پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں مسافر خانہ میں ایک بنچ پر بیٹھا ہُوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب نہ تو جالندھر جانے کا کوئی طریقہ نظر آتا ہے اور نہ ہی تونسہ شریف پہنچنے کا۔

اس زمانے میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا انتہائی معیوب خیال کیا جاتا تھا، اور کیمبل پور میں کوئی ایسا شناسا بھی نہ تھا کہ جس سے دو چار روپے اُدھار لیے جا سکتے ——— آپ دو چار روپے پر مسکرائیے نہیں، اس وقت کے دو چار روپے آج کل کے دو سو روپے سے بھی زیادہ وقعت رکھتے تھے۔ جب میں ہر طرح سے نا اُمید ہو گیا اور کوٹ سلطان جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ گئی تو اپنی بے چارگی کا احساس اور بھی بڑھنے لگا۔

ایک پٹھان جس کی عمر چالیس سال کے قریب ہو گی، رئیسانہ ٹھاٹھ سے سامنے والے بنچ پر آ کر بیٹھا اُس

کے چار ملازم بھی ساتھ تھے جو اس کی خدمت کے لیے مؤدبانہ کھڑے ہوئے تھے ——— پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس رئیس پٹھان نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا کہ . . . تم اس قدر اداس کیوں بیٹھا ہے۔ مختصراً داستان بیان کی تو اس پٹھان نے جھٹ سے دس روپیہ کا نوٹ جیب سے نکال کر اپنے ملازم کو دیا کہ جاؤ فوراً کوٹ سلطان کا ایک ٹکٹ خرید کر لاؤ ——— ایک روپیہ اور کچھ آنے کا ٹکٹ تھا، باقی آٹھ روپے اور چینج بھی مجھے دیتے ہوئے کہا کہ . . . جاؤ بھائی تم اپنے گھر جاؤ . . . میں نے ہزار کوشش کی کہ اس پٹھان کا نام اور پتہ دریافت کروں، مگر اس بندۂ خدا نے قطعاً نہ بتایا۔ اور یہی کہتا رہا کہ خدا نے ہمیں تمہارے ہی لیے یہاں بھجوایا ہے، وگرنہ ہم تو لاری (بس) سے جانے والے تھے مگر خدا نے ہمارا ارادہ بدل دیا اور دل نے کہا کہ ریل سے چلو ——— ہماری ریل تو ابھی چار گھنٹے بعد آئے گی۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ خدا نے ہمیں یہاں کیوں بھجوایا ہے . . . کوٹ سلطان جانے والی گاڑی کا انجن سیٹی بجا رہا تھا اور اس پٹھان کا ملازم میرا سامان اٹھا کر گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے خان صاحب کا شکریہ ادا کیا تو فرمانے لگے . . . شکریہ تو مجھے خدا کا کرنا ہے جس نے مجھے یہاں اس کام کے لیے بھجوایا۔

اس خان صاحب کا یہ سلوک میرے دل و دماغ پر آج تک اپنا سکہ بٹھائے ہوئے ہے اور میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالع ترا طالع کند!

پانچویں جماعت میں پڑھا تھا ——— یہ مقولہ ویسے تو ہزاروں بار پڑھا اور متعدد بار موقع محل سے اس کا استعمال بھی تحریروں میں کیا مگر اس کا عملی تجربہ اب ہوا۔

جب میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر دیوان سنگھ مفتوں کے یہاں تھا تو ان کی عادات، اطوار وغیرہ غیر شعوری طور پر میری عادتِ ثانیہ بن گئے۔ اور میں نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا ——— مثلاً ادارتی نوٹ لکھتے وقت بے باکی کو اپنا شیوہ بنا لیا، بلیک میلنگ کے گر سیکھ لیے (گو خدا نے ابھی تک یہ گر استعمال کرنے سے محفوظ رکھا ہے) شراب کا استعمال گھریلو ذمہ داریوں سے فرار، جس سے قرض لے لیا اس کو ادا کرنا اُس وقت ضروری سمجھا جب ضرورت سے زیادہ روپیہ آ جائے۔ اور جس کو دے دیا اُس سے مانگنا نہیں (اگر وہ از خود ادا کر دے تو اُس کی مہربانی) ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور مظلوم کا ساتھ دینا دوست کا ساتھ دینا۔ اگر دوستی ہے تو بے مثال اور دشمنی ہے تو لاثانی، فراخدلی سے رغبت کنجوسی سے نفرت وغیرہ وغیرہ۔

اور اب الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ صبح کے ساتھ ہر روز کا اٹھنا بیٹھنا ہے تو ان کے فرمودات اور معمولات کا یہ اثر ہوا ہے کہ . . . خدا سے ڈرو، محنت کرو اور ایمانداری کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ چنانچہ ان قدروں کی قدر افزائی کی گئی تو مالی حالت بہتر۔ کاروبار میں ترقی اور استحکام، بازار میں ساکھ، گھریلو ذمہ داریوں کا احساس، بزرگوں کے مزارات پر حاضری، مندر میں بلاناغہ روزانہ حاضری، شراب سے نفرت، دوست تو کیا واقف کاروں تک کی شادی غمی میں شمولیت اور دلی احساس کے ساتھ خدمت۔

خواجہ حسن نظامی	اکیاسی
محبتِ صالح	ستاسی
میرا استاد	اکیانوے
حکیم چیلا رام	ستانوے
تمردِ ڈگری	ایک سو ایک
مادر چلہ خیالیم	ایک سو سات
خواجہ غریب نواز	ایک سو تیرہ
یادش بخیر	ایک سو سترہ
رہے نام اللہ کا	ایک سو اکیس
بگ بنگر	ایک سو پچیس
رجہ ماتا دی	ایک سو اکتیس
دین پناہ	ایک سو پینتیس
آنانکہ خاک را	ایک سو انتالیس
مندر سے کلیسا تک	ایک سو پینتالیس
زمین کھا گئی	ایک سو انچاس
پہلو میں اٹھ رہی ہے	ایک سو پچپن
خدائی قہر	ایک سو اکسٹھ

آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی
بڑائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور ازراہِ
کسرِ نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی کر بیٹھے
جائے تو احتمال یہ کہ لوگ جھٹ یقین
کرلیں گے۔

——— مشتاق احمد یوسفی
زرگزشت

میرا اُستاد

مُسلمان تھا

اندرون لوہڑ دروازہ مُلتان شہر حکیم چیلا رام کا مطب مقبولیت اور شہرت کا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اس مطب میں امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا۔ ہر غیر مسلم مریض صرف ایک آنہ فیس دے کر اپنے مرض کی تشخیص کرا سکتا تھا۔ مُسلمان مریض اس فیس سے مستثنیٰ تھے۔ حکیم چیلا رام جو بھی نسخہ لکھتے وہ تین پیسے سے زائد قیمت کی ادویات کا نہیں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب صبح چار بجے اُٹھتے ضروریات سے فارغ ہو کر پیدل ان مریضوں کو گھر پر دیکھنے نکلتے جن کو گھر پر دیکھنے کا وقت دیا جاتا تھا۔ مسلمان مریض سے گھر پر دیکھنے کی فیس چار آنے تھی اور غیر مسلم مریضوں سے آٹھ آنے۔ یہ بھی سُننے میں آتا تھا کہ وہ مُسلمان مریضوں سے اکثر اوقات فیس کے چار آنے بھی نہیں لیتے اور اگر وہ محسوس کرتے کہ مریض اور اس کے ورثا مالی طور پر نادار ہیں تو نسخہ پر لکھ دیتے کہ اس مریض سے دوائی کی قیمت نہ لی جائے بلکہ حکیم صاحب کے ذاتی حساب میں لکھ دی جائے۔ مُسلمان مریضوں سے وہ غیر مُسلم مریضوں کی نسبت زیادہ نرم روی سے پیش آتے تھے۔ تلخ کلامی اُن کا شیوہ تھا جس سے اکثر مریض اور اُن کے تیمار دار شاکی رہتے تھے۔ مگر کوئی بھی مُسلمان مریض حکیم چیلا رام کی شکایت نہیں کرتا تھا۔ کوئی کہتا کہ حکیم چیلا رام مُسلمانوں سے ڈرتے ہیں۔ کوئی کہتا کسی مسلمان رئیس نے اُن کی مالی مدد کی ہوگی۔ غرضیکہ حکیم صاحب کی مُسلم نوازی کے بارے میں کئی داستانیں زبان زدِ عوام تھیں۔

غالباً اگست ۱۹۴۲ء کی کوئی تاریخ تھی۔ مَیں نیو سنٹرل جیل مُلتان کے سُپرنٹنڈنٹ لالہ گنیش داس سے ملنے گیا ہُوا تھا تاکہ وہ سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست" دہلی سے میری مُلاقات کا کسی طور انتظام کر دیں جو کہ اُن دنوں نیو سنٹرل جیل ملتان میں نظر بند تھے۔ لالہ گنیش داس سردار دیوان سنگھ مفتوں کے نیاز مند اور میرے کرم فرما تھے مگر انھوں نے سردار صاحب سے مُلاقات کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ حکومت کی ہدایات ہی ایسی تھیں۔ نیو سنٹرل جیل میرے مکان سے کئی میل کے فاصلے پر تھی اور اُن دنوں تانگے کے سوا کوئی سواری ہوتی نہیں تھی۔ کافی دیر کے بعد تانگہ ملنے کے باعث میں رات کے نو بجے گھر آیا تو بیوی نے بتایا کہ میرے لڑکے اقبال کی طبیعت یکایک خراب ہو گئی ہے۔ محلّے کے ڈاکٹر اور پھر سرکاری سول ہسپتال کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ دونوں نے انجکشن لگا دیے اور بس۔ لڑکے کی حالت تھی کہ لمحہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ صبح چھ بجے میری بیوی اور مَیں بچے کو لے کر حکیم چیلا رام کے ہاں گئے تو وہاں مریضوں کی ایک لمبی قطار دیکھی۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ مریض کی حالت چاہے کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو حکیم صاحب نمبر وار ہی مریض کو دیکھتے ہیں۔ خواہ حاکمِ وقت بھی کیوں نہ ہو حکیم صاحب اِس اصول کو نہیں بھولتے۔ مریضوں نے بتایا کہ یہاں صبح چار بجے سے لائن لگنا شروع ہو جاتی ہے۔

خیر خدا خدا کر کے ہمارا نمبر آیا۔ مَیں ننگے سر تھا۔ حکیم صاحب نے نہایت تُرش رُوئی سے کہا کیا تمہارا باپ مر گیا ہے جو ننگے سَر آئے ہو۔ حکیم صاحب کی یہ غیر ضروری بات سینہ چیر گئی مگر بچّے کو دکھانا تھا۔ مَیں چُپ رہا۔ حکیم صاحب نے بچّے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور فوراً ہی کہا کہ اسے گھر لے جاؤ اسے اب کسی دوائی کی ضرورت نہیں ہے نمونیہ کا اثر دو گونہ .... ہو چکا ہے۔ ڈاکٹری انجکشن وغیرہ لگوا کر اسے تکلیف مت دینا۔ یہ اب بچ نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر دوسرے مریض کی نبض حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ ایک آنہ پیش کیا گیا جو انھوں نے واپس کر دیا اور کہا کہ جس مریض کے لیے مَیں نسخہ ہی نہیں لکھتا اُس سے ایک آنہ بھی نہیں لیتا۔ میری بیوی نے تو وہیں رونا شروع کر دیا۔ ہم چُپ چاپ ملتان چھاؤنی محلہ گجر کھڈا میں اپنے مکان پر آ گئے۔ مَیں نے مقدور بھر بچے کا علاج ڈاکٹر سلیم اور حکیم محمد امین سے کرایا مگر ہُوا وہی جو حکیم چیلا رام نے کہا تھا۔ یہ تھی چیلا رام حکیم سے میری پہلی ملاقات۔ جس سے مَیں کافی مایوس ہُوا تھا۔ اور مَیں کئی دن تک سوچتا رہا کہ کیا خُدا کی مخلوق میں ایسے تلخ زبان۔ اور سخت مزاج لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد میرے نانا کیول رام ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر فورٹ سنڈیمین (بلوچستان) میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے وڈّیا پر کاش مجھے کئی بیماریاں ہیں اور مَیں حکیم چیلا رام کی تعریف سُن کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ میرا علاج حکیم چیلا رام سے کراؤ۔ یہ سُن کر مَیں نے حکیم صاحب کی تلخ کلامی۔ بد اخلاقی۔ لائن میں لگنا وغیرہ کے بارے میں نانا جی کو تفصیل سے بتایا تو فرمانے لگے کہ یہ سب باتیں ایک اچھے حکیم میں ہوتی ہیں۔ غرض ہم کو ہے اُس سے نہیں لہٰذا یہ سب باتیں سہنی پڑیں گی۔ تمہیں تکلیف ضرور ہو گی مگر میری خاطر یہ سب کچھ کرو اور میرا علاج حکیم چیلا رام سے کراؤ۔ دوسرے دن صبح چار بجے مَیں حکیم صاحب کی دُکان پر پہنچ گیا (نانا صاحب کو آٹھ بجے دکان پر پہنچنے کی تاکید کر دی) دیکھا تو مجھ سے پہلے چار مریض اور بیٹھے تھے۔ پانچ منٹ بعد حکیم صاحب نے دروازہ کھولا۔ ایک نظر ہم سب کو دیکھا۔ ہماری نمسکار کا جواب خاموشی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ جو پورے آٹھ بجے کھلا۔ مریض نمبر وار جانے شروع ہوئے۔ میرا نمبر پانچواں تھا۔ میرے نانا صاحب تشریف لا چکے تھے۔ حکیم صاحب کہنے لگے صبح نمبر پر تم تھے اور دکھا رہے ہو کسی اور کو گزارش کی گئی کہ یہ میرے نانا ہیں فورٹ سنڈے مین سے آئے ہیں۔ ضعیف ہیں۔ صبح چار بجے حاضری نہیں دے سکتے ان کی جگہ لائن میں مَیں لگا کروں گا یہ سُن کر مُسکرائے اور کہنے لگے آج تو پگڑی باندھ کر آئے ہو۔ حیرت ہوئی کہ یہ شخص زیرِ لب مُسکرانا بھی جانتا ہے اور یہ خوشی بھی ہوئی کہ حکیم صاحب نے ننگے سر والے کو پہچان لیا۔ حکیم صاحب نے میرے نانا صاحب کی نبض پہلے دائیں ہاتھ کی دیکھی پھر بائیں ہاتھ کی۔ ایک منٹ تک نبض دیکھنے کے بعد امراض کی ایک طویل فہرست گنوا دی اور کہا کہ علاج پر کم از کم ایک سال لگے گا اگر ایسا کر سکو تو میرا علاج شروع کرو۔ وگرنہ کسی ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔ ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ ہمیں منظور ہے۔ نسخہ لکھا اور حکم ہُوا کہ ہر روز آنا ہو گا۔ اور مریض کا قارورہ بھی ساتھ لانا۔

مَیں نے دیکھا کہ حکیم صاحب کو نسخہ لکھنے کے لیے کاغذ کی قلّت کا سامنا ہے۔ دوسرے دن مَیں کاغذ کے ریم سے بچی ہوئی تین انچ چوڑی کترن اُٹھا کر لے گیا اور حکیم صاحب کو پیش کی کہ اس کترن پر آپ نسخہ لکھا کیجیے۔ محبت بھری نظر سے دیکھا اور کترن قبول کر لی۔ ایک ڈیڑھ ماہ کی روزانہ حاضری کے بعد حکیم صاحب نے یہ اجازت دے دی کہ مریض کے آنے کی ضرورت نہیں تم ہر روز ان کی حالت بتا دیا کرو۔ سائیکل میرے پاس تھا۔ رفتہ رفتہ مَیں نے یہ

چوُرانوے

عادت بنالی کہ سویرے ½۳ بجے اُٹھتا دس منٹ میں حکیم صاحب کے درِ دولت پر جاکر تھڑے پر لیٹ جاتا۔ کسی دن آنکھ بھی لگ جاتی حکیم صاحب چار بجے دروازہ کھولتے اور کبھی مجھے سوتا ہُوا اور اکثر جاگتے ہوئے سب سے پہلے نمبر پر دیکھ کر دروازہ بند کرکے مریضوں کو دیکھنے چلے جاتے کچھ دنوں بعد وہ دوسرے مریضوں سے کہنے لگے کہ علاج کرانا اس لڑکے سے سیکھو حالانکہ اس وقت میری عمر ۲۸ سال تھی اور وہ مجھے لڑکا ہی کہتے تھے۔

اگر کسی مریض نے یہ کہہ دیا کہ حکیم صاحب مجھے جلدی ہے تو وہ بگڑ کر کہتے میں قصائی نہیں ہوں کہ گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر تمھیں دے دوں۔ یہاں تو وقت لگے گا۔ ایک خاتون نے اپنے بچّے کو دکھایا تو کہنے لگے اس کا کفن تیار رکھو۔ ماں کو اُس کے بیٹے کے بارے میں کوئی حکیم ایسا کہے تو جو حالت ماں کی ہو سکتی ہے اُس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ فرمانے لگے۔ دیکھو جی میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ کچھ بھی ہو اس بچے کو ٹکڑا (روٹی) نہ دینا۔ مگر یہ بچہ دن بھر روٹی کھاتا رہا ہے۔ میں نے گزارش کی حکیم صاحب یہ کیسے پتہ چلا کہ بچے نے روٹی کھائی ہے۔ زیرِ لب مُسکرائے اور فرمانے لگے کہ کیا ستّر سال سے جھک مار رہا ہوں۔ سُنو اس لڑکے نے روٹی بھنڈی کے ساتھ کھائی ہے۔ لڑکے کی ماں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی کہ کل اس نے چوری سے روٹی کھالی تھی اور بھنڈی کے ساتھ ہی کھائی تھی۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے حکیم صاحب سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے ایک گھنٹے کے لیے ایسے وقت حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت دیں جب کوئی دوسرا آپ کے پاس نہ ہو فرمانے لگے آج چار بجے آجاؤ۔ میں وقت مقررہ پر حاضر ہُوا۔ حکیم صاحب نے خندہ پیشانی سے نوازا۔ ٹھنڈا پانی پلایا اور کچھ نمکین بھی کھلایا۔ فرمانے لگے کہو کیا بات ہے۔ گزارش کی گئی کہ آپ سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں کھِل کھِلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ میں تو سمجھا تھا کہ تم کسی پوشیدہ مرض کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے ہو۔ حکیم صاحب قہقہہ بھی لگا سکتے ہیں یہ میرے لیے کولمبس کی دریافت سے حیران کُن واقعہ نہ تھا۔ پہلا سوال میرا یہ تھا کہ آپ غیر مسلموں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک کیوں کرتے ہیں۔ فرمانے لگے، کیونکہ میرا اُستاد مُسلمان تھا۔ یہ سب کچھ اُس کا ہی عطا کیا ہُوا ہے میرے اُستاد نے اپنے مُسلمان شاگردوں کے مقابلہ میں مجھ پر زیادہ توجہ دی تو میں مُسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کیوں نہ کروں۔ اُستاد کے احسانات کا بدلہ میں کسی طور پر بھی اُتار نہیں سکتا۔

اس کے بعد میں نے مریضوں کے ساتھ تلخ کلامی اور سخت رویّہ کا جواز دریافت کیا تو کہنے لگے کہ ایسا میں دانستہ کرتا ہوں، ایک تو اس لیے کہ میرے پاس مریض کم سے کم تعداد میں آئیں تاکہ میں تھوڑے مریضوں کو توجہ سے دیکھ سکوں۔ حالت یہ ہے کہ صبح چار بجے سے شام کے چار بجے تک مریضوں کی لائن ہی ختم نہیں ہوتی اور دوسرے اس تلخ کلامی کے باعث مریض پرہیز کرتا ہے۔ جب کسی بچّے کے بارے میں اس کی ماں سے یہ کہتا ہوں کہ اس کے لیے کفن تیار رکھ تو وہ اس قدر ڈر جاتی ہے کہ میرے بتائے ہوئے پرہیز سے بھی زیادہ پرہیز کراتی ہے جس کے نتیجہ میں مریض جلد شفایاب ہو جاتا ہے۔ کہنے لگے ودیا پرکاش جی یاد رکھنا کہ دوا اگر ایک حصہ فائدہ کرتی ہے تو پرہیز تین حصّے مریض کو شفایاب ہونے میں مدد کرتا ہے۔

اب میرا سوال یہ تھا کہ جو مریض ایسے ہوتے ہیں جن کو فوری طبّی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ ہیں کہ خواہ مریض لائن میں ہی مر جائے۔ مگر آپ نمبر کے بغیر اُسے نہیں دیکھتے۔ کہنے لگے اگر نمبر تمہارا ہو اور تحصیلدار آکر مطالبہ کرے کہ پہلے مجھے دیکھو تو تمہارے دل پر کیا بیتے گی اس لیے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے میں اپنے اس اصول کو

نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے لیے سب برابر ہیں۔ فوری طور پر طبّی مدد چاہنے والے مریض کسی اور ڈاکٹر یا حکیم کے یہاں جا سکتے ہیں۔ حکیم صاحب نے پھر قہقہہ لگایا اور کہنے لگے کہ ایک سردار جی انکم ٹیکس آفیسر ہیں وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ کار میں آئے اور لائن میں نہ لگتے ہوئے سیدھے میرے پاس آئے اور کہنے لگے حکیم جی میرے بچّے کو دیکھیے ـــــ میں نے اُن سے کہا سردار جی یہ جھٹکے کی دُکان نہیں کہ آپ کو لائن کاٹ کر دے دوں۔ لائن میں کھڑے ہو جاؤ جب نمبر آئے گا تب آپ کے لڑکے کو دیکھوں گا۔ سردار جی بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اور دوسرے دن انکم ٹیکس دفتر کا چپراسی نوٹس لے کر آیا کہ اپنی آمدنی کی تفصیلات بتانے کے لیے دفتر میں حاضری دو۔ تاریخ مقررہ پر انکم ٹیکس کے دفتر گیا سارا دن بیٹھا رہا شام کو صاحب نے تاریخ دے دی کہ فلاں تاریخ کو آنا۔ اب تک چھ تاریخیں بھگت چکا ہوں۔ مریض سارا دن یہاں لائن میں لگے رہتے ہیں اور میں صبح دس بجے تک کچھ مریض دیکھ کر دفتر انکم ٹیکس چلا جاتا ہوں اور پھر جب وہاں سے چھٹی ملتی ہے تو آکر باقی مریضوں کو دیکھتا ہوں مگر میں اپنا اصول چھوڑوں گا نہیں۔ خواہ سردار جی کچھ ہی کیوں نہ کریں۔

اب میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ آپ جن مریضوں کو گھر پر دیکھنے کے لیے جاتے ہیں اُن کی طرف سے سواری کی پیش کش قبول نہیں کرتے اور مُلتان چھاؤنی تک پیدل ہی مریضوں کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کہنے لگے کہ شہر سے چھاؤنی چار میل پر ہے اور دو پیسے تانگے کا کرایہ ہے، میں جانتا ہوں کہ مریض یہ کرایہ ادا کر سکتا ہے مگر میں اسی بہانے صبح چار بجے سیر کر لیا کرتا ہوں اور اس عمر میں بھی دس بارہ میل پیدل چل لیتا ہوں۔ دوسرے مریض صبح خالی پیٹ ہوتا ہے خالی پیٹ مرض کی تشخیص بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔

اس مُلاقات کے بعد حکیم صاحب میرے کرم فرما بن چکے تھے۔ جب بھی چھاؤنی میں کسی مریض کو دیکھنے آتے تو غریب خانے پر بھی قدم رنجہ فرماتے۔ مطب کے اوقات کے بعد میں جب بھی چاہوں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا، اکثر مریض مجھ سے سفارش کراتے کہ حکیم صاحب انھیں گھر پر دیکھ لیں۔ ملتان چھاؤنی میں غلام حسین قیصرؔ میرے دوستوں میں سے تھے، وہ اپنے والد جناب امام بخش صاحب (خدا ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے بزرگ بہت کم دیکھے ہیں) کو گھر پر دکھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں قیصرؔ صاحب کو ساتھ لیے حکیم صاحب کے ہاں حاضر ہُوا اور قیصر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے غرض بیان کی تو فرمانے لگے کہ صبح تمہارے پاس آجاؤں گا۔ تم ان کے گھر لے چلنا چنانچہ حسبِ وعدہ حکیم صاحب پانچ بجے صبح تشریف لے آئے قیصر صاحب میرے ہاں اُن کے منتظر تھے ہی۔ ہم تینوں قیصر صاحب کے ہاں جا رہے تھے کہ راستہ میں صدر بازار میں جناب غنچہ امروہی کے دوکان کے سامنے بجلی کے تار پر بیٹھے ہوئے کبُوتر کی بیٹ قیصر صاحب کے ناک پر گری حکیم صاحب وہیں کھڑے ہو گئے کہنے لگے دو تین بار کاش جی اب ان کے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مریض نے دَم توڑ دیا ہے۔ ان سے کہیے کہ فوراً گھر چلے جائیں یہ کہا اور حکیم صاحب چُپ چاپ ہم دونوں کو چھوڑ کر کسی دوسرے مریض کو دیکھنے چلے گئے۔ میں اور قیصر صاحب جب قیصر صاحب کے مکان پر پہنچے تو واقعی گھر کے افراد چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔

تقسیمِ مُلک کے بعد حکیم چیلا رام دہلی میں مطب کرنے لگے تھے۔ مگر وہ مُلتان کو بھولتے ہی نہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ اب زندہ رہنے کو دِل نہیں چاہتا۔ چنانچہ تقسیم مُلک کے دو سال بعد ہی انتقال ہو گیا۔

رہے نام اللہ کا.......

یہاں میری رُوح بالکُل عُریاں دیکھی جا سکتی ہے۔ میں کیا تھا اور مجھے کیا ہونا چاہیے تھا، دونوں کی تشریح موجود ہے۔

اِس طرح میں ایک زندہ مدفون ہوں۔ آئیے میری غلطیوں کا جائزہ لیجیے اور اپنی اِصلاح کیجیے۔

——— جون ڈنسٹن

بحوالہ اُردو میں فنِ سوانح نگاری کا اِرتقاء

مُصنّفہ ڈاکٹر آنسہ ممتاز فاطمہ

حکیم چیلا رام

ایک شام حکیم صاحب بڑے اچھے موڈ میں تھے ــــــــ جھجکتے جھجکتے میں نے گزارش کی کہ آپ مسلمان مریضوں سے ایک آنہ فیس بھی نہیں لیتے۔ کسی مسلمان مریض کو گھر دیکھنے جاتے ہیں تو اس سے نصف فیس چار آنے لیتے ہیں جبکہ غیر مسلم مریضوں سے آٹھ آنے فیس لیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان مریض نسخہ میں لکھی ادویات کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو آپ اس کے نسخہ پر یہی لکھ دیتے ہیں کہ دوا کی قیمت نہ لی جائے جب کہ آپ ہندو ہیں ــــــــ مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ساتھ آپ کا سلوک مساویانہ تو کیا بلکہ کسی حد تک ہتک آمیز ہوتا ہے۔

حکیم صاحب سر سے پگڑی اُتار کر اُسے ایک طرف رکھتے ہوئے بڑے حکیمانہ انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے: ــــــــ

ودیا پرکاش جی! یہ سوال پہلے مجھ سے کئی حضرات نے دریافت کیا ہے مگر میں اس کا جواب دینے سے احتراز کرتا ہوں مگر آپ سے اب کوئی پردہ نہیں اس لیے غور سے سُنیے . . . اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میرا اُستاد مسلمان تھا، جس فراخ دلی سے میرے استاد نے طبی راز مجھے بتائے وہ کوئی بھی ہندو اُستاد قطعاً نہ بتاتا اس لیے میں یہ اپنے اُستاد کا قرض اُتار رہا ہوں کہ مسلمان مریضوں کو ہر سہولت دی جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندو فطرتاً پیسہ پرست ہے اور میرے اُستاد نے چالیس سال تک جو کچھ مجھے سکھایا وہ یہ تھا کہ روپیہ سے محبت نہ کرنا بلکہ روپیہ کو اپنا غلام سمجھنا۔ طبی طور پر کبھی کسی مریض سے اپنی فہم و فراست کے مطابق علاج میں بددیانتی نہ کرنا۔ اور ہر انسان کو خدا کا بندہ سمجھنا۔ ہندو مریضوں سے میرا قدرے ہتک آمیز سلوک ان کی فطری کنجوسی اور پیسے کو ہی سب کچھ سمجھنے کے باعث ہے۔

ابھی حکیم صاحب بات ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک اُدھیڑ عمر کا شخص آیا اور کہنے لگا کہ حکیم صاحب مریض کا حال خراب ہے۔ ذرا چل کر دیکھ لیجیے۔ حکیم صاحب نے بندھی بندھائی پگڑی سر پر رکھی۔ سفید صافہ گلے میں ڈالا اور جوتا پہن کر تیار ہو گئے۔ کہنے لگے . . . آئیے ودیا پرکاش جی، آپ بھی چلیے مریض کا گھر بوہڑ دروازہ کے باہر ہی ہے۔ ابھی واپس آ جائیں گے۔ تعمیلِ حکم میں میں بھی ساتھ ہو لیا۔ بوہڑ دروازہ سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ اوپر بجلی کی تار پر بیٹھے ہوئے کبوتر کی بیٹ مریض کے رشتہ دار کے سر پر گری اور حکیم صاحب وہیں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ جاؤ اب میرے جانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ مریض اس دُنیا سے چل بسا۔ یہ کہا اور حکیم صاحب نے اپنا رُخ پیچھے کی طرف کر لیا اور دُکان کی طرف چل پڑے ــــــ میں

چُپ چاپ حکیم صاحب کے پیچھے حیران و پریشان چلتا رہا۔ حکیم صاحب نے کمرے میں بیٹھتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھا اور کہنے لگے . . . ایڈیٹر صاحب آپ مریض کی موت سے پریشان ہو گئے، اور حیران اس لیے ہیں کہ میں نے کبوتر کی بیٹ مریض کے رشتہ دار کے سر پر گرنے پر مریض کی موت کا اعلان کیسے کر دیا ——— حکیم صاحب فرمانے لگے . . . تمھاری عمر کیا ہو گی . . . ؟ عرض کیا قریباً اٹھائیس سال ——— مُسکرا کر کہنے لگے . . . ابھی یہ باتیں سمجھنے کے لیے پچیس سال اور چاہئیں۔

ایک دن ایک بڑا خوبصورت اور لحیم شحیم نوجوان حکیم صاحب کے پاس آیا اور مریضوں کے جھگڑے سے گھبرا کر زبانی طور پر اپنی بیماری کی تفصیل بتانے کی بجائے کاغذ پر لکھ کر پرچہ حکیم صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ پرچہ کی پہلی سطر ہی پڑھی ہو گی کہ حکیم صاحب ہنستے ہوئے بولے . . . جب زندیوں کے کوٹھوں پر عیاشی کرنے جاتے تھے تو اُس وقت شرم نہیں آتی تھی، اب تمھیں اپنی خبیث بیماریوں کی تفصیل بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر مجھ سے علاج کرانا ہے تو اپنے ماں باپ کو ساتھ لے کر آؤ تا کہ تمھیں عبرت حاصل ہو کہ تم کس قدر شریف ماں باپ کی اولاد ہو کر کس قدر غلط قدم اُٹھا چکے ہو . . .

نوجوان ندامت کے آثار چہرے پر لیے واپس چلا گیا۔ شام کو میں نے حکیم صاحب سے اس نوجوان کے بارے میں دریافت کیا تو کہنے لگے . . . فلاں سیٹھ کا لاڈلا مرینٹڈ کا لڑکا ہے۔ روپیہ وافر ہے۔ عیاشی کرتا ہے پہلے بھی ایک بار اسے سوزاک ہو چکا ہے۔ اور اب تو اس نے سوزاک اور آتشک دونوں خرید لیے ہیں۔ عیاشی اور جنسی بے راہ روی پر باتیں ہوتے ہوتے حکیم صاحب فرمانے لگے . . . فلاں کشمیری مصنف کی کتاب 'سینگار رس' جنسیات پر ایسا گرنتھ ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ فرمانے لگے . . . کہ اصل کتاب سنسکرت میں ہے بعد میں اس کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہُوا۔

خدائے جمالیات شوجی مہاراج کی استُتی کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ مَیں یہ کتاب عیاشی کی غرض سے نہیں لکھ رہا بلکہ اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ یہ فطری تقاضہ ہے کہ مرد اور عورت کچھ عرصہ کے بعد تبدیلی چاہتے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے ایسے ایسے جنسیاتی اور جمالیاتی طریقے اور آسن بتائے ہیں کہ کوئی بھی عورت اپنے مرد سے مختلف چھیڑ چھاڑ کے انداز میں جنسیاتی طور پر لطف اندوز ہو سکتی ہے اور کوئی بھی مرد اپنی بیوی کی مختلف چھیڑ چھاڑ دل نواز اور شہوت انگیز جنسیاتی اداؤں سے دلجمعی اور تسکینِ قلبی حاصل کر سکتا ہے۔

مَیں نے اشتیاقاً عرض کیا کہ یہ کتاب آپ کے پاس ہے ؟

فرمانے لگے . . . مَیں تم سے اسی سوال کی توقع رکھتا تھا۔ کیونکہ ہر ہندوستانی نوجوان اپنے آپ کو جنسی طور پر کمزور ہی سمجھتا ہے خواہ وہ پوری طرح سے مرد ہی کیوں نہ ہو ——— مَیں نے مُسکراتے ہوئے کہا حضور، ابھی تو آپ نے بتایا کہ اس کتاب میں مختلف قسم کے جنسی حقائق پر بحث کی گئی ہے اس کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا کہ نوجوان جنسی طور پر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں ہے مگر سنسکرت میں۔ کل ذرا جلدی آجانا تو اُوپر والے کمرے میں چلیں گے تلاش کر دوں گا۔

گھر آنے پر رات بھر مَیں یہی سوچتا رہا کہ کتاب سنسکرت میں ہے، اور مَیں سنسکرت تو کیا ہندی کا بھی ایک لفظ نہیں پڑھ سکتا۔ میرے جاننے والوں میں بھی زیادہ تر مسلمان حضرات ہیں اور اُن میں بھی کوئی سنسکرت نہیں پڑھ سکتا۔ حکیم صاحب کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کتاب پڑھ کر